۷

قائداعظم لائبریری کا شش ماہی ادبی مجلّہ

دورِ جدید

مخزن

لاہور

مدیر: ڈاکٹر وحید قریشی

قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم، باغ جناح لاہور

مخزن

شمارہ مسلسل ۷

۲۰۰۴ء

جلد۴ شمارہ ۱

مجلس ادارت

عنایت اللہ (صدر مجلس)

انتظار حسین

ڈاکٹر سہیل احمد خاں

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر انور سدید

امجد اسلام امجد

ڈاکٹر وحید قریشی (مدیر اعزازی)

محمد ہارون عثمانی (معاون امور دفتری و ادبی)

جملہ حقوق محفوظ

ناشر: قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم باغ جناح لاہور

فون نمبر: ۹۲۰۱۰۰۷_فیکس:۹۲۰۱۰۰۶

ای میل: qal@brain.net.pk

ویب سائٹ: www.qal.fws1.com

کمپوزنگ: محمد اکرام الحق

طابع: ارفع پرنٹنگ سروسز، رائل پارک لاہور

صفحات: ۴+۱۶۰

قیمت: ۱۰۰/-روپے

ضروری نوٹ

(۱) مخزن میں شائع ہونے والی نگارشات کے مندرجات سے قائداعظم لائبریری اور مجلس ادارت کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

(۲) تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو دو نسخے روانہ کیے جائیں۔

(۳) ادبی معاملات میں جملہ خط و کتابت مدیر مخزن، معرفت قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم، باغ جناح لاہور سے کی جائے۔

(۴) مالی امور میں چیف لائبریرین قائداعظم لائبریری سے رجوع کیا جائے۔

ترتیب

اداریہ ۵

شخصیات و سوانح:

۱۔ گوپال متل — جگن ناتھ آزاد ۷

۲۔ نواب محمد غوث خان اعظم — علیم صبا نویدی ۱۵

خودنوشت:

۱۔ آپ بیتی۔ مقاصد و محرکات — ڈاکٹر سلیم اختر ۲۲

۲۔ تین خودنوشت سوانح عمریاں — ڈاکٹر انور محمود خالد ۲۸

ادبیات:

۱۔ مصحفی دلی میں — ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ۳۴

۲۔ اردو زبان اور ہمارا رویہ — ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ ۴۰

۳۔ اردو کا پہلا اساطیری افسانہ — ڈاکٹر قاضی عابد ۴۶

سیمینار۔ ادب کے فروغ میں اردو رسائل کا کردار:

۱۔ ادب کے فروغ میں اردو رسائل کا کردار — ڈاکٹر وزیر آغا ۵۳

۲۔ ادبی رسائل۔ ضرورت یا محض روایت — ڈاکٹر شبیہ الحسن ۵۵

۳۔ اردو ادبی رسائل کا جائزہ (۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۰ء تک) — ڈاکٹر عفیرہ حامد ۵۸

کتابیات و اشاریات:

۱۔ نگارشات پروفیسر محمد اسلم — محمد عالم مختار حق ۶۶

۲۔ اردو تحقیقی کتب میں اشاریہ سازی — سیدہ مصباح رضوی ۹۳

فنون لطیفہ:

۱۔ خطاطی اور مصورانہ خطاطی (قدیم سے جدید روایت تک) — اسلم کمال ۹۷

تجزیے اور جائزے:

۱۔ گمشدہ اسلم کمال	مبصر: ڈاکٹر خورشید رضوی	۱۰۸
۲۔ شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ جامعہ کراچی کی چند مطبوعات کا جائزہ	مبصر: رضا احمد	۱۱۲
۳۔ مقبول اکیڈمی لاہور کی چند کتابیں	مبصر: ڈاکٹر وحید قریشی	۱۲۳

مختصر تبصرے:

۱۔ لغات روزمرہ (شمس الرحمٰن فاروقی)	مبصر: محیط اسمٰعیل	۱۲۸
۲۔ شبری (افسانے) (افتخار نسیم)	مبصر: عرفان احمد خان	۱۲۹
۳۔ نسیم حجاز (جگن ناتھ آزاد)	مبصر: محمد ہارون عثمانی	۱۳۰
۴۔ لمحوں کا قرض (ڈاکٹر زاہد منیر عامر)	مبصر: محمد شبیر قمر	۱۳۲

گاہے گاہے باز خواں:

پرہیز	کرشن چندر	۱۳۴

مخزن:

آرا اور تبصرے	ادارہ	۱۳۸

کتب خانے:

لائبریریاں۔ ہماری اشد ضرورت	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	۱۵۴

قائداعظم لائبریری:

۱۔ لائبریری میں آنے والی نئی اردو کتب	ضیاء الدین فاروقی	۱۵۷

ساتویں شمارے کے قلمی معاونین ۱۶۰

اداریہ

مخزن کے حوالے سے اب بھی بعض قارئین استفسار کرتے رہتے ہیں۔ ابتدائی تین شماروں میں ہم نے پرچے کی پالیسی کے بارے میں وضاحت کر دی تھی۔ تاہم اب بھی بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو صرف کلاسیکی ادب تک محدود کیے ہوئے ہیں حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ مخزن جدید تحریکات کا علم بردار ہے اور یہ اس کی شناخت بھی ہے۔ مخزن کے لیے جدید ادب بہت اہم ہے لیکن ادب جدید کے حامی ذرا کم التفات کرتے ہیں۔ ہماری استدعا ہے کہ زیادہ تعاون فرمائیں۔ ہمارے صفحات ہمہ وقت ان کی نگارشات کے منتظر ہیں۔

ہم قدیم و جدید میں امتیاز نہیں کرتے ہمارے لیے قدیم بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا جدید۔ ہم ماضی پرست نہیں ماضی شناس ہیں اور قدیم و جدید کے تسلسل کے قائل ہیں۔ اس لیے ادب کے جدید رجحانات کو خوش آمدید کہتے ہیں لیکن قدیم ادب کو نظر انداز کرنے کے قائل نہیں۔

مدیر

گوپال متل

جگن ناتھ آزاد

گوپال متل سے میری پہلی ملاقات آج سے چھیاسٹھ (۶۶) برس قبل لاہور میں ہوئی اور یہ ملاقات محض اتفاقیہ تھی۔ کرپال سنگھ بیدار مجھے مولانا تاجور مرحوم کے یہاں لے گئے تھے۔ وہاں گوپال متل پہلے سے موجود تھے۔ مولانا کے ساتھ اپنی اس ملاقات کا ذکر میں اپنی کتاب ''آنکھیں ترستیاں ہیں'' میں تفصیل سے کر چکا ہوں۔ یہاں مجھے یہ لکھنا ہے کہ گوپال متل اس زمانے میں غالباً Royist تھے۔ رائے ازم کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں مارکسزم سے جا ملتے ہیں۔ گوپال متل مولانا کے ساتھ بات چیت میں رائے ازم کی خوبیاں انہیں بتا رہے تھے۔ مولانا جب بات کرتے تھے تو ان کی تان کمیونسٹوں کی مخالفت پر ٹوٹتی تھی۔ آخر مولانا نے یہ کہہ کے بات ختم کی کہ گوپال متل تم ہزار کمیونسٹ بنو لیکن جب کمیونسٹوں کی حکومت آئے گی تو وہ سب سے پہلے تمہیں نشانہ بنائیں گے۔ کیونکہ تم کوٹ اور پینٹ پہنتے ہو اور اکثر انگریزی میں بات کرتے ہو۔ خدا معلوم مولانا کے دل میں کمیونسٹوں یا کمیونزم کا کیا تصور تھا لیکن ان کے اس جواب پر ہم سب نے ایک قہقہہ لگایا اور گوپال متل نے بھی یہ دیکھ کر کہ اس سیاسی بحث میں ان کی اور مولانا کی Wave length ایک نہیں ہے، بات کو ختم کیا۔

مولانا سیاست کے میدان کے مرد نہیں تھے۔ ان کا میدان دوسرا تھا۔ گوپال متل کئی میدانوں کے مرد تھے اور اس پہلی ملاقات میں جس بات نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا وہ یہ تھی کہ جو استدلال میں نے گوپال متل کی بات میں دیکھا اس کا تجربہ شاید اس سے پہلے مجھے نہیں ہوا تھا۔

اس وقت میری عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ گوپال متل عمر میں مجھ سے دس برس بڑے تھے۔ بی۔ اے کا امتحان گارڈن کالج راولپنڈی سے پاس کر کے میں لاہور آیا تھا۔ سیاسی تقریریں اکثر لیڈروں کی میں نے سنی تھیں لیکن کسی بزم احباب میں سیاست کے موضوع پر ایسی مدلل بات سننے میں نہیں آئی تھی۔

میں لاہور ایم۔ اے میں داخلہ لینے کے لیے آیا تھا لیکن ایسی ہی محفلیں زنجیر پا بن گئیں اور ایم۔ اے میں داخلہ ملتوی ہوتا چلا گیا۔ اسی آوارہ گردی کے دوران میں وقار انبالوی نے مجھے روزانہ ''ملاپ'' میں ملازمت دلوادی۔ گوپال متل اس زمانے میں روزنامہ ''بھارت ماتا'' میں کام کرتے تھے جس کے مدیر اعلیٰ لالہ رام پرشاد تھے۔ جہاں تک میرا خیال ہے متل اس میں دو ایک کالم مستقل طور پر لکھتے تھے اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ایڈیٹوریل بھی کبھار لکھا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب میں اردو صحافت ہندو صحافت اور مسلم صحافت میں بٹی ہوئی تھی۔ زمیندار، احسان، شہباز، انقلاب مسلم اخبارات تھے۔ پرتاپ، ملاپ، بندے ماترم، ویر بھارت اور بھارت ماتا ہندوؤں کے اخبار تھے اور حقیقت یہ ہے کہ مسلم اخبارات کی صحافت کا معیار ادبی

اعتبار سے ہندو اخبارات کے مقابلے میں کہیں بہتر تھا۔ مسلم اخبارات میں لکھنے والے تھے ظفر علی خاں، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، نصراللہ خان عزیز، ابوسعید بزمی، حمید نظامی، حاجی لق لق، چراغ حسن حسرت اور اس پائے کے ادیب تھے۔ ان کے مقابلے میں ہندو اخبارات کا پلڑا بہت ہلکا تھا۔ ان کی ادبی آبرو صرف دو اہل قلم کے ہاتھ میں تھی، ایک میلا رام وفا اور دوسرے گوپال متل۔ وقار انبالوی جب کبھی ہندو اخبارات میں آ جاتے تھے تو ان اخبارات کا، پرتاپ ہو یا ملاپ، ادبی پایہ بلند ہو جاتا تھا ورنہ ان اخبارات کی نظم ونثر اکثر مولانا سالک اور اظہر امرتسری کی طعن وتشنیع کا نشانہ رہتی تھی۔ میلا رام وفا کا کمال ان کی سیاسی موضوعات پر ہنگامی نظموں میں نظر آتا تھا مثلاً ''اے فرنگی'' کے عنوان سے ان کی متعدد نظمیں ایک زمانے میں بہت مشہور ہوئیں۔ گوپال متل کی بات دوسری تھی۔ انہوں نے اس طرح کی ہنگامی نظموں میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔ ان کا کمال ان کی وہ نثر یت تھی جو ان کی سیاسی نثر میں نظر آتی تھی اور اس میں استدلال کا جو پہلو ہوتا تھا اس کا تعریفی ذکر اکثر مجھے دوسرے اخبارات کے دفتروں میں سننے میں آتا تھا۔ عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر کو میں نے اس زمانے میں بھی گوپال متل کا رطب اللسان پایا۔

شاعری کے لیے ان کا میدان دوسرا تھا۔ شاہکار، ادب لطیف، سویرا اور ادبی دنیا میں ان کا کلام شائع ہوتا تھا۔ روزانہ اخبارات کو ان کی شاعری نے کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ ''شاہکار'' کے تو گوپال متل مدیر بھی رہے اور نہ صرف یہ کہ مولانا تاجور گوپال متل کے دور ادارت میں ''شاہکار'' کے معیار سے پوری طرح مطمئن تھے بلکہ ملک کے علمی اور ادبی حلقوں میں ''شاہکار'' کا پایہ اعتبار اس زمانے میں بہت بلند رہا۔ گوپال متل نے ''نوائے وقت'' میں بھی ایک مدت تک کام کیا۔ یہ مرحوم حمید نظامی کا دور تھا۔ حمید نظامی ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور بعض شفٹوں کے انچارج گوپال متل ہوا کرتے تھے۔

اخبارات کی شاعری سے یاد آیا۔ ایک دفعہ میں نے گوپال متل کی ایک نظم غالباً ''بھارت ماتا'' ہی میں دیکھی۔ یہ اس اخبار کا شیوا تری نمبر تھا اور یہ نظم سوامی دیانند سرسوتی کی تعریف میں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ عقیدے کے اعتبار سے گوپال متل آریہ سماجی نہیں ہیں۔ میرے والد محترم آریہ سماجی تھے، گویا میں ایک آریہ سماجی گھر میں پیدا ہوا تھا اور جب ہم لوگ راولپنڈی میں رہتے تھے تو ہمارے گھر کے سامنے آریہ سماج مندر تھا۔ سڑک کے اس پار۔ ہر اتوار کی صبح کو اس میں جلسہ ہوتا تھا اور ویسے بھی ہر تیوہار کے موقعے پر اس مندر میں جلسے ہوتے رہتے تھے۔ ہم گلی محلے کے تمام ہندو لڑکے بڑے شوق سے ان جلسوں میں جاتے تھے۔ وہ وہ دور تھا جب آریہ سماج میں اردو اور فارسی کے علما بڑی تعداد میں تھے۔ اب تو شاید آریہ سماج میں کوئی ڈھونڈے سے نہ ملے۔ اگرچہ سوامی شرھانند، پنڈت لیکھ رام اور گنگا رام کا دور جا چکا تھا لیکن لالہ لاجپت رائے، پنڈت چموپتی ایم۔اے، مہاتما آنند سوامی، مہاشے کرشن اور مہتہ جے مُنی کی بدولت آریہ سماج میں ہندی کے ساتھ ہی ساتھ اردو کا معیار بھی خاصا بلند رہا۔ آخر الذکر حضرات کی تقریروں کی گونج ابھی تک میرے کانوں میں موجود ہے۔ ان تقریروں سے متاثر نہ ہونا ممکن نہیں تھا چنانچہ آریہ سماج کے ساتھ یہ تعلق خاطر ایک مدت تک رہا اور اس زمانے میں اگرچہ میں لاہور آنے کے بعد کسی آریہ سماج مندر میں نہیں گیا (کیونکہ راولپنڈی میں تو آریہ سماج مندر بالکل گھر کے سامنے تھا اور لاہور میں ایسی صورت نہیں تھی) لیکن آریہ سماج کے لٹریچر اور ہندو دھرم کی جانب اس رویے سے جو آریہ سماج نے پیش کیا تھا۔ میرا دلی قرب ایک زمانے تک باقی رہا۔ وجہ یہ تھی کہ ہندو دھرم کی جانب آریہ سماج کے بانی کا approach میری نظر میں وہی تھا جو اقبال اور ابوالکلام آزاد کا اسلام کی جانب یعنی افکار الٰہی میں تشکیل جدید یا Reconstruction of religious thought۔ چنانچہ جب لالہ سورج مہان نے وید

منتروں کے انگریزی ترجموں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے کتابچے شائع کیے تو میں نے وہ بڑے شوق سے پڑھے۔ وہی لذت جو مجھے وید منتروں کے ان ترجموں میں ملی تھی بہت بعد میں جا کے مجھے محمد پکھتال کے انگریزی ترجمہ قرآن میں نظر آئی۔

تو میں گوپال متل کی بات کر رہا تھا۔ نظم بہت عمدہ تھی اور اس سطح سے کہیں بلند تھی جو ہندو اخبارات کی عام سطح نظم تھی۔ پنجاب کے ہندو اخبارات میں سے اگر اس دور میں میرے والد محترم جناب محروم، منشی مہاراج بہادر برق، میلا رام وفا اور وقار انبالوی کی نظمیں خارج کر دی جائیں تو شاعری کے نام سے جو کچھ باقی رہ جائے گا وہ پوچ گوئی سے بہتر سطح کا نہیں ہوگا۔ اب جو میں نے ''بھارت ماتا'' میں گوپال متل کی نظم دیکھی اور اتنی بلند پایہ نظم، تو میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ میں نے وہ دو تین بار پڑھی اور مجھے زبانی یاد ہو گئی۔ غالباً اسی روز یا دوسرے روز گوپال متل سے راہ چلتے ملاقات ہو گئی۔ ان کے ساتھ اس وقت چوہدری برکت علی (مدیر ماہنامہ ''ادب لطیف'') اور باری علیگ بھی تھے۔ میں نے اس نظم کا تعریفی ذکر کیا۔ ظاہر ہے کہ ہر شاعر اپنی نظم کا تعریفی ذکر سن کر خوش ہوتا ہے خواہ وہ اس کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ گوپال متل کو بھی نظم کی یہ تعریف پسند آئی ہو گی۔ متل نے مجھ سے پوچھا اس وقت کہاں جا رہے ہو۔ میں نے جھوٹ موٹ کہا کہ آریہ سماج کا سالانہ جلسہ ہو رہا ہے وہاں جا رہا ہوں۔ چوہدری برکت علی بولے لیکن تمہارا آریہ سماج سے کیا تعلق؟ میں نے کہا اس وقت تک تو کوئی تعلق نہیں تھا لیکن متل صاحب کی نظم نے اتنا متاثر کیا ہے کہ میرا سویا ہوا ایمان بیدار ہو گیا ہے۔ متل صاحب نے فوراً ہی کڑک کر کہا:

But man! I am not an Arya Samajist

میں نے کہا ''لیکن اس کا کیا علاج کہ میں نظم سے بے حد متاثر ہوا ہوں اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اب آریہ سماج کے مندر جا رہا ہوں''۔ اب متل کو کوئی جواب نہ سوجھا جس پر چودھری برکت علی اور باری علیگ نے قہقہہ لگایا اور چوہدری صاحب نے ہنستے ہوئے متل سے کہا ''اور نظمیں لکھو آریہ سماج کی تعریف میں'' یہ غالباً پہلا موقع تھا اور شاید واحد موقع تھا جب میں نے متل کو لاجواب ہوتے ہوئے دیکھا ورنہ گوپال متل اور ہری چند اختر کو جواب سے معذور شاید ہی کبھی کسی نے دیکھا ہو۔

زبان اور اس کی باریکیوں پر گوپال متل کی بڑی گہری نظر تھی۔ علمی اور ادبی دنیا میں متل کی ایک مسلمہ حیثیت ہے۔ اس زمانے میں بھی جس کی میں بات کر رہا ہوں، مولانا صلاح الدین احمد، میاں بشیر احمد، اور حامد علی خاں ہمیشہ گوپال متل کی نظم ونثر کا ذکر تعریفی الفاظ میں کیا کرتے تھے۔ میرے استاد آقا بیدار بخت مرحوم تو ان کی نظم ونثر کا اکثر ذکر کرتے تھے اور ہمیشہ تعریفی انداز میں۔

قیام لاہور کے دوران میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں اور گوپال متل ایک ہی مکان کے دو مختلف حصوں میں مقیم رہے۔ ادبی تعلقات پر مبنی دوستی اور چیز ہے اور ایک ہی مکان میں رہنا دوسری بات۔ اکبر الہ آبادی نے ایسے ہی موقعوں کے لیے تو کہا ہے:

اکبر کی بھلائی اور برائی پوچھ محلے والوں سے
دیوان تو ہم نے بھی دیکھا ہے شعر تو اچھے کہتا ہے

اور اس طرح کے قیام کا جو تاثر آج تک باقی ہے وہ یہ ہے کہ یہ مختصر سا دور میری زندگی کا انتہائی خوش گوار دور تھا۔ دوسری جنگ عظیم اسی زمانے میں شروع ہوئی تھی۔ میری تنخواہ اس وقت بہت کم تھی۔ میں تیس روپے ماہانہ سے ترقی کرتے کرتے سو روپے ماہانہ تک پہنچا تھا۔ تنخواہ میں اضافے کے لالچ میں میں نے کسی ایسی ملازمت کے لیے درخواست دے دی جو جنگ سے وابستہ

تھی۔شاید لاہور سے باہر یا ملک سے باہر بھی جانا پڑتا۔ میری بیوی کو یہ بات بہت ناپسند تھی۔اس نے گوپال متل سے بات کی۔ گوپال متل نے مجھے بہت سمجھایا کہ جس ملازمت کے لیے تم نے درخواست دی ہے وہ لغو قسم کی ملازمت ہے۔انٹرویو وغیرہ کے لیے بلاوا آئے تو نہ جانا۔ میں نے ان کی بات نہ مانی۔ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ والد محترم ان دنوں راولپنڈی میں تھے۔متل نے انہیں لکھا۔وہ آئے اور انہوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر کے مجھے انٹرویو میں جانے سے روکا۔معلوم نہیں مجھے انٹرویو میں کامیابی ہوتی یا نہ ہوتی لیکن بعد میں جب جنگ نے طول پکڑا اور ملکی حالات واضح طور پر سامنے آئے تو گوپال متل کی اصابت رائے پر مجھے ایمان لانا پڑا۔

صحافت گوپال متل کا پیشہ رہا۔ اس میں ادبی صحافت بھی شامل ہے۔تقسیم ملک سے قبل ''نوائے وقت'' ہفتہ وار جب ''نوائے وقت'' روزانہ میں تبدیل ہوا تو حمید نظامی مرحوم نے انہیں ''نوائے وقت'' کے عملہ میں شریک ہونے کی دعوت دی جو متل نے منظور کر لی۔ وہاں متل ایک شفٹ کے انچارج مقرر ہوئے۔حمید نظامی مرحوم کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ ایک بار جب شفٹ کے انچارج کی حیثیت سے متل صاحب نے اسٹاف کے ایک رکن کے خلاف فیصلہ دیا تو حمید نظامی نے ان کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کی۔ یہ واقعہ مجھے حمید نظامی مرحوم نے خود سنایا تھا۔واضح رہے کہ ''نوائے وقت'' میں متل کے سوا تمام اراکین مسلمان تھے۔

تقسیم ہند کے بعد کچھ مدت ایسی بھی گزری کہ میں اور گوپال متل ایک ہی اخبار کے دفتر میں ملازم رہے۔اس میں مجھے اور گوپال متل کو زیادہ دیر تک کام نہیں کرنا پڑا۔ مجھے تھوڑی ہی مدت میں پبلیکیشنز ڈویژن کے شعبہ اردو میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی رسائی مل گئی اور گوپال متل نے ماہنامہ ''تحریک'' جاری کیا۔ اس تھوڑی ہی مدت میں مجھے گوپال متل کی ایک اور صلاحیت کو بہ نظر غائر دیکھنے کا موقع ملا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ انگریزی سے اردو میں بامحاورہ ترجمے پر گوپال متل کو غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ میں خود اگر کہیں ترجمے میں اٹکتا تھا یا کسی ترجمے کے متعلق مجھے شک ہوتا تھا تو میں جب تک گوپال متل سے بات نہیں کر لیتا تھا مجھے اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ اس دفتر میں باقی تمام حضرات بس واجبی قابلیت کے تھے۔زبان کی باریکیاں تو خیر ایک طرف رہیں، معمولی باتیں بھی ان کے حدود علم سے باہر تھیں۔بات چیت میں بھی سوائے ایک دوسرے پر ''اعتراضات'' کے یہ لوگ اور کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس ماحول میں میری اور گوپال متل کی قربت میں مزید اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا لیکن نہ جانے ایک دن کیا ہوا کہ میں اور گوپال متل آپس میں جھگڑ پڑے۔اب مجھے اس وقت بالکل یاد نہیں کہ اس کا سبب کیا تھا۔اس بات کو اب نصف صدی کے بعد تک یاد رکھنا تو مشکل ہے اور بات بھی کوئی بہت معمولی ہوگی لیکن اتنا مجھے یاد ہے کہ کوئی علمی یا ادبی بات نہیں تھی۔ہاں اتنا یاد ہے کہ نتیجۃً ہم دونوں میں بول چال بند ہوگئی اور تین چار دن اسی طرح گزر گئے۔ اب میری دقت یہ تھی کہ سارے دفتر میں علمی یا ادبی موضوع پر بات کرنے والا اور کوئی نہیں تھا۔ کسی لفظ کی سند تلاش کرنے کے لیے اگر کسی شعر کا خیال آتا تھا تو کسی سے پوچھ نہیں سکتا تھا کہ یاس یگانہ یا مولانا ظفر علی خان یا حسرت موہانی کے فلاں شعر کا پہلا مصرع کیا ہے یا دوسرا مصرع کیا ہے یا فلاں غزل کا مطلع یا مقطع کیا ہے۔ جوش کی فلاں نظم کا عنوان کیا ہے۔ عجیب گھٹن کی فضا تھی۔غالباً گوپال متل بھی یہی محسوس کر رہے تھے کہ ہم نے آپس میں بول چال بند کر کے خواہ مخواہ اپنے لیے ایک ضیق النفس کی فضا پیدا کر لی ہے۔کوئی تین چار دن کے بعد ایسا اتفاق ہوا کہ ہم دونوں اسی دفتر میں تنہا بیٹھے تھے۔ دونوں خاموش، کہ گوپال متل نے قہقہہ لگایا اور اپنے Assertive لہجے میں بولے:

Man, why don't you say clearly that we have made a mistake in quarelling with each other?

اس پر مجھے بھی ہنسی آ گئی کیونکہ متل نے میرے دل کی بات کہی تھی۔چنانچہ بات ختم ہوگئی اور میں نے اس قید تنہائی سے نجات پانے پر اطمینان کا سانس لیا۔

یہاں متل نے ایک اور عجیب و غریب بات بھی کہی اور وہ یہ کہ آزاد! اس سارے دفتر میں اور کوئی آدمی اس قابل بھی تو نہیں کہ اس کے ساتھ جھگڑا کیا جائے۔

متل اس زمانے میں اپنے مخاطب سے بات کرتے ہوئے اکثر اسے لفظ Man سے مخاطب کیا کرتے تھے۔معلوم نہیں بعد میں کیا صورت پیدا ہوئی کیونکہ میرے اور گوپال متل کے اخبار ''ملاپ'' سے الگ ہونے کے بعد ملاقات محض گاہے گاہے کی رہی ہے۔میں ۶۸ء میں دہلی سے سری نگر چلا گیا۔وہاں سے جموں آ گیا۔متل صاحب بھی دریا گنج کو چھوڑ کر راجندر نگر جا چکے تھے لیکن ان کے فرزند پریم گوپال متل کے ماڈرن پبلشنگ ہاؤس کی بدولت پھر ملاقاتوں کی ایک صورت پیدا ہونے لگی۔خدا پریم گوپال متل کو تندرستی اور طویل عمر کی دولت سے نوازے اور ان کے اردو کی نشر و اشاعت کے ادارے کو روز افزوں ترقی نصیب ہو۔یہاں میں ایک بار آیا تو گوپال متل وہاں موجود تھے۔ تین چار گھنٹے ان کے ساتھ بسر ہوئے تو یوں محسوس ہوا جیسے لاہور کا زمانہ واپس آ گیا ہو۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں ۱۹۴۸ء میں پبلی کیشنز ڈویژن میں آ گیا اور گوپال متل نے ماہنامہ تحریک جاری کیا۔نیشنل اکیڈمی متل کا ایک پرانا اشاعتی ادارہ تھا جو انہوں نے لاہور میں جاری کیا تھا۔دہلی میں اس کی بھی تجدید ہوئی اس وقت ہم دونوں میں طرح کا ادبی صحافتی رشتہ پیدا ہوگیا۔ متل ''تحریک'' سے وابستہ تھے بلکہ اس کے ایڈیٹر تھے۔میں ''آج کل''، ''بساط عالم'' اور ''نونہال'' سے متعلق تھا۔ اگرچہ ان رسائل اور تحریک میں ایک بعد المشرقین تھا لیکن یہ ماحول ایک بار پھر باہمی ملاقاتوں کا ایک اچھا ذریعہ بن گیا۔ جوش ملیح آبادی شعبہ اردو کے ایڈیٹر تھے۔عرش اور بلونت سنگھ بھی اسی دفتر میں تھے۔کچھ مدت بعد ہری چند اختر بھی اس برادری میں شامل ہو گئے۔عرش اور متل پرانے دوست تھے دونوں لدھیانے میں ایک مدت تک اکٹھا رہ چکے تھے۔ (غالباً متل نے لدھیانے سے اس زمانے میں ''صبح امید'' نامی ایک ماہنامہ نکالا تھا) اس لیے متل کبھی کبھار ''آج کل'' کے دفتر کا پھیرا کر لیا کرتے تھے۔

سیاسی خیالات کے اعتبار سے میں اس وقت تک اشتراکیت بلکہ اشتمالیت کا پورا پورا حامی بن چکا تھا اور متل اس کے پورے مخالف۔لیکن خیالات کا یہ اختلاف ہماری دوستی کے رستے میں کبھی حائل نہ ہوا۔ اور میں تو خیر اس قسم کا اشتراکی تھا جو حکومت ہند کے ایک ماہنامے کا نائب مدیر ہونے کے باعث اپنے خیالات کا اظہار بہت کھلم کھلا نہیں کرتا تھا۔ ساحر لدھیانوی تو کھلم کھلا اشتراکی تھے۔ساحر کے ساتھ متل کی دوستی بلکہ بہت گہری دوستی ساحر کی زندگی تک رہی اور ساحر کی موت پر متل نے ''تحریک'' میں جو اداریہ لکھا وہ ایک تحریر نہیں ہے بلکہ خون دل کی بوندیں ہیں جو متل کے قلم سے انتہائی شدت غم کے عالم میں کاغذ پر ٹپکی ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ متل اور میں جوش صاحب کے کمرے میں بیٹھے تھے۔علمی اور ادبی باتیں ہو رہی تھیں۔ نہ جانے

جوش صاحب کو کیا سوجھی کہ متل کے سامنے اشتراکیت بلکہ اشتمالیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ اس معاملے میں متل جو علم سیاست کا سمندر تھا کہاں یہ برداشت کرتا۔ جوش کا لگاؤ سیاست یا اشتراکیت کے ساتھ محض ایک جذباتی قسم کا تھا اور جوش ہزار منطق منطق کرتے رہیں متل ایسے جغادری کے سامنے کہاں ٹھہر سکتے تھے آخر اس بات چیت یا بحث مباحثے کی تان یہاں آ کر ٹوٹی۔ متل صاحب نے سوشلزم کی ''ماہیت'' بیان کرتے ہوئے یہ کہا کہ جوش صاحب سوشلزم کی جو تعریف آپ نے کی ہے اور جو خوبیاں آپ نے بیان کی ہیں ان کے پیش نظر سوشلزم روس میں نہیں بلکہ برطانیہ میں ہے۔ جوش اس وقت بحث ہار چکے تھے۔ کہنے لگے ہاں یہ تو ٹھیک ہے سوشلزم اپنی صحیح صورت میں برطانیہ ہی میں ملتا ہے۔ اب متل نے ٹرمپ کارڈ پھینکا اور کہا کہ جوش صاحب! گویا آپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ روس میں نہ سوشلزم ہے نہ کمیونزم۔ جوش نے جواب میں اتنا ہی کہا کہ ہاں صاحب، یہ تو صحیح ہے کہ روس میں نہ سوشلزم ہے نہ کمیونزم۔ یہ تھی جوش صاحب کی ترقی پسندی اور ترقی پسندی کے بارے میں ان کا علم، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ متل کے ساتھ بحث کرنا آسان نہیں تھا۔

جب متل چلے گئے تو میں نے جوش صاحب سے کہا جوش صاحب! آج ساری بات چیت بہت غلط لائنوں پر چلی۔

کہنے لگے وہ کیسے؟ میں نے کہا یہ آپ نے کیا کہہ دیا کہ روس میں نہ سوشلزم ہے نہ کمیونزم اور صحیح سوشلزم اگر کہیں ہے تو برطانیہ میں ہے۔ جوش بولے ہاں مجھے بھی کچھ خیال رہا کہ میں غلط بات کہہ رہا ہوں لیکن جب میں ایک غلط بات کہہ رہا تھا تو آپ نے مجھے ٹوکا کیوں نہیں اور آپ نے متل سے کیوں نہیں کہا کہ سوشلزم روس میں اپنی صحیح صورت میں موجود ہے۔ میں نے کہا متل سے بحث کرنا آسان نہیں اور سیاسیات میں بحث محض ایک ذہنی جمناسٹک ہے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ سوشلزم کی صحیح ترین صورت، روس میں ہے اور سوشلزم دنیا کے تمام دکھوں کا علاج ہے۔ ہندوستان ایسے ملک کی جہاں انفرادی سطح پر بددیانتی کی لعنت سے بہت کم لوگ محفوظ ہیں نجات صرف کمیونزم کو اپنانے میں ہے۔ اس پر جوش طیش میں آ گئے اور بولے کہ میں بھی یہی سمجھتا ہوں اور آپ کا ہم خیال ہوں لیکن آپ نے اس موضوع پر متل کے ساتھ بحث کیوں نہیں کی۔

میں:۔ محض اس لیے کہ اس بحث کے لیے جو حقائق Data ازبر ہونا چاہیے وہ میرے حافظے میں نہیں اور یہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر بحث صرف Facts and figures کے زور ہی سے ہو سکتی ہے اور پھر میرے یا آپ کے لیے یہ کیا ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو بحث مباحثے کے لیے بھی ہمیشہ تیار رکھیں۔ میرے لیے میرا یہ عقیدہ ہی کافی ہے کہ میں اس وقت تک جو کچھ ہوں اس کی تشکیل میں میرے اشتراکی خیالات کا بڑا حصہ ہے۔

جوش:۔ ہاں لیکن اپنے خیالات کو مدلل طور پر پیش کرنا بھی ضروری ہے (جیسے وہ تھوڑی دیر قبل خود کر چکے تھے)

میں:۔ صحیح ہے لیکن اس کے لیے اور لوگ ہیں۔ ہم آپ اس طرح کی سیاسی بحثوں کے لیے پیدا نہیں ہوئے:

ہر کسے را بہر کارے ساختند

جوش:۔ کون لوگ؟

میں:۔ مثلاً بنے بھائی (سجاد ظہیر)، سردار جعفری، فیض احمد فیض، ملک راج آنند، لیش پال، آل احمد سرور (سرور صاحب اس وقت تک ادب میں ترقی پسند تحریک کے ایک رہنما تسلیم کیے جاتے تھے) احتشام حسین، خلیل الرحمٰن اعظمی جنہوں نے اس موضوع کا اس طرح مطالعہ کیا ہے کہ یہ اب ان کا جزو مزاج بن چکا ہے۔

آخر الذکر نام جوش صاحب کو پسند نہیں آیا۔ اس نام نے ان کے چہرے پر تکدر کے آثار پیدا کر دیے، لیکن اپنی دلی کیفیت کو چھپاتے ہوئے بولے یہ آپ نے ٹھیک کہا ہے۔ اب جب احتشام یا سردار یہاں آئیں تو مجھے یاد دلایئے۔ اس وقت ہم متل کو دعوت دیں گے کہ آ کر ان سے بحث کریں۔ میں نے عرض کیا جوش صاحب، چھوڑیے اس بات کو، یہ مشتے بعد از جنگ والی بات ہے اور پھر کار دنیا کسے تمام نہ کرد۔ سردار اور احتشام جہاں ہیں وہاں اپنے اپنے دائرے میں یہ کام بخوبی انجام دے رہے ہیں..... اور یہ موضوع اس طرح ختم ہو گیا۔

بات میں گوپال متل کی کر رہا تھا اور درمیان میں ایک بہت ہی محبوب شخصیت کا ذکر آ گیا۔ جوش ملیح آبادی کا اور:

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!

تو ان دنوں ''آج کل'' کے دفتر میں ترقی پسند ادیبوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ سردار جعفری، ساحر، احتشام حسین، آل احمد سرور، ظ انصاری جب کبھی دہلی آتے تو آج کل کے دفتر میں ضرور آتے تھے۔ ان کو یہاں کھینچ لانے کا سبب جوش صاحب کی شخصیت تھی جن کی ترقی پسندی محض رومانوی انداز کی ہونے کے باوجود اردو شاعری کو جلا بخش رہی تھی۔ ان محفلوں کا نتیجہ یہ تھا کہ میں اپنے اشتراکی خیالات کی حمایت میں پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میرے پہلے مجموعہ کلام ''بیکراں'' میں تو ان خیالات کی ہلکی سی جھلک موجود ہے، لیکن دوسرا مجموعۂ کلام ''ستاروں سے ذروں تک'' انہی خیالات سے مملو ہے۔ ''ستاروں سے ذروں تک'' کے بعد میرا تیسرا شعری مجموعہ چھپا۔ اس میں ایک باب ہے ''چند ملاقاتیں عالم خیال میں'' اور یہ ملاقاتیں بنے بھائی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری اور ممتاز حسین کے ساتھ ہیں جو ان دنوں جیل میں تھے۔ گوپال متل نے اس نظم پر ''تحریک'' میں ایک شدید قسم کا ادارتی مقالہ لکھا۔ اب اس وقت یہ ایڈیٹوریل تو میرے سامنے نہیں ہے اس لیے اسے لفظ بہ لفظ یہاں لکھنے سے تو قاصر ہوں لیکن لب لباب اس ایڈیٹوریل کا یہ تھا کہ یہ اشتراکی خیالات رکھنے والا پبلیکیشنز ڈویژن (حکومت ہند) میں نائب مدیر ہے۔ اسے حکومت اس طرح کے سیاسی خیالات کی اجازت کیوں دے رہی ہے؟ اصولاً متل کی بات ٹھیک تھی۔ حکومت کے کسی ملازم کو اپنے سیاسی خیالات کی نشر و اشاعت کی اجازت نہیں ہونا چاہیے، لیکن متل کی تحریر کی زد چونکہ مجھ پر پڑتی تھی اس لیے قدرتی طور پر متل کی بات مجھے ناگوار گزری۔ متل نے اس کے ساتھ ایک اور ''زیادتی'' یہ کی کہ چند ماہ بعد اپنے اس ایڈیٹوریل کو دوبارہ شائع کر دیا۔ میں نے عرش سے کہا کہ متل نے اصول دوستی کے خلاف بات کی ہے۔ عرش نے کہا کہ یہ متل کے سیاسی Connection کی بات ہے جب وہ اس موضوع پر جواہر لعل نہرو، اندر کمار گجرال اور نورالحسن کے خلاف لکھتا ہے تو تمہارے خلاف لکھنے سے کیوں گریز کرے گا۔ تمہیں چاہیے کہ تم اپنے خیالات کو اپنے تک ہی محدود رکھو۔ کسی وقت عتاب حکومت کی زد میں آ جاؤ گے اور اس وقت چھٹکارا مشکل سے ہوگا۔

آخر ایک دن آیا کہ میں حکومت کے عتاب کی زد میں آ گیا، لیکن اس کے لیے متل کا ایڈیٹوریل ذمہ دار نہیں تھا۔ وہ معاملہ ہی دوسرا تھا۔ متل نے جو بات لکھی تھی کھلم کھلا لکھی تھی۔ مجھ پر چھپ کر وار نہیں کیا تھا اور کچھ مدت بعد جب میں حکومت کے عتاب کا ہدف بنا تو اس کے پیچھے بعض اشتراکیت دشمن دوستوں کی خفیہ اور در پردہ کوشش کارفرما تھی۔ سردار پٹیل جو منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ کے وزیر تھے اشتراکیت کے بہت خلاف تھے۔ میری وہ نظمیں ہی اور تھیں جن کے الٹے سیدھے انگریزی ترجمے حکومت تک پہنچائے گئے تھے، لیکن یہ واقعہ ایسا ہے جس کا تعلق میری ذات اور میرے سوانح حیات سے ہے۔

موجودہ مقالے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

تو کہہ میں یہ رہا تھا کہ میں نے متل کے اس اڈیٹوریل کا برا مانا اور متل سے میری ملاقات قریب قریب ختم ہوگئی لیکن اس قسم کے واقعات انسان کی زندگی پر کوئی پائدار اثر نہیں چھوڑتے۔ پائدار اثر چھوڑنے والی شے ہم سخنی اور ہم مزاجی ہے۔ آخر یہ کیفیت میرے تکدر پر غالب آئی اور میں اپنی تشنگی شوق مٹانے کے لیے متل صاحب سے اسی طرح ملنے لگا جس طرح پہلے ملا کرتا تھا۔

آج میں حکومت کا ملازم یا افسر نہیں ہوں۔ اور اپنے سیاسی خیالات کے اظہار میں کسی احتیاط یا مصلحت سے کام لینے پر مجبور نہیں اور متل کو یہ سب معلوم ہے لیکن متل نے میرے اس عمل پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ اعتراض اس وقت کیا تھا جب میں نے حکومت کا ایک افسر ہوتے ہوئے ان سیاسی خیالات کا اظہار کیا تھا جو حکومت کے خیالات نہیں تھے، گویا گورنمنٹ سروینٹس کانڈکٹ رولز کی خلاف ورزی کی تھی۔ آج میں محسوس کرتا ہوں کہ متل اپنے اظہار خیال میں حق بجانب تھا اور یہی سبب ہے کہ یہ بات اسی زمانے میں رفت وگزشت ہوگئی تھی اور اس کی جگہ اس کیفیت نے لے لی تھی جو ہم سخنی، ادبی ہم خیالی اور ہم مزاجی پر مبنی ہے۔ رہی اختلافات کی بات تو اس کے متعلق ڈاکٹر تاثیر مرحوم ایک بہت خوبصورت شعر کہہ گئے ہیں:

ہزار ہم سخنی ہو ہزار ہم نظری
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں

ابھی کچھ مدت ہوئی استاد محترم ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک مقالہ میری نظر سے گزرا جس میں انہوں نے چلتے چلتے تقسیم ہند کے زمانے کا بالخصوص نگینہ بیکری کی محفلوں کا ذکر کیا ہے۔ اس میں گوپال متل کا ذکر انہوں نے خاص طور سے کیا ہے۔

بہت دنوں کی بات ہے میں بزم تعمیر ادب کراچی کے مشاعرے میں اور کراچی یونی ورسٹی میں ایک مقالہ پڑھنے کے لیے پاکستان گیا۔ وہاں ابوالاثر حفیظ جالندھری سے ملاقات ہوئی۔ وہ بہت دیر تک گوپال متل کا ذکر کرتے رہے اور ان کے متعلق پوچھتے رہے۔ صرف ڈاکٹر سید عبداللہ اور حفیظ جالندھری ہی پر موقوف نہیں ہے مجھے پاکستان جانے کا اتفاق جب بھی ہوتا ہے اور وہاں لاہور، کراچی، پشاور، اسلام آباد اور راولپنڈی میں نئے پرانے دوستوں سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ لوگ ہندوستان کے اہل قلم کا یا اپنے ان دوستوں کا جو ہندوستان میں ہیں، ذکر کرتے ہیں۔ جب تک مالک رام، بنے بھائی اور گوپال متل زندہ رہے ان کا ذکر خاص طور سے ہوتا رہا اور

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

نواب محمد غوث خان اعظم

علیم صبا نویدی

نواب محمد غوث خان بہادر ۲۹ر ذی الحجہ ۱۲۳۹ھ مطابق ۲۸ر جولائی ۱۸۲۴ء بہ روز چہار شنبہ دن کے دس بجے مدراس میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد نواب محمد منور خان اعظم جاہ بہادر کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۳ر فروری ۱۸۲۰ء کو کرناٹک کا نواب متعین کیا تھا۔ نواب محمد غوث خان بہادر کی والدہ ماجدہ کا نام عنایت النساء بیگم تھا جو حیدر آباد کے ایک امیر نواب ابوالفخر خان ضیاالدولہ بہادر کی صاحب زادی تھی۔

تذکرہ گلزار اعظم میں نواب محمد غوث خان نے اپنا اصل نام محمد غوث بتایا ہے۔ انہیں امیر الہند والا جاہ، عمدۃ الامراء، مختار الملک، عظیم الدولہ نواب محمد غوث خان بہادر شہامت جنگ کے خطابات حاصل تھے۔ نواب محمد غوث خان نسبتاً فاروقی تھے۔ ان کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے بتیس واسطوں سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے اور والدہ کی طرف سے چھبیس ۲۶ واسطوں سے حضرت سیدنا امام حسین علیہ السلام پہنچتا ہے (تذکرہ گلزار اعظم)

جس وقت نواب محمد غوث خان بہادر کی عمر ابھی ڈیڑھ سال ہی کی تھی کہ ان کے والد ۳۰ر ربیع الاول ۱۲۴۱ھ مطابق ۱۳ر نومبر ۱۸۲۵ء کو سنگ مثانہ کے عارضے کی وجہ سے انتقال فرما گئے۔ انگریز حکام نے ان کے چہلم کے دوسرے روز، یعنی ۱۲ر جمادی الاول ۱۲۴۱ھ بہ مطابق ۲۳ر دسمبر ۱۸۲۵ء کو ڈیڑھ سالہ محمد غوث خان بہادر کو تخت نشین کیا اور ان کے چچا نواب عظیم جاہ سراج الامراء عمدۃ الملک، اسد الدولہ حافظ غلام محمد علی خان بہادر ذوالفقار جنگ کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے سترہ سال کی مدت کے لیے ریاست کا نائب مختار مقرر کر دیا۔ اس نیابت کی تاریخ محمد خان عالم خان تہور جنگ نے ''عظیم جاہ بہادر'' (۱۲۴۱) سے نکالی ہے اور نیز لفظ ''مختار'' (۱۲۴۱) سے بھی یہ تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

نواب محمد غوث خان نے باقاعدہ تعلیم جب شروع کی تو انہوں نے حافظ محمد علی اور ان کے فرزند حافظ عبدالولی سے قرآن شریف ختم کیا اور فارسی کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے، فارسی کی ابتدائی کتابیں غلام محی الدین خوشنویس اور ان کے فرزند مولوی جلال الدین حسین خان سے پڑھیں۔ بوستان، انشاء خلیفہ وزلیخا، گلشن سعادت، سہ نثر ظہوری، پنج رقعہ، مینا بازار، رسائل ظفراء مشہدی، انشاء بیدل، انشاء نعمت علی خان عالیؔ، مثنوی سکندر نامہ، مثنوی راسخ، اخلاق جلالی، دیوان مظہر، دیوان غنیؔ و دیوان ناصر علی سرہندی اور دیوان اسیرؔ جیسی کتابیں فاضل استاد سید ابوطیب خان والاؔ سے ختم کیں۔ فارسی کے بعد نواب محمد غوث خان اعظم کو عربی تعلیم حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ شرح ملا جامی تک ابتدائی کتابیں مولوی جلال الدین احمد فرنگی محلی سے پڑھیں، عقاید، فقہ اور احادیث کی لازمی تعلیم قاضی بدر الدولہ اور مولانا قاضی ارتضیٰ علی خان سے لی۔ عربی اور فارسی خوش نویسی عنایت حسین خان جیسے ماہر خوش نویسوں سے سیکھی۔ مولوی عبدالوہاب مدار الامراء نے نواب موصوف کو ریاضی کی تعلیم دی۔ ابھی

نواب محمد غوث خان کی عمر سترہ سال کی ہوئی تھی کہ انہوں نے مذکورہ بالا تعلیم و تربیت کو مکمل کر لیا۔ چونکہ ان کا مزاج شعر گوئی کی طرف فطرتاً مائل تھا۔ سترہ سال ہی کی عمر میں مشقِ سخن بھی شروع کر دی تھی۔

نواب محمد غوث خان کی تخت نشینی کی شاندار تقریب ۱۷ر رجب المرجب ۱۲۵۸ھ کو عمل میں آئی تھی، اس جشن کے موقع پر مدراس کے مشہور شاعر لطیف آرکاٹی نے ایک نظم کہی تھی جس کا ایک شعر ہے:

ندائے جشن جلوس سن کر، ہر ایک مومن دعا کی خاطر
کمال فرحت سے کر رہا ہے، جناب باری میں جُبّہ سائی

نواب محمد غوث خان فطرتاً بڑے فیاض تھے۔ ان کی فیاضی کی شان مدراس کے مشہور شاعر محمد علی الفتؔ نے اس طرح کہا ہے:

جہاں اس کو بولے ہے نواب و خاں — نہیں، بلکہ ہے وہ رئیس جہاں
امیر و فقیر اس کی دہلیز پر — بہ جان ہیں کھڑے سارے بستہ کمر
مبارک جو ایام ہونے پہ آئے — سخی ایسا ہم حاکم وقت پائے
تروتازہ باغ سخا کو کیا — طراوت ریاض عطا کو کیا

شعرا اور اہل فن نواب موصوف کی بارگاہ سے ہر حیثیت سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔ چونکہ نواب موصوف اہل علم و ہنر کے بڑے قدر دان تھے اس لیے ان کی ذات سے سیکڑوں، ہزاروں علما و فضلا و ادبا کی عزت افزائی ہوئی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ غیر اہل علم و ہنر بھی نواب موصوف سے وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ پاتے رہتے تھے۔

نواب محمد غوث خان کو وقت گزاری کے لیے بہت سے مشغلوں سے انس تھا۔ پتنگ بازی، آتش بازی، شعبدہ بنی، گھوڑ دوڑ، انواع و اقسام کے کھانوں سے دلچسپی، ولایتی ساز و سامان اور عمدہ کوٹھیوں کی خرید وغیرہ وغیرہ مگر اس کے ساتھ ساتھ مذہبی طور پر بھی انہیں ایمان افروز مجالس کے انعقاد کا بھی بڑا خیال رہتا تھا۔ انہیں اولیا کرام سے بڑی عقیدت تھی۔ اس لیے میلاد النبیؐ ربیع الثانی کی گیارھویں، نیاز پیران پیر وغیرہ کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ (آج کے پرنس اپنی سستی شہرتوں کے پیش نظر اپنے بزرگوں کے عقاید کو لایعنی سمجھتے ہیں) نیز اپنے آباؤ اجداد کے طریقوں کو خیر باد نہیں کہا اور باقاعدہ ان کے اصول کے مطابق ہی حدیث شریف کی مجالس آراستہ کرتے اور خود بھی ان میں شریک ہوا کرتے تھے۔

نواب محمد غوث خان بہادر اعظم اگرچہ بڑے فیاض اور سخی تھے مگر ان کی فضول خرچیوں نے انہیں قرض دار بنا دیا تھا۔ انگریز مورخین نے ان پر سخت اعتراضات کیے ہیں۔ مگر مولوی صفی الدین ناظر مذہبی کتب درسیہ جامعہ عثمانیہ نے ان اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ نواب اعظم کو اگرچہ ناچ گانے کا بہت شوق تھا جو خلاف شرع ہے لیکن اکثر مسلمان امرا سلاطین میں اس کا رواج عام رہا ہے۔ اس ایک الزام پر ان کو ذلیل کرنا ان مورخین اور مصنفین کو زیب نہیں دیتا۔ نواب اعظم کی زندگی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ بڑے راسخ الاعتقاد اور بڑی پاکیزہ صفت مسلمان تھے۔ انہوں نے یا ان کے کسی درباری یا خاندان کے کسی فرد نے کبھی نشہ آور چیز استعمال نہیں کی۔ جو اہل علم اس وقت دربار آرکاٹ میں جمع تھے ان کی مثال زمانہ آج تک پیش نہیں کر سکا۔

(مضمون ''تبصرہ بر ملک کرناٹک'' از مولوی صفی الدین)

نواب محمد غوث خان بہادر نے دو شادیاں کی تھیں پہلی شادی ۲۶ر رجب ۱۲۶۴ھ (۲۸ر جون ۱۸۴۸ء) میں ہوئی۔

ان کی پہلی بیگم نواب خیر النسا بیگم تھیں۔ جو سرکار آصفیہ میں امرائے معزز و نامدار کے خاندان سے تھیں۔ ان کا انتقال ۱۳۲۱ھ (۱۹۰۳ء) میں ہوا، ان سے نواب موصوف کو نرینہ اولاد نہیں ہوئی۔ ان سے صرف ایک لڑکی ہوئی تھی۔ نواب صاحب کی دوسری شادی ۱۷ر ذی الحجہ ۱۲۶۴ھ (۲۴ نومبر ۱۸۴۸ء) کو ہوئی، ان کی دوسری بیوی کا نام اعظم النسا بیگم تھا، جو عوام میں اعظم النسا بیگم ''جہانگیر حیدرآبادی'' سے مشہور تھیں اور نواب صاحب کی بہت چہیتی تھیں۔ ان سے بھی نواب صاحب کو ایک لڑکی ہوئی، نواب صاحب کے انتقال کے بعد اعظم النسا بیگم کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے چار ہزار روپے ماہانہ پنشن مقرر ہوئی (سخنورانِ بلند فکر، محمد منور گوہر) اعظم النسا بیگم کا ۲۴ جمادی الاول ۱۳۰۵ھ (۱۸۸۸ء) کو انتقال ہوا۔ (نواب اعظم اور مشاعرہ اعظم: از علامہ محمد حسین محوی صدیقی)

چونکہ ان دونوں بیویوں سے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی اس لیے انگریزی حکومت ''خطاب'' استحقاقِ حکومت اور منشیات خاندانی سب ختم کر دیے گئے اور نواب اعظم کی وفات پر اس برائے نام امارت و اقتدار کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ (نواب اعظم و مثنوی اعظم نامہ: ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال)

نواب اعظم نے صرف بتیس سال کی عمر میں ۲۴ر محرم ۱۲۷۲ھ (۵ر اکتوبر ۱۸۵۵ء) کو اچانک انتقال کیا۔ سرغیب (۱۲۷۲ھ) سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ مرنے سے پیشتر نواب اعظم کی زباں پر یہ شعر تھا:

نہ تھے میرے مرنے کے یہ دن ندیم — مجھے زہر دے کر ہے مارا حکیم

جامع الاخبار نے یہ خبر شائع کی تھی کہ نواب صاحب کثرت غفلت اور شدتِ خفقان کے باعث لقمۂ اجل ہوئے تھے۔ قادر حسین جوہر نے اپنی مثنوی ''اعظم نامہ'' میں نواب اعظم کی وفات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے لکھا ہے۔ لکھا ہے کہ نواب اعظم کی وفات سے کچھ دن پیشتر مسجد کلاں پر بجلی گری، اس واقعہ کی جب نواب اعظم کو اطلاع ملی تو انہیں اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ مایوسی کی باتیں کرنے لگے۔ ایک رات وہ سخت بے قرار ہوئے۔ صبح سویرے طبیب مسیح الدولہ خان کو بلانے کا حکم دیا۔ خادم ان کے پاس دوڑے۔ لیکن حکیم مسیح الدولہ خود نہیں آئے اپنے بیٹے کے ہاتھ سے دوا روانہ کر دی۔ نواب اعظم، مسیح الدولہ کے لڑکے سے ناراض تھے اس لیے دوبارہ مسیح الدولہ کے پاس آدمی روانہ کیے۔ وہ آئے اور خفقان کے مرض کا شبہ ظاہر کیا۔ نواب اعظم نے فصد پر اصرار کیا۔ وہ اپنے ہاتھ پر پٹی باندھے ہوئے تھے لیکن مسیح الدولہ فصد پر راضی نہ ہوئے اور تین دن تک توقف کرنے کو کہا، نواب اعظم بہت رنجیدہ ہو گئے ہاتھ پر بندھی پٹی کھول دی اور کہا ''اب میں زندہ نہیں رہوں گا۔ اس تکلیف میں مر جاؤں گا''۔

نواب محمد غوث خان، جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ اہل علم و ادب کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں رباطیں بھی تعمیر کروائی تھیں۔ لنگر خانہ بیوہ قائم کیا جس میں مفلس اور نادار عورتوں کی امداد ہوتی تھی اور اس کے لیے ماہانہ کثیر رقم مقرر کی گئی تھی۔ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) میں جارج ٹاؤن مدراس میں ایک عیدگاہ تعمیر کروائی، مدرسہ اعظم اور کتب خانہ عام اہل اسلام (وقف) (جس کی تفصیل مولانا کوکن کی تالیف ''قاضی بدرالدولہ'' میں بھی موجود ہے)، نواب اعظم کی علم دوستی اور فیاضی کی زندہ یادگاریں ہیں۔ (نواب اعظم و مثنوی اعظم: ڈاکٹر افضل الدین اقبال) مدرسہ اعظم کے تعلق سے پروفیسر یوسف کوکن رقمطراز ہیں: ''مدراس بلکہ ہندوستان بھر کے مسلمان علما و فضلا اور امرا میں سالار الملک بہادر پہلے شخص ہیں جنہوں نے انگریزی تعلیم کی حمایت اور سرپرستی کی انہوں نے اس زمانے میں اس کی حمایت کی جب کہ سرسید احمد خان مرحوم بھی

اس میدان میں گامزن نہیں ہوئے تھے''۔ (خانوادۂ قاضی بدرالدولہ۔ از یوسف کوکن)

یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ قاضی بدرالدولہ مدرسہ اعظم کے میر مجلس اور شیریں سخن خان راقم صدر مدرس بنائے گئے تھے اور مجلس نظما میں مولوی عبدالوہاب مدارالامرا، قاضی ارتضیٰ علی خان رئیس الامراء، دبیرالملک منشی الملک، سالارالملک، نواب صدارت خان اور ڈاکٹر ایڈورڈ بالفور اراکین مقرر تھے۔ مدرسہ اعظم کی ترقی میں نواب سالارالملک نے نمایاں حصہ لیا اور انہی کے متعلق پروفیسر یوسف کوکن نے مذکورہ بالا الفاظ رقم کیے ہیں۔

نواب اعظم کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں مگر ایک پہلوان کی علم وادب سے ربط رکھنے والا سب پر مقدم ہے۔ نواب محمد غوث خان نے اعظم تخلص اختیار کیا تھا۔ سترہ سال ہی کی عمر میں شعروشاعری میں مشق شروع کردی تھی۔ وہ سید ابوطیب خان والاؔ سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ والاؔ نے ان کی بہت ہمت افزائی کی اور اعظم نے بڑی تیزی سے عمدہ شاعری شروع کردی تھی اگرچہ اعظم کو والاؔ کا تلمذ حاصل تھا مگر آپ شاعری میں ناصر علی سرہندی کی تقلید پسند فرماتے تھے۔ جب مہدی واصفؔ نے اپنے مشہور فارسی تذکرے ''معدن الجواہر'' میں ناصر علی سرہندی کے کلام پر سخت اعتراضات کیے تو ان کا تفصیلی جواب نواب اعظم نے اپنے مشہور تذکرہ ''گلزار اعظم'' میں دیا ہے۔

محمد منور گوہر نواب اعظم سے متعلق کہتے ہیں کہ نواب اعظم کے لیے گھنٹے دو گھنٹے کی فکر میں ایک عمدہ غزل کہہ لینی معمولی بات ہے (سخنوران بلند فکر۔ محمد منور گوہر)

نواب غوث خان اعظم فارسی کے شاعر اور ادیب تھے۔ ان کے زیادہ کارنامے فارسی ہی میں ہیں اردو میں جو بھی کہا تھا وہ محض اپنی تفنن طبع کے باعث کہا تھا۔

نواب اعظم کے ادبی کارناموں میں تین تذکرے ''صبح وطن'' تذکرہ گلزار اعظم اور سفینۃ النجات فارسی میں ہیں، ''بہارستان اعظم'' ان کا ایک مختصر اردو اور فارسی دیوان ہے۔ ''صبح وطن'' اور ''گلزار اعظم'' میں جنوبی ہند اور خصوصاً کرناٹک کے شعرا کے حالات کا ایک مستند ذخیرہ ہے۔ مولوی نصیرالدین ہاشمی رقمطراز ہیں:

''تذکرہ صبح وطن'' اور ''گلزار اعظم'' کے باعث اس وقت کے فارسی اور اردو کے بڑے بڑے نامور شعرا کا حال آج تک محفوظ ہے اگر یہ تذکرے مرتب نہ ہوتے تو شاید اس وقت کے شعرا کے حالات کا پتہ ہی نہ چلتا۔ اعظم نے ان دونوں تذکروں کو مرتب کر کے علمی اور شاعری کی دنیا پر احسان عظیم کیا ہے''۔

(نواب محمد غوث کے بعض علمی کارنامے، مطبوعہ دکنی کلچر، مطبوعہ لاہور۔ از نصیرالدین ہاشمی)

''سفینۃ النجات'' فن جہاز رانی کے قواعد وضوابط اور اس کی اصطلاحوں وغیرہ پر موقوف ایک مختصر رسالہ ہے۔

''بہارستان اعظم'' اعظم کے فارسی اور اردو اشعار کا ایک مختصر انتخاب ہے جو اعظم کی وفات کے اٹھائیس سال بعد مطبع مظہر العجائب مدراس سے شائع ہوا تھا۔ اس میں فارسی میں نعت، منقبت، مرثیہ اور غزلیں ہیں اور چار قصائد سرور کائنات ﷺ اور اسباب المومنین کی مدح میں ہیں پھر اردو میں پانچ مکمل غزلیں اور چھ مکمل غزلیات شامل ہیں اور آخر میں فارسی میں نواب اعظم کے مختصر حالات فارسی میں درج ہیں اور ان کے کلام پر تبصرہ ہے۔ ڈاکٹر فضل الدین اقبال نے اطلاع دی ہے کہ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد میں بہارستان اعظم کے دو مطبوعہ نسخے محفوظ ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری ''اردو کی ادبی تاریخ'' میں رقمطراز ہیں:

''محمد غوث خان اعظم کے ستھرے مذاق اور علم دوستی کے مدنظر ان کے اطراف اچھے عالم اور سخن سنج اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان کی وجہ سے اردو شاعری کو جو محرک نصیب ہوا تھا اس کے باعث مدراس اور اس کے دور دراز حصوں میں اردو شاعری کا ذوق پھیل گیا تھا کہ مختلف حصوں سے صدہا شاعر اور نثر نگار پیدا ہوتے رہے''۔

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے ''نواب محمد غوث خان اعظم نے شمال اور جنوب کے اساتذہ اردو کے کلام کا مطالعہ کیا تھا اور غزل بہت اچھی کہتے تھے''۔

''مدراس میں اردو'' میں نصیرالدین ہاشمی کا بیان ہے کہ:

''بہترین غزل کے لیے جن لوازم کی ضرورت ہے تخیل کی بلندی، خیالات کی تازگی، مضمون کی رنگینی، زبان کی صفائی یہ سب اعظم کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ جس کی توثیق ان کے کلام سے بخوبی ہو سکتی ہے''۔

مدراس میں نواب اعظم کی شاعری کا زمانہ لکھنو میں ناسخ (م ۱۸۲۸ء) آتش (م ۱۸۴۶ء) اور دہلی میں غالب (م ۱۸۶۹ء) ذوق (م ۱۸۵۴ء) مومن (م ۱۸۵۱ء) کا زمانہ تھا۔ ٹھیک اس دور میں مدراس میں باقر آگاہ کے شاگرد اور نواب اعظم کے درباری شعرا مثلاً حبیب اللہ ذکا، مہدی واصف، غلام احمد احمدی، سید درویش مخلص، قادر حسین جوہر، گزارش خان شاعر اور شاہ فتاح احمد منظر اپنے کلام کے مظاہرے کر رہے تھے۔ اسی دور میں مدراس میں خان عالم خان فاروق، حکیم عبدالباسط عشق، محمد قادر علی بے ہوش، تاج الدین بہجت، حسن علی مائل حسن، ارتضیٰ علی خان خوشنود، شاہ عزیزالدین دید جیسے باکمال شعرا اپنی محفلیں سجائے ہوئے تھے۔ مدراس سے باہر ضلع شمالی آرکاٹ، آرکاٹ ویلور اور دیگر مقامات میں بھی بہت سارے قدآور شعرا آسمان ادب پر چمک رہے تھے، جیسے سید عبداللطیف آرکاٹی، سید محمد حسین تمنا ترپانوری، ذوقی ویلوری، حکیم عثمان سرور آرکاٹی۔

نواب اعظم کے شاعری کے موضوعات اس دور کی معاملاتی شاعری سے زیادہ دور نہیں ہیں اور نہ ہی اتنی سطحی ہیں کہ اعظم کو بہت پست کر دیں۔ مگر تخیل میں پرواز کی ہمیشہ کوشش نظر آتی ہے۔ پھر اظہار میں رنگینی اور جمالیاتی وصف کو قائم رکھنے میں اعظم بہت کامیاب ہیں۔ ان کی فکر کی جولانیاں ملاحظہ کیجیے اس میں اچھی غزل کے تمام لوازمات پُر ہیں:

داغ دل چمکا جو عشق سیمبر پیدا ہوا — لو زمیں پر دوسرا رشک قمر پیدا ہوا
ماجرائے چشم کو بتلایا ارژنگ کا — بعد مدت کے یہ مرغ نامہ بر پیدا ہوا
مشہد بلبل پہ رکھتی ہے صبا لالہ کے گل — نالۂ مرحوم میں آخر اثر پیدا ہوا

مذکورہ بالا اشعار میں نئی ترکیبات مثلاً ''عشق سیمبر'' ''مشہد بلبل'' اور ''نالۂ مرحوم'' اعظم کی سلیقہ شعر گوئی کی طرف پوری طرح اشارہ کرتی ہیں۔ زبان کی صفائی صاف کہتی ہے کہ دہلی اور لکھنو کے شعرا کے حد درجہ عروج کے دور میں اعظم نے اپنی جو بساط بچھائی تھی، اس پوری برصغیر کی شاعری کی عکاس تھی۔

یہ اشعار جس شعوری واظہاری بلندی کو چھوتے ہیں وہ اپنے آپ گویا ہیں غور کیجیے:

آتی ہے خاک قیس سے ہر دم صدائے دل — باتوں پہ دلبروں کے تو ہرگز نہ جائے دل
سینہ مرا چمن ہوا گل ہائے داغ سے — اس شمع رو کی یاد میں بس داغ کھائے دل

معمولی مضامین میں بھی اظہار کی بلندی کو قائم رکھنے کی کوشش ذیل کے اشعار سے پوری طرح واضح ہے۔ غور کیجیے:

کیوں نہ تڑپے دل تباہی آنسوؤں کی دیکھ کر — ایک مدت کے یہ طفل اشک ہیں پالے ہوئے
یاد میں اس شمع رو کی رات جو رویا کیا — نالہ ہائے دل مرے آتش کے پرکالے ہوئے
کیفیت لائی صبا جو نرگس مخمور کی — گل چمن میں کر گریباں چاک متوالے ہوئے

اعظم کے اس شعر میں عارض زیبا کی وجہ سے زلفوں کو جو رتبہ ملا اس کی تعریف جتنی بھی کی جائے کم ہے۔ یہ فکری جدت کی بڑی اچھی مثال ہے غور کیجیے:

رتبہ زلفوں کو ملا عارض زیبا سے ترے — جیسے دو شب کو فضیلت ہوئی آدینہ سے

اعظم کے ہاں رعایت لفظی خاص توجہ طلب ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

آئے ہیں کان چشم سے اشک زمردی — کس سبز رنگ سے تمہیں اعظم لگائے دل
جب سے نظر نہ آئی ہے یہ چشم نرگسی — ہیں گرچہ آنکھ مجھ کو، پہ نور بصر نہیں
اعظم گیا ہے جب سے کہ وہ صندلی لباس — بتلایئے کبھی تو بھلا درد سر نہیں

اعظم شاید صنائع بدائع کی طرف بہت زیادہ توجہ فرماتے ہیں اسی لیے ان کی شاعری ان سے لیس دکھائی دیتی ہے۔ مراعات النظیر کی مثال میں یہ شعر دیکھیے:

عشوہ و غمزہ کرشمہ، ناز اور انداز سے — الغرض دل لے لیا ظالم نے سو سو ناز سے
تاک لے یک بار گر اس چشم میگوں کو تو پھر — کیسا عجب ہے پانی پانی ہو جو دل انگور کا
لیوے اگر وہ ہاتھ میں ساغر شراب کا — ہو جائے پانی شرم سے دل آفتاب کا

شاعرانہ تعلی گوارا حدوں میں ہو تو جبینوں پر شکنیں نہیں ابھرتیں۔ اعظم کے اس شعر میں بھی اسی پسند کی حدیں ملتی ہیں دیکھیے:

ایک قطرہ کو مرے اشک کے پہنچا نہ کبھی — تو نے اے ابر کئی سیل بہا کر دیکھا

اکثر معاصرین اعظم نے اعظم کی ذہانت، زکاوت، ندرت کلام، زود گوئی بدیہہ سنجی اور طباعی کو بہت سراہا ہے۔ مثلاً ان کے سراہنے والوں میں سید مرتضیٰ بینش، قدرت اللہ قدرت جیسے بلند قد شعرا موجود تھے۔ بینش کہتے ہیں:

''نواب اعظم کی طبیعت کی تیزی اور ذہن کی صفائی کا یہ عالم ہے کہ ارباب شعرا میں اکثر اوقات طرحی غزل ایک گھنٹے میں بخوبی تحریر فرما لیتے ہیں''۔ (اشارات بینش مطبوعہ دہلی ۱۹۷۳ء)

نواب اعظم اپنے مخصوص مشاعروں میں جو ''مشاعرۂ اعظم'' کے نام سے موسوم ہوتے تھے ہمیشہ ایک ایک دو دو گھنٹے غزلیں کہہ کر اپنی مشاقی کا ثبوت دیتے تھے۔ جہاں لوگ چند شعروں کی ایک غزل کہنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے تھے۔ اکثر موقعوں پر اعظم آسانی سے غزل کہہ لیتے تھے۔ ایک بار کسی مشاعرہ میں جس میں میر مجلس مشاعرہ اعظم شیریں سخن خان راقم نے ایک طرحی مصرعہ دیا تھا جس میں ہر سخن سنج کو دعوت فکر تھی، اس میں میر مہدی ثاقب بھی مدعو تھے۔ انہوں نے عرض کیا:

حضرتا! بے ادبی معاف! ما بفکر غزلے حیرانیم و جناب عزم قصیدہ دارید خدا حافظ (حضور والا! بے ادبی معاف! ہم ایک غزل کی فکر میں حیران ہیں اور حضور قصیدے کا عزم رکھتے ہیں۔ خدا حافظ ہے!) (گلزار اعظم)

سنا جاتا ہے کہ اعظم اسی رات قصیدہ لکھنے بیٹھ گئے۔ محرم کا مہینہ تھا اور ایک طویل قصیدہ (سنتالیس ۴۷ شعر کا) حضرت سیدنا امام حسین کی شان میں لکھ لیا اور دوسری صبح احباب کے پاس پہنچا، سب حیران رہ گئے کہ اتنا مرصع قصیدہ تخلیق پا چکا ہے۔ یہ قصیدہ ''گلزار اعظم'' میں موجود ہے۔

مشاعرہ اعظم کے نام سے بزم سخن کا قیام ۱۲۶۱ھ میں ہوا اور دس برس تک ہفتہ وار شعری مجلسوں کے طور پر اپنی دھوم قائم رکھے ہوئے تھا۔ ان مشاعروں کی خصوصیت یہ تھی کہ شاعر کے کلام پر مدلل نکتہ چینی اور تنقید کا حق شعرا کو حاصل تھا۔ آخری اور قطعی فیصلہ میر مجلس مشاعرہ افضل الشعرا شیریں سخن خان راقم کو کرنا پڑتا تھا جس پر سب کو سر تسلیم خم کر دینا پڑتا تھا۔ یہ مشاعرے سرکاری مشاعرے ہوتے تھے اور صدارت خود اعظم فرماتے تھے۔ آداب مجلس اور آئین اخلاق ان مشاعروں کی شان تھے۔ ہجو اور تحقیر کی سخت ممانعت تھی اور اس مشاعرے میں شریک ہونے والے شعرا اور سامعین ایک دوسرے سے خوش گوار مراسم قائم رکھتے تھے۔ علامہ محوی صدیقی کہتے ہیں: ''آپس میں طنز و طعن کو یہ لوگ خود بھی تہذیب کے خلاف، شرافت کے منافی اور شان علم و ادب کے بالکل غیر شایاں سمجھتے تھے۔ اس لحاظ سے دربار اعظم کو جس قدر سراہا جائے کم ہے اور اس مذاق سلیم کی جتنی داد دی جائے بجا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے بعض دیگر امرائے ہند کے درباروں اور درباری مشاعروں سے اسے ممتاز کر دیا ہے''۔ (محمد حسین محوی، نواب اعظم اور مشاعرۂ اعظم۔ مطبوعہ رسالہ اردو اپریل ۱۹۳۳ء)

غرض نواب محمد غوث خان اعظم صرف ایک شخص نہیں تھے بلکہ ایک انجمن تھے اور انجمن ساز بھی تھے۔ ان کے بعد ایک طویل عرصے تک مدراس میں خصوصی طور پر اور کل جنوبی ہند میں ان کی ادبی تحریکات کا سلسلہ قائم رہا اور جنوب میں مشاعروں کی جو داغ بیل پڑی اس کے محرک ''مشاعرۂ اعظم'' ہی کو سمجھیں تو غلط نہیں۔ اعظم کی تاریخ، تاریخ ادب اردو کا ایک سنہرا دفتر ہے جس کے صفحات اپنی نورانی روشنی سے آنے والی نسلوں کو دعوت فکر دیتی رہے گی۔

حواشی

۱ یہ کتب خانہ ایڈورڈ بالفور کے ایما پر نواب اعظم کی نگرانی میں قائم ہوا۔ آج یہ کتب خانے کی عمارت خود پرنس آف آرکاٹ کے رشتہ داروں نے (جو بظاہر اردو دوست ہیں) مسمار کر دی ہے اور کتب خانے کے ان مول اور بیش بہا کتابوں کا ذخیرہ (جس سے مجھ جیسے لاکھوں دیوانے اپنی علمی و ادبی پیاس بجھاتے تھے) پتہ نہیں کہاں غائب کر دیا۔ حقیقت میں یہ کتاب خانہ کا تمام اثاثہ (Public property) تھا، کسی خاندان کی اپنی ذاتی جائداد نہیں تھی۔ ہماری قوم اور حالیہ پرنس آف آرکاٹ کی بے حسی کا بھی کوئی جواب نہیں۔

آپ بیتی۔ مقاصد و محرکات

ڈاکٹر سلیم اختر

آپ بیتی کیوں قلم بند کی جاتی ہے؟ یہ سوال اس وقت مزید اہمیت حاصل کر لیتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپ بیتی قلم بند کرنے والوں میں اگر ایک طرف تیمور، بابر اور جہانگیر جیسے بادشاہ تھے تو دوسری جانب سلیم اختر جیسے بھی کہ تین میں نہ تیرہ میں، اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ اردو ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کی زبانوں میں، اہم اور غیر اہم آپ بیتیاں قلم بند کی گئیں۔۔تو کیوں؟

اگرچہ اردو نثر کی دو سو سالہ تاریخ کے کل نثری سرمائے کے مقابلے میں آپ بیتیوں کی تعداد خاصی کم ہے، آٹے میں نمک کی مثال، فی برس کے حساب سے شاید دو سو بھی نہ ہوں لیکن پھر بھی، نہ نہ کرتے ہوئے، قابل مطالعہ آپ بیتیاں مل ہی جاتی ہیں۔ اگر میر تقی میر کی فارسی میں تحریر کردہ ''ذکرِ میر'' (۱۱۹۷ھ) کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیں تو تعداد کے ساتھ ساتھ انداز و اسلوب کے تنوع میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

الطاف حسین حالی نے سرسید احمد خاں کی سوانح عمری ''حیات جاوید'' کے دیباچے میں لکھا تھا:

''اگرچہ ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اس کی تمام خوبیوں اور تمام فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے، ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بائیوگرافی کرنیکل طریقہ سے لکھی جاتی، اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں، ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔ لیکن اول تو ایسی بائیوگرافی چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی.....''

الطاف حسین حالی جو لکھ رہے تھے وہ صدی بعد بھی اتنا ہی درست ہے جتنا ۱۹۰۱ء میں!

جس ملک میں ''کرنیکل بائیوگرافی'' لکھنی محال ہو اور شخصیت نگاری محض ''چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت'' نہ رکھتی ہو وہاں ''کرنیکل آٹو بائیوگرافی'' کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟ ذات وصفات کے حوالے سے ایسی کرنیکل آٹو بائیوگرافی کہ چاندی سونے کا ملمع اتر جائے اور اندر سے شخصیت کا پیتل نکل آئے، قلعی اتر جائے اور برتن کی گندگی کے ساتھ اس کے چب بھی نمایاں ہو جائیں۔ کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن؟

سوانح نگار موضوع بننے والی شخصیت کے باطن میں اتر کر اس کا احوال قلم بند کرتا ہے (یا ایسا کرنا چاہیے) جبکہ خودنوشت کی صورت میں فرد کو اپنی شخصیت سے باہر نکل کر غیر متعلق اور غیر جانب دار مبصر کی مانند، مشاہدۂ ذات کے عمل سے گزرنا ہوتا ہے، گویا دوربین لگائے، دوسرے سیارہ کی مخلوق کے انداز و اطوار ضبط تحریر میں لا رہا ہو اور یہی سب سے زیادہ مشکل (مگر

ناممکن نہیں) ہے اس لیے کہ ہر شخص اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ میں ذات وصفات کے لحاظ سے منفرد ہوں تو انداز و اطوار کے لحاظ سے یکتا۔ روسو نے اپنے "Confessions" کا آغاز ان بولتی سطروں سے کیا تھا:

''میں جس کام کا آغاز کر رہا ہوں یہ بلحاظ نوعیت بے مثال ہی نہیں بلکہ اس کی نقل بھی مشکل ہو گی۔ میں دنیا والوں کے سامنے ایک آدمی کو اس کی فطرت کی تمام سچائی کے روپ میں پیش کر رہا ہوں اور وہ آدمی میں خود ہوں۔ صرف میں تنہا ہی اپنے قلب سے واقف ہوں اور ویسے بھی میری ساخت دیگر افراد جیسی نہیں، یہ میرا ایمان ہے، اگر میں دوسروں سے بہتر نہیں تو یقیناً میں ان سے مختلف ہوں۔ میرے بعد مجھ جیسوں کی تخلیق کا سانچہ تلف کر کے قدرت نے اچھا کیا یا برا، تو اس کا فیصلہ میرے کُل حالات کے مطالعہ کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے..... میں نے اس کام کو بلحاظ نوعیت آپ اپنی مثال بنانے کا تہیہ کیا تھا۔ لامثال سچائی سے کام لے کر، میں دنیا کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ دیکھو! یہ ہے اس شخص کی اصلی اور حقیقی تصویر..... میرا یہ عقیدہ تھا اور اب بھی میرا یہ ایمان ہے کہ دریں حالات، تمام امکانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں تمام انسانوں میں بہترین ثابت ہوتا ہوں''۔

اگرچہ بیشتر قلم کاروں نے ایسا نرگسی اعلان نہ کیا، لیکن میر تقی میر کی شاعری اور غالب کے خطوط کا مطالعہ کریں تو وہاں بھی اس سے مشابہ رویہ کا احساس ہوتا ہے۔ میر تقی میر کی مثنوی ''خواب وخیال'' اور غزلوں کے متعدد اشعار، مومن کی بیشتر عشقیہ مثنویاں اور غزلوں کے بعض اشعار ایک نوع کی آپ بیتی ہی ہیں جبکہ اپنے سوانح نگار مولانا حالی سے کہیں بہتر اسلوب میں غالب نے اپنے خطوط میں ذات وصفات اجاگر کیں۔۔حتیٰ کہ جن امور میں حالی خاموش رہے غالب نے ان کا تذکرہ بھی کر دیا اور وہ بھی حالی کی ''کرنیکل بائیوگرافی'' والی بات سے پچاس ساٹھ برس قبل!

ہم جن بے معنی کلیشوں کے بھنور میں عمر بتا کو گردش میں رکھتے ہیں ان میں سرفہرست ہیں مشرقی شرافت، مشرقی وضع داری، مشرقی انکساری، مشرقی روایات، مشرقی پردہ پوشی۔ الختصر! منافقت بنام مشرق! اس لیے سچ کے نام پر جھوٹ، حقائق کے نام پر اخفا اور شرافت کے نام پر منافقت کے سکے رائج الوقت ہیں مگر یہ سکے کس ٹکسال سے نکلے اس بارے میں کوئی تردد نہیں۔ اردو میں گنتی کی چند ہی آپ بیتیاں صداقت کے معیار پر پوری اترتی ہیں، ورنہ سبھی نے خود کو چاندی کے ورق میں لپٹا ہوا پان کا بیڑا جانا مگر خود اس سے لاعلم رہے کہ پان کا پتہ، تازگی کی سبزی سے عاری ہو کر محض کاغذی بن چکا ہے۔ جبکہ بقول ظہیر کاشمیری:

خوشبو اڑی تو پھول فقط رنگ رہ گیا

اسی لیے بیشتر آپ بیتیاں کاغذی پھول محسوس ہوتی ہیں، شخصیت کی مہک سے عاری۔

نفسیاتی لحاظ سے آپ بیتی کا اساسی محرک نرگسیت میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ شاعروں اور اہل قلم کی نرگسیت خاصی نمایاں نظر آتی ہے، عام طرز عمل میں نمایاں تو اشعار میں تعلّی کی صورت میں نمایاں تر، لیکن دیگر افراد بھی اس سے یکسر عاری نہیں ملتے:

Magic Mirror on the Wall

Am I the Fairest of All?

آئینے کا چکور بننے سے لے کر شاعری میں تعلّی، مصوری میں سیلف پورٹریٹ اور نثر میں آپ بیتی کی صورت میں نرگسیت خود لذتی کا ذریعہ تلاش کرتی ہے۔

آپ بیتی میں نرگسیت کے اظہار کی جو صورتیں مل سکتی ہیں ان میں سرفہرست خود ساختہ اور پسندیدہ رنگ میں مرقع ذات، اپنی مبینہ خوبیاں اجاگر کرنا اور اپنی مفروضہ (یا حقیقی) خامیوں کا تذکرہ، جنسی مہمات، مخالفین اور دشمنوں پر تبرا، نسب اور خاندان پر فخر اور اسلوب میں جذباتیت پر مبنی مبالغہ۔ بیشتر معروف آپ بیتیوں میں ان میں سے کچھ عناصر مل جائیں گے جیسے ''کار جہاں دراز ہے'' (قرۃ العین حیدر) ''شہاب نامہ'' (قدرت اللہ شہاب) ''مٹی کا دیا'' (میرزا ادیب) ''جہان دانش'' (احسان دانش) ''جو رہی سو بے خبری رہی'' (ادا جعفری) ''بری عورت کی کتھا'' (کشور ناہید) ''ادھوری سرگزشت'' (انیس ناگی) ''یادوں کی برات'' (جوش ملیح آبادی) ''اپنا گریباں چاک'' (ڈاکٹر جاوید اقبال) ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' (شہرت بخاری) ''میرے مہ و سال'' (جاوید شاہین) ''تمنا بے تاب'' (رشید امجد) ''گرد راہ'' (اختر حسین رائے پوری)، ''ہم سفر'' (حمیدہ اختر) اور حمایت علی شاعر کی منظوم ''آئینہ در آئینہ''۔ اور پُر مزاح اسلوب میں تحریر کردہ مشتاق احمد یوسفی کی ''زرگزشت''۔

کیا آپ بیتی کی تحریر میں ''ضمیر'' کا بھی کچھ کردار ہوتا ہے؟ یہ دلچسپ سوال اس لیے جواب طلب ہے کہ بعض اوقات آپ بیتی کو ''بیان حلفی'' ''اقبال جرم'' قسم کی تحریر میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ آپ بیتی رقم کرنے والا ملزم یا مجرم نہیں بلکہ بوجوہ معاشرے میں مقام و مرتبے کا حامل ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود (یا پھر اسی وجہ سے) اسے متعدد ناگوار سمجھوتے کرنا پڑتے ہیں۔ زبان کھولنے کے مواقع پر زبان بند رکھی۔ ترقی، اقتدار، منصب، دولت، شہرت کے لیے دوسروں کے حقوق غصب کیے اور اپنے حق میں ڈنڈی ماری، دوسروں سے زیادتیاں کیں، جھوٹ بولا، سچ کی پردہ پوشی کی یا اسی نوعیت کے دوسرے اعمال و افعال۔ اس لیے ضمیر یا نفسیاتی تسکین کے لیے آپ بیتی کو اپنے ''دفاع'' میں سند یا گواہی بنا دینے کا امکان بھی ہو سکتا ہے۔ یوں آپ بیتی عصر و معاصرین اور تاریخ کے سامنے ''جواب دعویٰ'' کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ'' اسی لیے متنازعہ ثابت ہوئی۔ ''معذرت'' تو قبول ہو جاتی ہے مگر بغیر چھان پھٹک کے گواہی درست تسلیم نہیں کی جاتی بالخصوص اگر ذات و اعمال کے لیے گواہی بھی اپنی ہی ہو مگر ''خود اطمینانی'' کے لیے ایسا انداز اپنایا جاتا رہا ہے۔

آپ بیتی اگر ذات و صفات اور کردار و اعمال کی ترازو ہے تو اس کے دونوں پلڑے کبھی بھی متوازن نہ رہیں گے اس لیے کہ نفسیاتی تسکین، ضمیر کی تشفی اور تاریخ کی خاطر بسا اوقات اپنے ہی حق میں ڈنڈی ماری جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے اسلوب سے کیموفلاج بھی کیا جا سکتا ہے۔

آپ بیتی قلم بند کرنے والے اور اس کے قارئین میں کسی طرح کا بھی قلبی تعلق اور ذاتی رشتہ نہیں ہوتا۔ قاری آپ بیتی کا مطالعہ اس توقع پر کرتا ہے کہ دیکھیں کیا گزری تھی قطرے پہ گہر ہونے تک! اس لیے حقیقی ہونے کے باوجود بھی اسے محض حقیقی نہ ہونا چاہیے بلکہ اس میں چیزے دگر بھی ہونی چاہیے۔ شاید یہ مثال پسندیدہ نہ ثابت ہو۔ بگھار کے بغیر بھی دال کھائی جا سکتی ہے لیکن گھی کے بگھار سے اس میں جو فلیور پیدا ہو جاتا ہے وہ اسے زیادہ لذیذ اور دل پسند بنا دیتا ہے۔ بس یہی کام آپ بیتی کا بھی ہونا چاہیے کہ واقعات و کوائف کے بیان کے ماورا دلچسپی کا فلیور بھی ملے۔ یہ فلیور اسلوب سے پیدا ہوتا ہے۔

اسلوب کی جمالیات کے عناصر کی بحث میں الجھے بغیر یہ امر توجہ طلب ہے کہ آپ بیتی ذات و صفات، جسم و جان اور شخصیت کی روداد ہوتی ہے اس لیے آپ بیتی کا اسلوب ہر لحاظ سے ان سب کا مظہر ہوگا۔ غیر ذاتی تخلیقات میں تو غیر شخصی اسلوب اپنایا جا سکتا ہے لیکن شخصیت کی مظہر آپ بیتی میں غیر شخصی اسلوب اپنانا ناممکن ہے۔ اسی سے قرۃ العین حیدر، جوش ملیح آبادی، میرزا ادیب کے اسالیب کا انداز متعین ہوتا ہے۔ ''یادوں کی برات'' کے اسلوب میں ''مٹی کا دیا'' نہ لکھی جا سکتی تھی کہ میرزا ادیب

جوش ملیح آبادی نہ تھے اور یہ دونوں قرۃ العین حیدر نہیں اور قرۃ العین حیدر، ادا جعفری نہیں اور ادا جعفری کشور ناہید نہیں۔

ادب کی دیگر تخلیقی اصناف میں اسلوب، شخصیت سے فرار ہو سکتا ہے مگر آپ بیتی میں نہیں کہ لکھنے والا آپ بیتی کی صورت میں شخصیت ہی کا تو اظہار کر رہا ہوتا ہے۔ پھر اسلوب میں شخصیت سے فرار کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ خود سے فرار حاصل کر کے جائے گا کہاں؟ فرار کرنے والے پر خاصی دیر کے بعد یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ تو اپنے ہی جوتے پہنے، خود سے دور بھاگ رہا ہے۔

آپ بیتی قلم بند کرنے والا تاریخ میں زیست کرتا ہے لہٰذا تاریخ اور اس کے ساتھ ساتھ عصر و معاصرین کے بارے میں پسند، ناپسند، تعصبات، نفرت وغیرہ پر مبنی اس کے رویے، آپ بیتی میں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اظہار پا سکتے ہیں لیکن ان کا بیان یا ان پر تبصرہ ذاتی ہوگا لہٰذا اس سے مورخ جیسی غیر جانبداری کی توقع نہ ہونی چاہیے (ویسے تو مورخ کی غیر جانبداری بھی مفروضہ ہی ہے) اسے یوں سمجھیے کہ حکومت اور حکمران مشترک ہوتا ہے مگر ان سے وابستہ پسند و ناپسند ذاتی ہوتی ہے، اتنی ذاتی کہ اس کا تاریخ کے اصولوں پر مبنی ہونا ضروری نہیں۔ اس لیے آپ بیتی قلم بند کرنے والا حالات و واقعات یا حوادث و سانحات کا تذکرہ ذات سے ماورا ہو کر قلم بند نہیں کر سکتا۔ آپ بیتی کا یہ پہلو اسے رپورتاژ کے قریب لے آتا ہے جیسے نیلم احمد بشیر کا ''سٹنگر ستمبر'' ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بارے میں ہے۔

آپ بیتی میں ذات و صفات کے براہ راست اظہار سے ذرا سا ہٹ کر، بالواسطہ طور پر، سفرنامہ اور (کبھی کبھی) کالم بھی آپ بیتی کا انداز اختیار کر سکتا ہے۔

سفرنامہ اگرچہ اجنبی زمینوں میں پیش آنے والے تجربات و مشاہدات کی روداد سہی لیکن اس کے لکھنے والے کی شخصیت کو کسی طرح بھی منفی نہیں کیا جا سکتا۔ بدیشی زمین میں مشاہدات ''میں'' کی عینک سے ہوتے ہیں۔ مزید برآں شعوری یا غیر شعوری طور پر، سفرنامہ میں اپنے بارے میں یا اہل خانہ اور احباب کا ذکر بھی آ جاتا ہے۔ یوں بعض اوقات حالات زیست کی فراہمی میں سفرنامہ (خام، ناقص، مجمل، یا مسخ ہونے کے باوجود بھی) کچھ مواد فراہم کر سکتا ہے جبکہ سفرنامہ نگار کی خصوصی پسند و ناپسند، ترجیحات اور نفرت و تعصبات سے اس کی شخصیت کے بعض منفی پہلو بھی آشکار ہو سکتے ہیں (اور بعض اوقات ہوتے بھی ہیں)۔

آپ بیتی کے ضمن میں شاید کالم کا تذکرہ بے محل محسوس ہو، سب تو نہیں لیکن بعض کالم نگار، غیر شعوری طور پر کالم کو بھی اپنی شخصیت کی توسیع میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ تبصرہ سیاسی صورت حال پر ہو یا عمرانی مسائل کا تجزیہ، غیر ملکی دورہ ہو یا ادبی تقریبات کی روداد، حاکم نے شرف ملاقات بخشا ہو یا کسی مرحوم کا تعزیت نامہ ہو۔ بیشتر صورتوں میں، کالم ''من'' کا مظہر ہوتا ثابت ہوتا ہے، ہر چند کہ انداز بالواسطہ ہوتا ہے لیکن اسلوب سے ''میں'' کو کیموفلاج کرنے کی کوشش بھی نہیں کی جاتی۔

دوستوں اور دشمنوں کے بارے میں تو لامحالہ طور پر قلم افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ان سب کے بارے میں آپ بیتی کے عام بیانات، معلومات، شواہد اور آرا کو غیر مشروط طور پر تسلیم نہ کرنا چاہیے۔ آپ بیتی لکھنے والے نے آرا کو جتنی ضرب دی اسی نسبت سے تقسیم کر لینی چاہیے۔ شاید ہی کوئی ایسی آپ بیتی ہو جو اس ''ضرب تقسیم'' سے عاری ملے۔

آپ بیتی زندگی کا کوائف نامہ سہی مگر یہ محض توقیت نامہ (Bio-Data) بھی نہیں۔ قاری لکھاری کے بارے میں کچھ جاننا تو چاہتا ہے مگر اسے زندگی کے ہر واقعہ، اس کی غیر اہم تفصیلات اور ان سے وابستہ بے معنی جزئیات سے ایک حد تک ہی دلچسپی ہو سکتی ہے اس لیے وہ آپ بیتیاں جن میں واقعات کی ایڈیٹنگ نہ کی گئی ہو، مطالعے میں غیر دلچسپ، بور اور اکتا دینے والی ثابت ہوتی ہیں۔ دھوبی کو دیے گئے کپڑوں کی تفصیل والی کاپی کی مانند!

ژونگ نے انسانی شخصیت کے ملمع، نقاب، چہرہ (MASK) پردہ پوشی وغیرہ کے لیے "Persona" کی اصطلاح وضع کی تھی۔ ہم غیر شعوری طور پر دنیا والوں کے سامنے خود کو خاص رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ اسے مصور کے سیلف پورٹریٹ سے مشابہہ بھی سمجھا جا سکتا ہے یا شاعرانہ اسلوب میں:

ایک چہرے پر کئی چہرے چڑھا لیتے ہیں لوگ

ایسے چہرے، جن کا چہرہ ساز کو بھی شعور نہیں ہوتا۔ آپ بیتی کی غیر جانبدارانہ تحریر، واقعات کے درست ترین بیان، حالات کے بے لاگ تجزیے اور ان سب سے بڑھ کر خود کو محدب شیشے میں رکھ کر اپنے قارئین کے حضور پیش کرنا آسان نہیں کہ اس عمل میں ''پرسونا'' سب سے زیادہ مزاحم ہوتا ہے۔

پرسونا ایک چہرے، ایک نقاب یا ایک پردے تک محدود نہیں یہ تو چہرے پر چہرہ، نقاب در نقاب، پردے پر پردہ جیسا عالم ہے۔ اسی لیے پرسونا کبھی آئینہ در آئینہ ثابت ہوتا ہے تو کبھی (بالخصوص نائٹ میئرز کی صورت میں) Distorting Mirror بھی بن جاتا ہے۔ یوں کہ بعض اوقات فرد خود کو لاشعور کی بھول بھلیاں میں سرگرداں محسوس کرتا ہے اور یہ سب امور آپ بیتی کی تحریر میں کسی نہ کسی طرح سے اثر انگیزی، دخل اندازی اور رنگ بھرنے کا باعث بھی بن سکتے ہیں بلکہ بنتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ آپ بیتی قلم بند کرنے والے کو اس کا شعور نہ ہو۔ جب اسے اپنے ''پرسونا'' کا خود ہی ادراک نہیں تو وہ دوسروں کو کیسے اس سے وابستہ اعمال و خصائص کی روداد سنا سکتا ہے۔ خواہ وہ شعوری طور پر خود کو مظلوم ہیرو (میرزا ادیب) دبنگ جنسی مرد (جوش ملیح آبادی) یا باپ سے متنفر (انیس ناگی) ہی کیوں نہ ظاہر کر رہا ہو۔

آپ بیتی میں بیان کرنے کے لیے واقعات کے انتخاب میں سلیقے کے فقدان سے آپ بیتی اس بدمزہ سالن میں تبدیل ہو جاتی ہے جس میں پھوہڑ عورت نے نسبت و تناسب کے بغیر تمام مصالحے ڈال کر اپنی دانست میں لذیذ ہنڈیا پکائی ہو۔ زندگی بسر کرنے والے کے لیے تمام واقعات ہی دلچسپ اور پسندیدہ لہٰذا قابل بیان ہوتے ہیں۔ سو اس کے لیے واقعات میں قطع و برید اور انتخاب واقعی مشکل ثابت ہو سکتا ہے، لیکن واقعات کا حسن انتخاب ہی آپ بیتی کے قابل مطالعہ اور نا قابل مطالعہ ہونے کا تعین کرتا ہے، ہر چند کہ یہ انتخاب غیر شعوری عمل ہوتا ہے۔ ان معنی میں کہ کوئی بھی لکھنے والا عمر عزیز کی بیلنس شیٹ مدون کر کے قابل بیان اور نا قابل بیان پر نشانات (✓) لگا کر شعوری طور پر واقعات کا انتخاب نہیں کرتا لیکن اس کے باوجود تحت الشعور میں انتخاب کا احساس ہوتا ہے (یا ہونا چاہیے)۔ یہی نہیں بلکہ اسے اس امر کی پیش بینی بھی کرنی چاہیے کہ میرے قاری کے لیے کون کون سے واقعات دلچسپ ہونے کی وجہ سے زود ہضم یا خوش ذائقہ ثابت ہوں گے۔

اس میں اگر یہ صلاحیت ہو کہ وہ خود سے بلند ہو کر، قاری کی دلچسپی کو Anticipate کر کے قابل بیان اور نا قابل بیان گفتنی اور ناگفتنی میں امتیاز کر سکے تو وہ دلچسپ آپ بیتی تحریر کر سکتا ہے۔ دراصل یہی مشکل کام ہے کہ جن واقعات کو وہ اہم، دلچسپ اور قابل بیان سمجھتا ہے ہو سکتا ہے قاری کے لیے ان میں کسی طرح کی بھی اہمیت اور دلچسپی نہ ہو۔ واقعات کا انتخاب تو۔ منزل یہی کٹھن ہے! اس لیے کہ اس سے یہ سوال منسلک ہے کہ گفتنی، ناگفتنی کا معیار کیا ہو؟ مذہب، اخلاق عامہ، عزیزوں، رشتہ داروں، دوستوں کی خفگی، والدین اور بزرگوں کا احترام، متنازعہ ہو جانے کا اندیشہ، پرسنل ٹیبوز۔۔۔ اور اس نوع کی متعدد وجوہ انتخاب میں رکاوٹ بن سکتی ہیں (اور بنتی رہتی ہیں)۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ بیتی قلم بند کرنے والے کو ان سب ممنوعات کا شعور نہ ہو لیکن اس کے باوجود تحت الشعور میں ان کا احساس موجود ہو۔ سو ہر لکھنے والا اپنے مزاج، تخلیقی شخصیت اور سوچ کے مطابق گفتنی اور

ناگفتنی کا معیار طے کرے گا۔ جو اس لحاظ سے قطعاً ذاتی ہوگا کہ یہ معیار صرف اسی کی آپ بیتی سے مخصوص ہوگا۔

اس نکتے کو اس مفروضے سے سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ اگر غالب نے آپ بیتی قلم بند کی ہوتی تو وہ ''یادگار غالب'' سے کتنی مختلف ہوتی؟

گفتنی و ناگفتنی پر مبنی، واقعات کے انتخاب کے سلسلے میں، لاشعوری محرکات کی ''دخل اندازی'' اور ''مداخلت'' کو ملحوظ رکھنے پر، واقعات کا انتخاب کچھ اور ہی رنگ اختیار کر لے گا۔ بطور کرداری محرک لاشعور فرد پر یوں اثر انداز ہوتا ہے کہ تکلیف دہ واقعات، اذیت دہ یادوں، ناپسندیدہ افراد اور خود کو ملزم قرار دینے والے وقوعات۔۔۔ یہ اور ان سے ملتے جلتے واقعات احاطۂ شعور سے بے دخل کر دیے جاتے ہیں یا ان پر ایسی قلعی کر دی جاتی ہے کہ وہ اصل سے دور اور حقیقت سے بعید ہو جاتے ہیں۔ بچپن کے حالات و واقعات، والدین، بہن بھائیوں اور عزیزوں رشتہ داروں سے (مثبت یا منفی جذباتی تعلق کی بنا پر) عمر کے آخری حصے میں ان کی بازآفرینی میں اور کئی رنگ بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

واقعہ کی وقوع پذیری اور اس کے بیان میں کم از کم نصف صدی تو حائل ہوتی ہے۔ چنانچہ بچپن کی بعض (بالخصوص ناخوشگوار یادیں) اگر یکسر فراموش نہیں کر دی جاتیں تو زمانی فاصلہ مبالغہ کی بنا پر انہیں اصل کے مقابلے میں بڑھا چڑھا کر پیش کرے گا ورنہ یہ مختصر یا مختصر ترین صورت اختیار کر لیں گی۔ اس کا انحصار ان افراد، واقعات، حوادث وغیرہ سے وابستہ خوشی، دکھ، غم، کرب، یاس جیسے احساسات سے مشروط ہوگا۔

لاشعوری محرکات کی کارفرمائی کے اس مختصر تذکرہ سے کسی حد تک اس امر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ بیتی میں حقیقت کا رنگ بھرنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ چونکہ حقیقت بسا اوقات واہمہ کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے۔

ملحوظ رہے کہ آپ بیتی لکھنے والا ایک طرح سے اپنی زندگی پر نگاہ بازگشت ڈال رہا ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ بصورت تحریر وہ گزری ہوئی زندگی دوبارہ ''بسر'' کر رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس عمل سے نفسی آسودگی منہا نہیں کی جا سکتی۔ وہ نفسی آسودگی جس کی اساس نرگسیت پر استوار ہوتی ہے۔ گویا ہم نے جہاں سے آغاز کیا تھا اسی مقام پر واپس آ گئے، دائرہ تمام ہوا۔ ایسا دائرہ جس کا مرکز ذات بنتی ہے تو وجود محور!

بحیثیت مجموعی آپ بیتی اس فلم جیسی صورت اختیار کر لیتی ہے جس کا سکرین پلے لکھنے والا ہی ہدایت کار بھی ہوتا ہے اور وہی کیمرہ مین اور ہیرو بھی! آپ بیتی کی فلم ہٹ ہو جاتی ہے یا فلاپ، تو اس کا انحصار بھی کیمرہ مین، رائٹر، ڈائریکٹر اور ایکٹر پر ہی ہوتا ہے۔ عثمان ہروئی کا ایک خوبصورت شعر ہے:

اگرچہ قطرۂ شبنم نہ پاید بر سر خارے منم آں قطرۂ شبنم بہ نوک خار می رقصم

فرد۔۔۔ تخلیق کار یا غیر تخلیق کار کی تخصیص نہیں۔۔۔ عمر بھر حشر بداماں رہتے ہوئے، قطرۂ شبنم کی مانند، نوک خار پر رقص کناں رہتا ہے، اس امر کے باوجود کہ تخلیق کی صورت میں وہ عام افراد کے ''انبوہِ جانبازاں'' سے ماورا بھی ہو جاتا ہے۔ سو آپ بیتی بھی اسی قطرۂ شبنم کے نوک خار پر رقص کی روداد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ قطرہ جس کے بارے میں یہ کہا گیا:

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرار حیات یہ کبھی شبنم، کبھی آنسو، کبھی گوہر ہوا

اس شعر کے ساتھ عثمان ہروئی کی اسی غزل کا یہ شعر بھی ملا لیں تو آپ بیتی کا مقصد تحریر بھی واضح ہو جاتا ہے:

بیا جاناں تماشا بیں کہ در انبوہِ جانبازاں بصد سامانِ رسوائی سرِ بازار می رقصم!

تین خودنوشت سوانح عمریاں

ڈاکٹر انور محمود خالد

پس دیوار زنداں:

''پس دیوار زنداں'' آغا شورش کاشمیری کی آپ بیتی ہے۔ یہ ایک رومانی انقلابی کی داستان اسیری ہے، جس کا آغاز، مصنف کے پہلے پہل داخلِ زنداں ہونے سے ہوتا ہے اور اختتام، اس کے بھائی کی المناک وفات پر۔ جولائی ۱۹۳۵ء سے دسمبر ۱۹۴۴ء تک، یعنی نو برس کی بساط پر پھیلی ہوئی اس داستان میں کئی ضمنی کہانیاں نکلتی ہیں.....اور یہ ضمنی کہانیاں بھی اپنی اپنی جگہ دلچسپ ہیں۔

آغا شورش کاشمیری کا سلسلۂ تعلیم، غربت و افلاس کی وجہ سے میٹرک ہی سے منقطع ہو گیا تھا چنانچہ مصنف، مختلف سیاسی جلسے جلوسوں میں شرکت سے اپنے کیریئر کا آغاز کرتا ہے۔ سب سے پہلے وہ مسجد شہید گنج کے سلسلے میں ایک احتجاجی جلوس میں تقریر کرنے کے الزام میں اپنے تین نوعمر ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ شورش، اس زمانے میں ایک سیدھا سادا نوجوان ہے، جس میں اپنے ہم عمر لڑکوں کی سی شوخی اور شرارت نہیں۔ اس کے ساتھی طلبہ، اسے کنواری لڑکی کہہ کر چھیڑتے ہیں۔ اس کا استاد، مولوی نیاز محمد، اس کا ہاتھ دیکھ کر پیشین گوئی کرتا ہے کہ مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے گا اور ۳۰، ۳۲ سال کی عمر تک اس کی زندگی قید و بند میں کٹے گی۔

اس دور میں شورش کو اختر شیرانی کی شاعری سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اس کے بے گناہ والد کو پولیس کے تشدد کا نشانہ بننا پڑا اور یہیں سے نوجوان شورش کے دل میں برطانوی ملوکیت کے خلاف جذبہ نفرت پیدا ہوا۔

۱۹۳۰ء میں شورش کی ملاقات لاہور میں ایک ہندو نوجوان، اوم پرکاش سے ہوتی ہے اور وہ دونوں ہم خیال ہونے کی وجہ سے آئندہ کے لیے گہرے دوست بن جاتے ہیں۔ یہ دونوں لڑکے مل کر ''بال بھارت سبھا'' کی بنیاد رکھتے ہیں۔ لاہور کے موری دروازے کے باہر باغ میں کیمپ لگاتے ہیں۔ جس میں اوم، صدر بنتا ہے اور شورش، سیکرٹری اور یوں وہ بچوں کے لیڈر بن جاتے ہیں۔ تاہم پولیس، بال بھارت سبھا کے کیمپ کو اکھاڑنے کے بعد دونوں کو گرفتار کر لیتی ہے۔ جیل میں نوجوان اوم پرکاش پر شدید تشدد ہوتا ہے اور وہ جاں بحق ہو جاتا ہے۔ یہ پہلا داغ تھا جو نوجوان شورش کے دل پر لگا اور اس سانحے سے اس کے دل میں بغاوت کا لاوا پھوٹ پڑا۔

جیل میں پہنچنے کے بعد شورش کی ملاقات دوسرے قیدیوں سے ہوتی ہے۔ ''بال بھارت سبھا'' والی قید تو مختصر ثابت ہوئی لیکن مسجد شہید گنج کے سلسلے میں جو تقریر شورش نے کی، اس کی سزا ایک سال قید ہوئی جو اپیل کیے جانے پر تین ماہ کی رہ گئی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد شورش کاشمیری، مجلس احرار اسلام سے متاثر ہوتا ہے اور اس کا جنرل سیکرٹری بن جاتا ہے۔ اب اس کی خطابت کے جوہر کھلنے لگتے ہیں۔ مسجد شہید گنج کے سلسلے کی قید کاٹنے کے بعد ایک اور باغیانہ تقریر کرنے کے جرم میں وہ ایک سال قید کی سزا پاتا ہے۔ یہ نئی قید، شورش کے لیے تازیانہ عبرت ثابت ہوتی ہے۔ وہ جیل میں ہر طرح کے مجرموں سے ملتا ہے۔ جیل کے عملے کے کردار سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ جیلوں کے اندر، قیدیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا جائزہ لیتا ہے اور بتاتا ہے کہ جیلوں کے نظام کے کسی حد تک درست ہونے کا سہرا ان سکھوں کے سر بندھتا ہے جو مختلف جرائم کی سزا پانے کے بعد جیل حکام کے ناروا سلوک کے خلاف بطور احتجاج بھوک ہڑتال کرتے تھے اور پھر مزید ظلم و ستم کا نشانہ بنتے تھے۔ ان کی بہادری نے اندھے اور بہرے قوانین کا جس طرح رخ موڑا، اس جرأت و استقامت کی کہانی، شورش نے بڑے ولولہ انگیز پیرائے میں رقم کی ہے۔

جیل کے اندر ہی شورش کے اندر کا شاعر جاگا۔ اس کی جمالیاتی حس تیز تھی۔ وہ ہر حسین چیز کو دیکھ کر متاثر ہوتا۔ ان دنوں اس کی مڈبھیڑ اس کانسٹیبل سے ہوئی جو اسے عدالت سے جیل میں لاتا یا جیل سے عدالت میں لے جاتا۔ اس کی عمر ۱۹، ۲۰ سال کے لگ بھگ تھی۔ شورش بڑے شاعرانہ انداز میں اس کا تذکرہ کرنے کے بعد بتاتا ہے کہ ''شاید ہی کوئی دیوان ہو، جو میں نے ان دنوں نہ پڑھا ہو۔ یہی میرے حافظے کا سن آغاز ہے۔ میرا حافظہ اشعار کے اعتبار سے گنج قارون ہو گیا''۔

اس کے بعد شورش اپنی پہلی محبت کا ذکر کرتا ہے۔ یہ خورشید نام کی ایک لڑکی ہے جس سے اس کی ملاقات گجرات جیل سے لاہور جیل منتقل ہوتے وقت ریل گاڑی میں ہوئی۔ شورش کو جیل میں بھی اس لڑکی کے خطوط ملتے رہے اور وہ ان کے جواب بھی دیتا رہا۔ پھر جیل سے رہائی کے بعد، مصنف خورشید کے ساتھ اپنی متعدد ملاقاتوں کا ذکر کرتا ہے چنانچہ ۱۹۳۹ء میں بقول شورش ''یہی ملاقاتیں، رفتہ رفتہ شاعری کا عنوان بن گئیں جس سے حکائتیں نکلیں، کہانیاں اٹھیں، داستانیں بنیں، حتیٰ کہ سیاسی شورش کا مزاج، غزل کا مزاج ہو گیا''۔ تاہم بعد ازاں اس کی سیاسی سرگرمیاں بڑھ گئیں اور اس ناتمام محبت کی خوبصورت یادیں ہی شورش کے دل میں رہ گئیں۔

''پس دیوار زنداں'' بظاہر ایک شخص کی اسیری کی داستان ہے لیکن اس داستان کے صفحات پر کئی معروف اور غیر معروف، سیاسی اور غیر سیاسی، ادبی اور غیر ادبی شخصیتوں سے ہماری ملاقات ہوتی ہے۔ جو شخص بھی اس کہانی میں آیا ہے، وہ اپنے کردار کا کوئی نہ کوئی نقش، قاری کے دل و دماغ پر چھوڑ کر جاتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی بے شمار شخصیات، اپنے مخصوص انداز میں متحرک کرداروں کی طرح ہمارے سامنے آتی ہیں اور نظروں سے گزر کر دوسری ہستیوں کی جگہ خالی چھوڑ جاتی ہیں۔ یہاں ایک چہرہ نہیں، کئی چہرے ہیں۔ ایک داستان نہیں، کئی داستانیں ہیں۔ ہر کتھا کا اپنا رنگ، روپ اور چہرہ ہے۔ چنانچہ ''پس دیوار زنداں'' میں قائداعظم محمد علی جناح، مہاتما گاندھی، سبھاس چندر بوس، مولانا ظفر علی خاں، سیف الدین کچلو، سردار بھگت سنگھ، عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، چودھری افضل حق، کامریڈ احسان الٰہی، ڈاکٹر بھارگو، سید حبیب، عزیز ہندی، یوسف مہر علی، رگھونندن سرن، سردار سکندر حیات، پروفیسر عبدالعزیز، لدھار پورٹر، میاں افتخار الدین، پربودھ اور عبداللہ ملک وغیرہ شخصیات کا کہیں اجمالی اور کہیں تفصیلی ذکر آیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی بیسیوں کانگریسی، مسلم لیگی، احراری، اشتراکی، خاکسار، سیاسی رہنما، زعما، علماء، ادبا، شعرا، نیشنلسٹ، سوشلسٹ، کمیونسٹ، انارکسٹ، دہشت پسند اور جرائم پیشہ اشخاص کا تذکرہ کتاب کی

زینت ہے۔ یوں یہ کتاب نہ صرف ان مشہور افراد کی پکچر گیلری بنتی ہے بلکہ اس میں اس عہد کی ان تمام تحریکوں کی صدائے بازگشت بھی سنائی دیتی ہے، جنہوں نے ہندوستان میں انگریز کی سلطنت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی ''آپ بیتی''

مولانا عبدالماجد دریابادی جو مشہور عالم دین، صاحب طرز ادیب اور انگریزی اور اردو کے مفسر قرآن ہیں۔ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۸ء میں فوت ہوئے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت لکھنے کا آغاز ۱۹۵۴ء میں کیا تھا لیکن ۱۹۵۸ء میں مکمل کرنے کے باوجود، اضافہ، ترمیم اور کاٹ چھانٹ کا عمل جاری رکھا۔ چند برس کے بعد اس پر دوبارہ نظر ثانی کی اور بالآخر ۱۹۵۷ء میں اسے شائع کر دیا۔ یوں ان کی آپ بیتی کا دورانیہ ان کی زندگی کے چوہتر برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ لگ بھگ چار سو صفحات پر مشتمل یہ خودنوشت، ان کی ذاتی زندگی، عہد اور معاصرین کا دلچسپ مرقع ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی آپ بیتی میں اپنے ماحول، اجداد، والدین، بھائی بہنوں، عزیز و اقارب، ولادت، تعلیم و تربیت، سکول اور کالج کی زندگی، ازدواجی تعلقات، اردو اور انگریزی مضمون نگاری، الحاد و ارتداد، اسلام کی طرف واپسی، سیاسی زندگی، بیعت، تصنیف و تالیف، معاشی و مالی زندگی، شاعری، سفر، صحت جسمانی، رہن سہن، لباس و طعام، مخصوص عادات و معمولات، اولاد، مخالفین و معاندین، محبوب و محسن شخصیات، غرض کہ زندگی کے ہر پہلو کا انتہائی دلآویز انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ یوں ان کی خودنوشت سوانح عمری میں گزشتہ لکھنو، اودھ کی تہذیب و ثقافت، ملکی مشاہیر دین و ادب اور ممتاز معاصرین و احباب کی زندہ تصویریں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی عام شہرت ایک محترم عالم دین اور بلند پایہ مفسر قرآن کی ہے اور اس اعتبار سے ان کی آپ بیتی کو محض داستان زہد و اتقا اور فسانہ پند و نصائح ہونا چاہیے تھا۔ جیسا کہ بعض معروف علمائے دین کی خودنوشت کا خاصہ ہے ..... لیکن یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی طویل زندگی کا کوئی گوشہ پردہ خفا میں نہیں رکھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو بالکل ویسا ہی پیش کیا ہے، جیسے کہ وہ حقیقی زندگی میں تھے۔ جہاں انہوں نے اپنی اوائل عمری کی منصفانہ شہرت کا قدرے فخر سے ذکر کیا ہے، وہیں اپنی جوانی کی گمراہیوں اور لغزشوں کا اعتراف کرنے سے بھی نہیں شرمائے۔ بعض خود نوشت نگار، اپنی خامیوں کو چھپاتے ہیں اور حقیقی یا خود ساختہ خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین کے سامنے ان کا مقام و مرتبہ بلند تر نظر آئے ..... لیکن مولانا عبدالماجد دریابادی نے ایسا نہیں کیا۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''اپنی صورت اکثر لوگوں کو اچھی ہی لگتی ہے۔ اس لیے آئینہ بھی خوب دیکھے جاتے ہیں۔ اپنا حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ اپنی صورت، بدترین سمجھتا ہوں، اس لیے آئینہ کبھی نہیں دیکھتا۔ کہیں ریل کے سفر میں یا راستہ، گلی میں گزرتے ہوئے کوئی بڑا آئینہ اتفاقاً سامنے پڑ جائے تو بات دوسری ہے۔ اپنی بے ہنگم داڑھی چہرے پر پھیلی ہوئی اور بھی وحشت افزا ہے، لیکن اپنی صورت کی ناپسندیدگی داڑھی رکھنے کے دور سے قبل کی ہے، اس لیے قدرۃً اپنی تصویر کھچوانا ہمیشہ ناپسند کرتا ہوں۔ شرعی پہلو سے قطع نظر، طبعی طور پر بھی اور جب کبھی پاسپورٹ وغیرہ کی ضرورت سے کھچوانا پڑی تو بڑی ہی کوفت محسوس کی''۔

سوانح عمری بالخصوص خودنوشت سوانح غالباً سب سے دلچسپ صنف ادب ہے۔ ہر آدمی، مشاہیر کی ذاتی زندگی کی

جھلکیاں دیکھنا چاہتا ہے۔ یوں بھی کہا گیا ہے کہ ہر آدمی اپنی زندگی میں کم از کم ایک کتاب ایسی ضرور لکھ سکتا ہے، جو دلچسپ ہو اور وہ ہے اس کی آپ بیتی۔ یہی وجہ ہے کہ حکمرانوں، ادیبوں، شاعروں، مدبروں اور جرنیلوں وغیرہ نے اپنی آپ بیتیاں لکھی ہیں۔ بعض اوقات، دوست احباب، نامور شخصیات سے تقاضا کرتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کے قابل ذکر واقعات، دوسروں کی دلچسپی، رہنمائی یا عبرت کے لیے قلم بند کریں۔ عبدالماجد دریابادی کا شمار بھی ان مشاہیر ادب میں ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنی خودنوشت کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''عزیزوں، دوستوں، مخلصوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کا اصرار ہے کہ ۷۴، ۷۵ سال کی عمر کا ایک پیر نابالغ، اپنی آپ بیتی، دوسروں کو سنائے اور نادانیوں، سفاہتوں کی لمبی سرگزشت، دنیا کے سامنے اپنی زبان سے دہرائے!..... اللہ جانے، انسان کو انسان کی پستیوں، رسوائیوں، فضیحتوں کی داستان سننے میں کیا مزہ آتا ہے؟..... اور یہاں تو خیریت سے سادہ دل بندوں کا ایک جم غفیر اس دھوکے میں پڑا ہوا ہے کہ جلوے کسی عالم، فاضل، اہل اللہ کے ان صفحات پر دیکھنے میں آئیں گے اور موعظے کسی حکیم و عارف باللہ کے سننے میں آئیں گے''۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے نہ تو سینٹ آگسٹائن کی طرح، اپنی آپ بیتی کو محض اپنے روحانی تجربات کی جولاں گاہ بنایا ہے اور نہ روسو کی طرح اپنی سیہ کاریوں کی کہانی لذت لے لے کر سنائی ہے۔ انہوں نے تو اپنی آپ بیتی میں صرف سچ بولنے کا دعویٰ کیا ہے اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے کسی مقام پر بھی دیدہ دانستہ، دروغ گوئی یا کذب سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ ''راست گوئی کا جو حق ہے، اسے زبان قلم سے اپنے حق میں ادا کرنا بجز نبی معصوم کے اور کس کے بس کی بات ہے؟ ہم ایسوں کے لیے تو یہی بہت ہے کہ قلم کا دامن، کذب صریح و افترا مبین سے آلودہ نہ ہونے پائے.....'' اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اپنا یہ وعدہ اپنی آپ بیتی میں پوری دیانت داری سے نبھایا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی یہ آپ بیتی ..... ایک عالم دین کی نہیں، ایک نامور صحافی، ادیب اور دانشور کی داستان حیات ہے جس میں اس نے اپنی زندگی کے ۷۴ برسوں کا حقیقی اور جیتا جاگتا مرقع کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ انہوں نے اپنے قلم سے اپنے بارے میں جو کچھ لکھ دیا ہے، شاید ان کا اچھے سے اچھا سوانح نگار بھی وہ کچھ نہ لکھ سکتا۔

خدوخال:

''خدوخال'' بظاہر مشہور افسانہ نگار، آغا بابر کی خودنوشت سوانح حیات ہے، لیکن دراصل یہ ان کے خاندان، بالخصوص ان کے والد، غلام اکبر خان، دو نامور بھائیوں مورخ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی اور افسانہ نگار اعجاز حسین بٹالوی اور ان کی اہلیہ، سکندرہ خانم کی دلکش کہانی ہے۔ ''خدوخال'' کی تصنیف کے بارے میں اعجاز حسین بٹالوی نے کتاب میں شامل اپنے تعارفی مضمون ''خدوخال'' کے دوباب، (جو لکھے نہ گئے)'' میں بتایا ہے کہ ''عمر کے ایک مقام پر انہوں نے اپنی زندگی کے بارے میں لکھنا شروع کر دیا تھا..... یوں لگتا ہے کہ ایک مقام پر آ کر آغا بابر صاحب نے یہ سوچا کہ ''لوگوں کے گریباں سی ڈالے اور اپنا گریباں بھول گئے''۔ میری اپنی زندگی داستانوں سے لبریز ہے۔ اس میں لکھنے کی اتنی باتیں ہیں، کہنے کی اتنی باتیں ہیں، وہ کیوں نہ کہہ دوں، وہ کیوں نہ لکھوں''۔ تو یوں لگتا ہے کہ اس طرح ''خدوخال'' کا آغاز ہوا۔

اس کتاب کی پہلی قسط رسالہ ''نقوش'' کے ایک خاص نمبر میں شائع ہوئی، جسے پڑھنے والوں نے بہت پسند کیا اور مصنف کو چاروں طرف سے تعریفی پیغامات ملے۔ چنانچہ آغا بابر نے ''خدوخال'' کو باقاعدگی سے لکھنا شروع کیا۔ اس کی اقساط پاکستان اور ہندوستان کے معروف ادبی جرائد میں شائع ہوئیں لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ آغا بابر اپنی زندگی میں یہ خودنوشت سوانح مکمل نہ کر سکے اور بیماری کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اعجاز حسین بٹالوی، بھائی کی بیماریٔ مرگ کا سن کر نیویارک پہنچے اور دوران گفتگو 'خدوخال' کا ذکر آیا تو آغا بابر بولے کہ ''قریب قریب ختم ہے، مگر دو قسطیں لکھنا باقی ہیں''۔ شاید اسی لیے یہ آپ بیتی، یک لخت ختم ہو جاتی ہے اور قاری کو قدرے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

آغا بابر نے ''خدوخال'' کو عام خودنوشت سوانح عمریوں کی طرح نہیں لکھا، بلکہ یہ ایک طرح سے ان کی زندگی کی یادداشتیں ہیں، جنہیں وہ بغیر کسی نظم وضبط کے، بے تکلفی سے، قلم برداشتہ لکھتے چلے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس آپ بیتی میں ہمیں نہ تو مصنف کے تمام تعلیمی مراحل، اساتذہ، ملازمت، نوجوانی اور ادھیڑ عمری کے ضروری احوال سے آگاہی ہوتی ہے اور نہ ان کی تصنیفی زندگی کے محرکات اور نجی زندگی (بیوی بچوں اور دوست احباب وغیرہ) کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ کتاب کی ابتدا انہوں نے اپنی داستان محبت سے کی ہے، جس کی تفصیلات البتہ انہوں نے مزے لے لے کر بیان کی ہیں۔ ڈاکٹر داؤد رہبر نے کتاب میں شامل اپنی ''تقریظ'' میں صحیح لکھا ہے کہ ''خدوخال میں قصے ہی قصے ہیں، جیسے جیسے یاد آتے گئے، لکھے جاتے رہے..... اس کتاب میں داستان کی اٹھان کچھ ایمائی سی ہے۔ ایک دم واضح نہیں ہوتا کہ سامنے والی حویلی میں رہنے والی بچی کون ہے اور اسے چاہنے والا کودک کون ہے؟ پڑھتے جائیں تو بات کھلنے لگتی ہے۔ یہ کودنے والا کودک آغا بابر ہے جو بلوغت سے کہیں پہلے عاشق صادق ہو گیا ہے۔ ایک گڑیا کے اپنانے کو مچل گیا ہے۔ وہ گڑیا جو کئی سال بعد اس کی دلہن بنی۔ اس کا نام سکندرہ خانم تھا''۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آغا بابر نے ''خدوخال'' کا آغاز، اپنی محبوب بیوی سکندرہ خانم کے رنگین ودلکش تذکرے سے کیا ہے لیکن جس وقت وہ یہ ابواب لکھ رہے تھے، ان کی اہلیہ انتقال کر چکی تھیں۔ سکندرہ خانم کو انہوں نے اس طرح یاد کیا ہے جیسے مجنوں، لیلیٰ کو اور فرہاد، شیریں کو یاد کیا کرتا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ آغا بابر نے اپنی بیوی سے وابستہ صرف خوشگوار لمحوں کے ذکر سے ہی اپنی تنہائی کو آباد اور رنگین کیا ہے اور چند ابواب پر محیط سارے بیان پر کہیں ملال، افسردگی اور رنج وغم کے سائے نہیں پڑنے دیئے۔ سرخوشی کی یہی کیفیت آغا بابر کے والد گرامی اور ان کے سارے بھائیوں کے تذکرے پر بھی چھائی ہوئی ہے۔ پوری داستانِ حیات ایک عالم سرشاری میں لکھی گئی ہے اور اس حکایت میں کامرانیاں ہی کامرانیاں ہیں۔ فتوحات ہی فتوحات ہیں۔ انبساط ہی انبساط ہے۔

''خدوخال'' لکھتے وقت آغا بابر نے اپنی ذات کی نمائش نہیں کی۔ اپنے گن نہیں گائے۔ اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بنے ..... بلکہ خود کو پیچھے رکھ کر..... انہوں نے اپنے والد، غلام اکبر خان، اپنے بڑے بھائی ذوالقرنین خان اور خاص طور پر دوسرے بڑے بھائی ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی شخصیت کو ابھارا اور نکھارا ہے۔ ان کے بعد اپنے چھوٹے بھائی اعجاز حسین بٹالوی کا بڑی محبت اور شفقت سے ذکر کیا ہے۔ یوں یہ خودنوشت سوانح، ایک فرد کی کامیابیوں کا روزنامچہ نہیں بلکہ ''فیملی ساگا'' یعنی ایک خاندان کے مشہور افراد کی کہانی بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ شاید اسی لیے ڈاکٹر داؤد رہبر نے ''خدوخال'' میں شامل اپنے طویل مضمون کا عنوان ''تین بٹالوی بھائی'' رکھا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی اصل میں یہ آپ بیتی، انہیں تین نامور بٹالوی

بھائیوں یعنی ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، اعجاز حسین بٹالوی اور آغا بابر کی لذیذ داستانِ حیات بن گئی ہے۔ اگر ان ناموں میں آغا بابر کے والد گرامی غلام اکبر خاں کا نام بھی شامل کر لیا جائے تو داستان کے چاروں کھونٹ مکمل ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر داؤد رہبر کا یہ تاثر درست ہے کہ ''بٹالہ اور لاہور کی جو حکایات اس کتاب میں ہیں، ان میں غلام اکبر خان صاحب کا ذکر خیر بار بار آیا ہے۔ ذکر کے اس تواتر سے یہ قصے ایک لڑی میں پروئے گئے ہیں۔ مولوی محمد حسین آزاد کی تصنیف ''دربار اکبری'' میں اکبر تخت نشین ہے۔ ''خدوخال'' کی داستان میں غلام اکبر خان صاحب صدر نشین۔ اپنی ساری برادری سے تو وہ یگانگی رکھتے ہی تھے لیکن برادری سے باہر بھی ان کے تعلقات کی انواع کا کوئی شمار ہی نہ تھا۔ وہ زود آشنا آدمی تھے۔ پولیس میں اپنی فرض شناسی اور کارکردگی سے انہوں نے خواص اور عوام سب سے عزت کرائی۔ خرد وکلاں کو خوش طبعی، اخلاص اور بے تکلفی سے پرچا کر رکھا''۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آغا بابر نے جس مہارت سے اپنے والد گرامی کی قلمی تصویر کھینچی ہے، اس نے ایک گمنام، غیر ادبی شخصیت کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ یہ قلمی خاکہ، کتاب کا سب سے جاندار حصہ ہے۔

کچھ اس مستی، والہانہ پن اور عالم سرشاری میں انہوں نے اپنے بڑے بھائی عاشق حسین بٹالوی کا خاکہ بھی کھینچا ہے اور اس میں اپنے جادو نگار قلم سے رنگ بھرے ہیں۔ اعجاز حسین بٹالوی اور ذوالقرنین خاں کے خاکے مختصر سہی لیکن وہ بھی جاندار ہیں۔ ان نامور بھائیوں کے تذکرے کے علاوہ ''خدوخال'' میں بے شمار چھوٹے چھوٹے کردار ہیں جنہیں آغا بابر، اپنی جنبش قلم سے زندگی عطا کرتے چلے گئے ہیں۔

کتاب کا سب سے دلکش پہلو، اس کی زبان ہے۔ رنگین، مرصع، چست، متحرک۔ ایک ایک جملہ بنا سنورا اور سجا سجایا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ مصنف بھی آتش کی طرح اس بات کا قائل ہے کہ

بندش الفاظ، جڑنے سے نگوں کے کم نہیں

اور اس نے عملاً ثابت کر دیا ہے کہ شاعری ہی نہیں اچھی نثر نگاری بھی، مرصع سازی کا سا کام ہے۔ آغا بابر نے ایک ایک لفظ، ایک ایک جملے پر محنت کی ہے اور اکثر جگہ آورد کو آمد بنا دیا ہے۔ ''خدوخال'' کو بٹالوی بھائیوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے ایک بنیادی ماخذ کا مقام تو حاصل ہوگا ہی لیکن اس آپ بیتی کو زبان وبیان کی خوبصورتی اور رعنائی کا ایک قابل رشک نمونہ ہونے کی وجہ سے بھی عرصۂ دراز تک یاد رکھا جائے گا۔

مصحفی دلی میں

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی (وفات ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵ء) نے رسالہ ''مجمع الفوائد'' میں اپنا مولد اکبر پور بتایا ہے۔ میر حسن کے مطبوعہ تذکرہ شعرائے اردو میں اسے ''متصل دہلی'' لکھا گیا ہے۔ مگر مولانا امتیاز علی عرشی نے تذکرہ میر حسن کے قلمی نسخے کے حوالے سے، جو رام پور رضا لائبریری میں محفوظ ہے، بتایا ہے کہ تذکرے کی اصل عبارت میں متصل کے بعد لفظ ''دہلی'' نہیں ہے، یعنی اکبر پور امروہہ کے متصل ہے اور یہی صحیح ہے۔ اس نام کا ایک چھوٹا سا گاؤں جو اکبر پور پنی کہلاتا ہے آج بھی امروہے کے شمال میں موجود ہے۔ ممکن ہے یہاں کبھی مصحفی کے آباواجداد کی زمینداری رہی ہو، یا ان کا خاندان یہاں سے نقل مکانی کر کے امروہے میں آیا ہو۔ ان کی قومیت راجپوت کلال بتائی گئی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کی والدہ بی اماں بھی امروہے کے کلال خاندان سے ہی تھیں۔ عہد مغلیہ میں اس خاندان کے ایک پنج ہزاری منصب دار درویش علی خان بھی ہوئے ہیں۔ ممکن ہے مصحفی کی ولادت اکبر پور میں ہوئی ہو، مگر اس خاندان کے اکثر لوگ محلہ کالی پگڑی میں رہتے تھے، کچھ خاندان اب بھی رہتے ہیں۔ مصحفی کی ابتدائی تعلیم وتربیت امروہے ہی میں ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ وہ ۱۱۸۴ھ تک وہیں رہے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۱۔۲۲ سال رہی ہوگی۔ ان کی شاعری کا آغاز بھی امروہے میں ہو چکا تھا۔ یہ اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ اپنے تذکرے میں اس وقت کے بعض معمر شاعروں سے اپنی ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں۔ مثلاً محتشم خان محتشم خاصے عمر رسیدہ تھے، انہیں مصحفی نے امروہے میں دیکھا تھا۔ اسی طرح وہ آفتاب رائے رسوا کا ذکر کرتے ہیں۔ شاہ عبدالرسول نثار اکبرآبادی سے اپنی ملاقات بیان کرتے ہیں جو میر تقی میر کے شاگرد اور قادری سلسلے کے بزرگ ہیں۔ رئیس امروہوی، کمال امروہوی اور جون ایلیا وغیرہ کے جد امجد ابدال محمد بن محمد منور (ساکن محلہ لکڑہ) ان کے مرید تھے۔ اسی لیے نثار ۱۱۶۵ھ اور ۱۱۶۸ھ کے درمیان کسی وقت امروہے میں جا کر رہنے لگے تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا، اور شاہ شرف الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے قریب ابدال محمد کی تعمیر کردہ ایک مسجد کے شمال مشرقی گوشے میں آج بھی ان کی قبر موجود ہے۔ اس پر ابدال محمد نے ایک مقبرہ بھی تعمیر کرا دیا تھا۔ اس مسجد کا وقف نامہ ۲۶ شعبان ۱۱۸۶ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اسی زمانے میں کسی وقت نثار اکبرآبادی کا انتقال ہوا۔ مصحفی ان کی زندگی کے آخری ایام میں ان سے ملتے رہتے تھے۔ کہتے ہیں: ''فقیر اورا در ابتدائے شاعری در قصبہ امروہہ دیدہ بود۔ اکثر بعد ہفتہ وعشرہ ملاقات می شد وتذکرۂ شعر بمیان می آمد''۔ شاہ عبدالرسول نثار کی عمر اس وقت ساٹھ سال سے زیادہ تھی۔ ایسے معمر استاد کی خدمت میں حاضر ہونا اور شعر خوانی کرنا خود اس بات کی علامت ہے کہ مصحفی اور ان کی شاعری دونوں سن شعور کو پہنچ چکے تھے۔ ۱۱۸۴ھ میں وہ امروہے سے نکل کر ممکن ہے پہلے دہلی آئے ہوں، پھر وہاں سے ٹانڈے گئے، جہاں نواب محمد یار خان امیر اپنا دربار سجائے بیٹھے تھے۔ میرا خیال

ہے کہ وہ ۱۱۸۴ھ میں امروہے سے نکلے تو پھر کبھی انہیں وطن واپس آنا نصیب نہیں ہوا۔ وہ خود کہتے ہیں:

آشیاں دور رہا ہم سے، چمن سے نکلے — گھر سے آوارہ ہوئے، شہر و وطن سے نکلے
اے مصحفی نہ دیکھا روے وطن پھر آ کر — شاید کہ چھینکتے تو اے یار گھر سے نکلا
اس ساعت بد نکلے وطن سے کہ پلٹ کر — منہ ہم نے نہ دیکھا کبھی پھر صبح وطن کا
قسمت مری بری تھی، کیا پوچھتے ہو یارو — میں کیا کہوں کہ کیسے گلزار گھر سے نکلا

انہیں اس کا رنج بھی رہا کہ وطن کی سرزمین میں انہیں دفن ہونے کے لیے دوگز زمین بھی نصیب نہ ہوئی۔

غربت میں یوں جو مجھ کو آوارہ کر کے مارا — جاے لحد نہ تھی کیا خاک وطن کی تہ میں؟

مصحفی کی شاعری کے رموز وعلائم میں اور زبان وبیان میں امروہہ پوری طرح جھلک رہا ہے مگر اس کا واضح لفظوں میں تذکرہ صرف دو شعروں میں ملتا ہے۔ حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بیٹے حضرت شیخ صدرالدین محمد یعقوب سفر کرتے ہوئے امروہہ آئے تھے اور یہاں انہیں ٹھگوں نے شہید کر دیا تھا۔ اس لیے بعد کے زمانے میں وہ زندہ شہید، یعنی چلتے پھرتے شہید ہونے والے کہلائے اور جہاں ان کا مزار ہے وہ محلہ جھنڈا شہید کہلانے لگا۔ امروہے میں پہلی خانقاہ شیخ صدرالدین محمد یعقوب ہی کی قائم ہوئی تھی، جس کے نگران حضرت بابا فرید کے نواسے خواجہ محمد امام کے پوتے شیخ نصیرالدین تھے۔ جب غالباً ۷۴۱ھ میں ابن بطوطہ امروہہ آیا ہے تو شیخ نصیرالدین رحمۃ اللہ علیہ ہی نے اس کا استقبال کیا تھا اور دعوت بھی کی تھی۔ بعد کو سفرنامہ لکھتے وقت وہ ان کا نام بھول گیا اور صرف ''شیخ زاویہ'' لکھا۔ زاویہ سے مراد خانقاہ ہے اور شیخ صدرالدین کی مذکورہ خانقاہ کے سوا اس وقت امروہے میں دوسری کوئی خانقاہ نہیں تھی۔ مصحفی کہتے ہیں:

مقام اس کا گر امروہے میں ہو تو کاش یاروں سے — کوئی یہ شیخ سدو کی ہے یاں درگاہ بول اٹھے

۱۱۶۱ھ میں جب محمد شاہ کی وفات کے بعد احمد شاہ تخت نشین ہوا، اور نواب صفدر جنگ وزیر اعظم ہوا، تو اس خانقاہ میں رہنے والوں کو جاگیر دے کر مذہب اثنا عشری میں شامل کر لیا گیا۔ شیخ صدرالدین کو ''شیخ سدو'' بنا کر خانقاہ کے عقب میں واقع کیقبادی مسجد (تعمیر ۶۸۶ھ) میں منتقل کر دیا اور ان کے بارے میں نہایت بیہودہ روایات خود ان لوگوں نے مشہور کر دیں جو شیخ میں ان کے نواسے ہوتے تھے۔ مصحفی نے دیوان اول کے ایک شعر میں بہت بلیغ اشارہ کیا ہے۔ ۱۱۶۸ھ میں کیقبادی مسجد کی مرمت ہوئی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اس میں باقاعدہ نماز ہوا کرتی تھی۔ یہ اس سال کے بعد کسی وقت ''شیخ سدو کا تھان'' بنا دی گئی:

جہاں شیخ جی روز سجدہ کریں تھے — وہاں شیخ سدو کا اک تھان نکلا

مصحفی کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ وہ امروہے کی زبان اور محاورے کے بہترین نمایندے ہیں۔ عوامی اردو کی مثالیں اتنی بہتات کے ساتھ دوسرے کسی شاعر کے کلام میں نہیں ملتیں۔ ان کی زبان اور علامتوں میں طبقۂ متوسط کی قصباتی زندگی اور روزمرہ کی جو تصویر مصحفی کے کلام میں ملتی ہے وہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ یہاں صرف چند الفاظ بطور نمونہ لکھتا ہوں۔ جن کا استعمال دوسرے قدیم شعرا کے کلام میں مشکل سے ملے گا اور یہ سب مستند عوامی بولی کے الفاظ ہیں جسے ''کھڑی بولی'' کہا گیا ہے حالانکہ یہ ''کھری بولی'' (یعنی معیاری زبان) ہے۔

بوڑھے چونڈے پہ کرم کیجیے۔ کھند لیے ایڑیوں سے۔ کھڑاگ۔ تیلیا کپڑے۔ چل بچل۔ گھنتا ہے۔ بذات (بدذات)۔ گراں ڈیل۔ للاہٹ۔ اواہٹ۔ سُوندھا۔ ٹھیاں۔ چپی (مالش)۔ توباہ (توبہ) میدے کی لُوئی۔ ہمسار کے (ہم جیسے)۔ گھر سنا۔ ٹھاٹھر کبوتروں کا۔ لپیٹ سپیٹ (حیلے بہانے) وغیرہ۔ یہ صرف چند سرسری مثالیں مصحفی کے روزمرہ کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔

نواب محمد یار خان کے دربار تک مصحفی کی رسائی ممکن ہے قائم چاند پوری کی وساطت سے ہوئی ہو۔ اس وقت روہیلہ ریاست سخت بحران کا شکار تھی۔ ۱۱۸۵ھ میں مرہٹوں نے شاہ عالم (۱۱۷۳ھ۔۱۲۲۱ھ) کو اکسا کر روہیلوں پر حملہ کیا (۲۳ فروری ۱۷۷۲ء) سکرتال کی اس جنگ میں نواب نجیب الدولہ (وفات ۳۱/اکتوبر ۱۷۷۰ء) کے بیٹے ضابطہ خان (وفات ۱۷۷۵ء) کو شکست ہوئی۔ اسے میدان چھوڑ کر ایسے بھاگنا پڑا کہ اپنے حرم کو بھی ساتھ نہ لے جاسکا۔ اس کی تاریخ مرزا رفیع سودا نے یوں کہی تھی: ''غوث گڑ سے گیا وہ کھو کر شرم'' اس میں ''غوث گڑ'' کے اعداد ۱۷۲۵ میں سے ''شرم'' کے ۵۴۰ نکال دیں تو ۱۱۸۵ھ حاصل ہوتے ہیں۔ سکرتال سے واپسی میں مرہٹوں نے سارے روہیلکھنڈ کو بری طرح سے لوٹا۔ امروہہ اس لوٹ سے بچ گیا تھا کیونکہ مرہٹوں کو نجف خان (وفات ۶/اپریل ۱۷۸۲ء) کی وساطت سے، جو مع اپنی فوج کے تین ہزار روپیہ یومیہ تن خواہ پر مرہٹوں کا ملازم ہو گیا تھا، ساٹھ ہزار روپیہ تاوان جنگ دے دیا گیا۔ ٹانڈے کی یہ بزم آرائیاں چار پانچ مہینے سے زیادہ جاری نہ رہ سکیں۔ بقول مصحفی ''فلک حقہ باز نے سنگ تفرقہ پھینکا اور یہ محفل درہم برہم ہو گئی''۔

پھینکا ہے آسماں نے زبس سنگ تفرقہ اس میکدے میں برسر جام و سبوے عیش
دست سبو شکستہ ہے اور جام اب تلک لایا نہیں زباں پہ کبھی گفتگوے عیش

ٹانڈے میں مصحفی قائم چاند پوری کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ کھانا پینا بھی دونوں کا ساتھ ہی تھا۔ ان کا کسی رئیس کی محفل سے منسلک ہونے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ مصحفی کا عنفوان شباب تھا اس لیے ان دنوں کو وہ ہمیشہ یاد کرتے رہے۔ یہ محفل برہم ہوئی تو قائم چاند پوری نے لکھنو کا رخ کیا اور مصحفی دہلی آ گئے تھے۔ دہلی میں ۱۱۸۶ھ سے ۱۱۹۸ھ تک نواب نجف خاں کا طوطی بول رہا تھا۔ مصحفی نوجوان تھے اور ابھی انہیں کوئی سماجی امتیاز بھی حاصل نہ ہوا تھا، اس وقت کے سیاسی حالات بھی ایسے تھے کہ ایرانی و تورانی گروپ میں خوب کھینچا تانی ہو رہی تھی۔ اس لیے مصحفی کا شاہی دربار سے یا نجف خان کی سرکار سے فیض یاب ہونا ممکن نہ تھا۔ وہ اس زمانے میں خانہ نشین ہو گئے تھے اور کوئی چھوٹی موٹی تجارت شروع کر دی تھی۔ جس کی طرف میر حسن نے بھی اشارہ کیا ہے:

ہے خانہ نشیں مصحفی افلاس کے مارے کیا پوچھو ہو اس بے سروسامان کی اوقات

دہلی میں مصحفی خوش حالی کی زندگی نہیں گزار رہے تھے، بلکہ دہلی کی عام تباہی اور دربار شاہی کے تدریجی زوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے:

وے دن گئے کہ دبدبہ خسروی تھا یاں سونے پڑے ہیں دیکھ تو کیا کیا مکان آج
جن کے جلو میں چلتے تھے لاکھوں نشان، واں دیکھو تو کچھ زمیں پہ ہے ان کا نشان آج؟
کلہ پوشوں نے یوں غارت کیا اس خانۂ دل کو کہ جیسے فوج شہ آکر جہاں آباد لوٹے ہے

کیسی کیسی شان دار عمارتیں اور بڑی بڑی حویلیاں تھیں جو لٹ پٹ کر تباہ و برباد ہو چکی تھیں۔ دیوان عام، دیوان خاص، مقبرہ

ہمایوں اور مقبرہ عبدالرحیم خان خاناں تک کے قیمتی پتھر نوچے جا چکے تھے:

کیا پوچھتے ہو حادثۂ حضرتِ دہلی واں خاک برابر ہوئیں کیا کیا نہ عمارت
دلی کی وہ عمارتیں آتی ہیں جب کہ یاد مرتے ہیں ہم بہ حسرتِ دیدار سنگ و خشت
محلوں کی واں کے کیا میں کہوں خوبصورتی دیکھا نہ اس طرح کا کہیں کار سنگ و خشت
دلی سے پختہ محلوں کے وارث کدھر گئے؟ اب تک ڈھئی پڑی ہیں جو دیوار سنگ و خشت

مگر لکھنو جانے کے بعد اس زمانے کی اجڑی ہوئی دہلی کو بھی بڑی حسرت سے یاد کرتے رہے۔ میرؔ نے بھی کہا تھا:

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنو سے تھا وہیں اے کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

مصحفی کی ولادت سے تقریباً دس گیارہ سال پہلے تو دلی کو ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے ایسا تباہ کر دیا تھا کہ سلطنت مغلیہ کی ریڑھ کی ہڈی ہی توڑ کر رکھ دی تھی۔ حملہ نادری سے دس گیارہ سال بعد مصحفی پیدا ہوئے اور تقریباً ۳۴ سال بعد دہلی میں آئے ہیں، تو اب یہاں وہ اس دلی کے اصلی رنگ و روپ کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے جس کے لیے میرؔ نے کہا تھا:

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
دلی جو ایک شہر تھا رشکِ نعیم آہ ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

پھر موئے پر سو دُرّے احمد شاہ ابدالی نے لگائے۔ اس نے تابڑ توڑ سات حملے کیے۔ اس کی فوجوں نے اجڑی ہوئی دلی کو بھی دونوں ہاتھوں سے خوب لوٹا۔ شاہی قلعہ اور امرا کی حویلیوں میں تو پہلے ہی جھاڑو لگ چکی تھی۔ اب عام باشندوں کے گھر اور املاک ان لٹیروں کی زد میں آتے تھے۔ ابدالی کے ایک حملے میں میر تقی میرؔ کا گھر بھی لوٹا گیا تھا۔ اس کے بعد مرہٹوں کی بن آئی تھی کبھی انہیں ایرانی گروپ اپنی حمایت میں بلاتا تھا، کبھی وہ تورانیوں کے ساتھ ہو جاتے تھے۔ کبھی خود ہی آکر شہر کو لوٹ لیتے تھے۔ مرہٹہ فوج کے جھنڈے پر ایک سانپ بنا ہوتا تھا۔ مصحفی نے کہا ہے:

ہے نشاں موذی گری کا دکھنیوں کے ہاتھ میں تب تو فوج ان کے لیے پھرتی ہے بیرق سانپ کی

مصحفی نے بھی، نہایت معمولی سہی مگر روزمرہ ضرورت کا جو کچھ سامان جوڑ رکھا تھا، ان کے لکھنو جانے سے پہلے ایک بار وہ بھی لوٹ لیا گیا تھا:

دلی میں اپنا تھا جو کچھ اسباب لٹ گیا اس دل کو لے کے آئے ہیں اس سرزمیں سے ہم

اس وقت دلی کے عام شہریوں کا وہ حال تھا جو مرزا غالب نے ۱۸۵۷ء کے حشر اجساد کے بعد دلی والوں کی کیفیت لکھی ہے کہ باعزت پردہ نشین عورتیں کسبیاں اور بھکارنیں بن گئی تھیں۔ مصحفی نے وہی بات اس شعر میں کہی ہے:

جن پردگی زنوں نے دیکھا نہ تھا در اپنا وہ گردش فلک سے روزی کو دربدر ہیں

اس آئے دن کی لوٹ مار کا نتیجہ یہ تھا کہ جس کے لیے بھی ممکن ہوتا تھا وہ شہر سے نکل کر ادھر ادھر پناہ ڈھونڈتا پھرتا تھا۔

میر نے بھی اسی طرح کبھی ڈیگ میں کبھی کاماں اور کبھیر میں اپنا سر چھپایا تھا۔ اس طوائف الملوکی اور سیاسی بحران کا پورا فائدہ نہایت خاموشی اور چالاکی سے انگریز اٹھا رہے تھے۔ شاہ عالم ثانی کا عہد آتے تک وہ سلطنت میں پوری طرح دخیل ہو چکے تھے اور بادشاہ ان کا وظیفہ خوار بن کر رہ گیا تھا۔ مصحفی کو اس کا بھی احساس تھا:

ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی — کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی
دور ہے مصحفی فرنگی کا کام ایسا نہ کر کہ کھاوے کیٹ

مصحفی نے دلی کی اصلی تصویر کہاں دیکھی تھی اس کے کھنڈر دیکھے تھے۔ یہ شہر جو کبھی رشک بغداد و صفاہان و شیراز تھا، جب مصحفی یہاں آئے ہیں تو ایسا ہو گیا تھا کہ:

دلی ہوئی ہے ویراں سونے کھنڈر پڑے ہیں — ویران ہیں محلے، سنسان گھر پڑے ہیں
قریات ہند کا اب، یہ رنگ ہے کہ کوسوں — جاوے کوئی جدھر کو اجڑے نگر پڑے ہیں

کچھ امرا جو مجبوراً دلی میں پڑے رہ گئے تھے ان کا فاقوں سے وہ حال تھا جو میر تقی میر نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے۔ مصحفی بھی کہتے ہیں:

حال یہ سرکاروں کا اب کے امیروں کی ہے — دیگچے بیکار ہیں، سرد پڑے ہیں اجاغ
اے مصحفی مودی کولوں ٹوک تو وہ مجھ سے — کہتا ہے کہ ہاتھی بھی سرکار کے بھوکے ہیں

لکھنو میں اگرچہ کسی قدر خوش حالی اور فارغ البالی کا ماحول تھا مگر مصحفی وہاں بھی دلی ہی کو یاد کرتے رہے۔ انہیں وہاں بھی معاشی فراغ نصیب نہ ہوا۔ عبدالقادر غمگین جب لکھنو میں مصحفی کے گھر جا کر ان سے ملے ہیں تو وہ بچوں کو پڑھا رہے تھے۔ نہایت معمولی گھر تھا جس کا نقشہ خود انہوں نے اپنی ایک مثنوی میں کھینچا ہے۔ لکھنو میں ان کے شاگرد بہت تھے مگر وہ اس لیے تھے کہ مصحفی نہایت زود گو، قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ مفلس اور ضرورت مند بھی تھے۔ ان سے چند معمولی سکوں کے عوض میں اشعار حاصل ہو سکتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے بعض ہندو شاگردوں نے انہیں مالی امداد دی جس کا خود مصحفی نے اعتراف کیا ہے۔ لکھنو میں وہ زمانہ نواب آصف الدولہ کا تھا جس کے لیے اس حد تک مبالغہ کیا گیا ہے کہ ''جسے نہ دے مولا اسے دے آصف الدولہ''۔ مگر مصحفی کو نہ دینے میں مولا اور آصف الدولہ دونوں ہی برابر تھے:

اے مصحفی مت کر ہوس مجلس آصف — معلوم نہیں ہے تجھے دربار کا انداز

''دربار کا انداز'' کیا تھا اس کے لیے ہم عصر تاریخوں کی ورق گردانی کرنی ہوگی۔ آصف الدولہ کی مجلس میں مسخرے، بھکو باز، فحش گو، کھلنڈرے، اوباش زیادہ بار پاتے تھے۔ مصحفی اپنے مزاج کے اعتبار سے سیدھے سادے قصباتی مزاج کے اور کچھ شرم و حیا کے مشرقی انداز رکھنے والے سنجیدہ انسان تھے:

اوروں نے آگے یاں زر وافر کیے حصول — ہم بیٹھے گھر میں کانتے ہیں مفلسی ہنوز

دلی کی ایسی خرابی اور ویرانی کے باوجود وہ لکھنو میں بھی اسی کے برہے گاتے رہے۔ کبھی انہیں چاندنی چوک دلی میں نیل کے

کڑے کی یاد آتی ہے:

ہے نیل کا کڑہ بھی کوئی طرفہ مرقع — نکلے ہے سدا جس سے پری زاد کا عالم

کبھی ان کے خیالات سعد اللہ خاں کی نہر کے ساتھ بہہ نکلتے ہیں:

فراق دہلی میں روتا ہوں میں جب یاد آتا ہے — وہ پھرنا آبجو کا اور وہ عالم ہزارے کا

کبھی وہ صبح ہی صبح جمنا کی سیر کو نکل جاتے تھے، اور وہاں اپنی آنکھوں کے اشنان کراتے تھے:

وہ رعشہ میں کہاں ہے جو میں نے جمنا میں — ادائیں دیکھی ہیں کافر کے تھرتھرانے کی

کبھی دلی کے حسینوں کو یاد کر کے ریشہ خطمی ہوئے جاتے ہیں:

خورشید جھانکتا ہے دلی کی مہ جبیناں — جس دم نقابیں اپنے رخ سے الٹیاں ہیں
نازک نہال جتنے ہیں دلی کے قہر ہیں — یعنی قدم قدم پہ خم و چم بہت ہے یاں

کبھی دلی کے میلے ٹھیلے یاد کرتے ہیں:

قطب صاحب کی اب کے چھڑیوں میں — امنڈ آئی ہے جو کبھی میوات
چھاتیاں دیکھ سادہ وضعوں کی — دلی کے نوجواں ملیں ہیں ہاتھ
یاد دہلی سے تو دل اپنا بھرا آتا ہے — ہائے وہ سیریں وہ طفلان پری زاد کہاں
آیا مشرق کو تو مغرب سے، اب آگے آگے — دیکھوں لے جاوے مجھے طالع ناساز کہاں
پورب میں آئے چھوڑ کے دلی سے شہر کو — اے مصحفی لے آئی ہے قسمت کدھر ہمیں
دلی سے ہم جو نکلے تو آوارہ ہو گئے — صورت نہ دیکھی پھر کے اس اجڑے دیار کی
اے مصحفی مت پوچھ کہ دلی سے نکل کر — کیا کہیے کہ ہم کتنے پشیمان ہوئے ہیں
مصحفی دلی سے نکلے پر گیا سب دل کا چین — تھے جو اوراق اپنی جمعیت کے سب برہم ہوئے
دلی کی قدر دلی سے نکلے پہ ہوئی ہمیں — غربت میں یاد آئے ہے، سچ ہے وطن کا حظ

مصحفی کی شعر گوئی کا آغاز یقیناً امروہے میں ہو چکا تھا۔ ٹانڈے سے نکلنے کے بعد وہ بارہ سال دہلی میں رہے۔ یہاں ان کا پہلا دیوان مرتب ہو چکا تھا مگر وہ چوری ہو گیا:

اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں — دلی میں بھی چوری مرا دیوان گیا تھا

اب جو دیوان اول ہے اس کا کچھ حصہ ممکن ہے دہلی میں تیار ہو چکا ہو مگر اس کی تکمیل لکھنو میں ہوئی۔ ان کی عمر کے ۲۰۔۲۲ برس امروہے میں، ۱۲۔۱۳ برس دلی میں اور ۴۲ سال لکھنو میں بسر ہوئے مگر انہوں نے سب سے زیادہ اشعار دلی ہی کی تعریف میں لکھے ہیں۔

اردو زبان اور ہمارا رویہ

ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ

کیا یہ تعجب خیز امر نہیں کہ اردو کے حروف تہجی کی تعداد طلبہ، عوام اور بالخصوص خواص پر بھی واضح نہیں ہے۔ پرائمری سکول کے طالب علموں سے ہی نہیں بلکہ کالج کے طلبہ سے انگریزی حروف تہجی کی تعداد پوچھی جائے، ایک لمحے میں جواب آ جاتا ہے ۲۶۔ اردو کے حروف تہجی کی تعداد پوچھی جائے تو کبھی ۳۵ بتائی جاتی ہے، کبھی ۳۶۔ بلکہ زیادہ تر اس سوال کے جواب میں یہ سوال پوچھ لیا جاتا ہے 'ء' حرف ہے یا نہیں۔ 'ھ' کو شامل کیا جائے یا نہیں۔ 'ی' اور 'ے' دو مختلف آوازیں 'ای' اور 'اے' کی دیتے ہیں۔ پھر انہیں ایک حرف کیوں شمار کیا جاتا ہے۔ 'ں' الگ حرف ہے یا نہیں۔ ث، س، ص کو ملا کر ایک حرف کیوں نہیں بنا دیا جاتا۔ ا، ء اور ع کو ایک کیوں نہیں کر لیتے۔ ذ، ز، ض، ظ کو ضم کیوں نہ کر دیا جاتا۔ ک اور ق کے جھگڑے کو ختم کر دیں تو پنجابیوں کے گلے میں پڑنے والی خواہشیں تو ختم ہو جائیں گی۔ ت اور ط کے قضیہ کو مٹا دیا جائے۔ تہران کو طہران لکھ دینے سے کیا قیامت آ جائے گی۔ آخر پہلے بھی تو طہران ہی لکھا کرتے تھے۔ 'ی' کی موجودگی میں 'ژ' کی کیا ضرورت ہے۔ ساری عمر ہم اژدہام لکھتے رہے، اب آپ کہتی ہیں اژدہام نہیں ازدحام درست ہے۔ آپ نے اسے اژدہام سے نکال باہر کیا ہے تو حروف تہجی سے بھی باہر کر دیں۔ خواہ مخواہ اردو کو مشکل بنایا ہوا ہے۔ حروف تہجی کم ہوں گے تو غلطیوں کا امکان بھی کم ہوگا۔

اب اگر انہیں کہا جائے کہ چلیں آپ کے کہنے پر جھگڑا مٹائے دیتے ہیں۔ آج سے آپ کا نام قمر نہیں کمر ہے تو یہ صورتِ حال انہیں خود منظور نہیں۔

بہرحال یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ حروف تہجی کے سلسلے میں اتنی صدیاں گزر جانے کے باوجود کوئی حتمی فیصلہ سامنے نہیں آیا اور یہ نکتہ بھی زبان کے حق میں جاتا ہے کہ زبان جامد نہیں متحرک ہے اور اردو زبان سے زیادہ وسیع القلب زبان اور کون سی ہو گی، جس نے بے شمار زبانوں کے الفاظ کو خوش آمدید کہا اور اپنے دامنِ دل میں یوں جگہ دی کہ وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

وہ قاعدہ جو ہم بچپن سے پڑھتے رہے ہیں اس میں ۳۶ حروف تھے۔

اب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ی ے۔

معلوم ہوا کہ ایک بہت اہم آواز کو ہم نظر انداز کیے ہوئے تھے۔ یعنی 'ھ' اس کے متبادل کے طور پر ہمارے پاس 'ہ' موجود تھی۔ لیکن بے شمار مقامات پر 'ہ' کو ھ میں بدلنا ممکن نہ تھا۔ مثلاً بھول۔ پھول۔ تھال۔ ٹھیلا۔ جھولا۔ دھوبی وغیرہ وغیرہ کو بہول۔ پہول۔ تہال۔ ٹہیلا۔ جہولا۔ جہوٹا اور دہوبی وغیرہ لکھ کر دیکھیے تو کیا مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوگی۔ بعض اوقات تو مفہوم ہی تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ بھائی / بہائی۔ بھار / بہار وغیرہ۔ اس قاعدے میں 'ھ' کی پہچان اور تعارف تو موجود تھا لیکن الگ حرف تہجی کی حیثیت سے نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ حرف اتنا ہی اہم تھا تو ابتدا ہی سے اسے الگ حرف تہجی کا درجہ کیوں نہ دیا گیا۔

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''اردو زبان میں کل حروف تہجی پچاس ہوتے ہیں..... بھ۔ پھ۔ تھ۔ جھ۔ چھ۔ دھ۔ ڈھ۔ ڑھ۔ کھ۔ گھ۔ ان کے علاوہ اردو میں رھ۔ لھ۔ مھ۔ نھ کی آوازیں بھی ہیں''۔ (قواعد اردو۔ لاہور اکیڈمی، سرکلر روڈ، ص ۳۸)

مولوی عبدالحق نے ٹھ شمار نہیں کیا۔ جبکہ ٹھ سے بننے والے بے شمار الفاظ ٹھکرا، ٹھیلا، ٹھٹھہ وغیرہ ایک بڑی تعداد میں اردو میں مستعمل ہیں۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ہم اب تک ٹھٹھہ ہی لکھتے رہے ہیں۔ آج کسی بھی لفظ میں اگر دو 'ھ' شامل ہوں تو بعد میں آنے والی 'ھ' کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً بھابھی کو بھابی لکھنا درست قرار پایا ہے۔ لیکن ٹھٹھہ کو ٹھہ لکھتے ہوئے خود ہی بھدا معلوم نہیں ہوتا۔

ھ کے سلسلے میں مولوی عبدالحق رقم طراز ہیں:

''گھر کا صحیح اور کلیاتی تجزیہ 'گھ + ر' اور بھر کا 'بھ + ر' ہے اور ہم ان کے ہجے گ ھ ر، ز ب ر، گھر نہیں گ ھ ز ب ر گھر ہیں''۔ (قواعد اردو، لاہور اکیڈمی، سرکلر روڈ، صفحہ ۵۷)

ڈاکٹر سہیل بخاری حروف تہجی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''رومن رسم الخط میں حروف کی کل تعداد ۲۶، عربی رسم الخط میں ۲۹، سنسکرت کی دیوناگری میں ۴۸ اور اردو کے عربی رسم الخط میں حروف و علامات ملا کر ان کی کل تعداد ۴۵ ہوتی ہے''۔

(رسم الخط کے بنیادی مباحث۔ ڈاکٹر سہیل بخاری، صفحہ ۲۱)

'ء' کے متعلق ڈاکٹر سہیل بخاری کی تحقیق یہ کہتی ہے:

''''ء' کچھ لوگ اسے حرف مانتے ہیں اور غالباً کچھ اس کی چھوٹی سی جسامت (ء) کے باعث اسے حرف ماننے سے ہی انکاری ہیں اور صرف علامت کا درجہ دیتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ کہیں یہ حرف ہوتا ہے اور کہیں علامت بن جاتا ہے، لیکن میرے نزدیک یہ اردو کا ایک اہم حرف ہے اور ایک نہایت ہی اہم آواز کا نمائندہ ہے اور کہیں بھی علامت نہیں بنتا''۔

(حروف و علامات۔ اردو رسم الخط کے بنیادی مباحث، مقتدرہ قومی زبان، صفحہ ۳۱)

عام طور پر اردو میں اکاون حروف تہجی مستعمل ہیں:

اب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ھ ء ی ے۔

یہ وہ حروف تہجی ہیں جو عربی زبان کے علاوہ فارسی، ہندی و مقامی زبانوں سے مل کر ایک سانچے میں ڈھلے ہیں۔ واضح رہے کہ 'ھ' فارسی و عربی حروف تہجی میں موجود نہیں ہے۔

عربی زبان میں ۲۹ حروف تہجی ہیں۔ کچھ ۲۸ بھی کہتے ہیں، کیونکہ وہ 'ء' اور 'ا' کو ایک دوسرے کا قائم مقام قرار دیتے ہیں۔ جبکہ ہمزہ کی اپنی حیثیت مسلم ہے۔ یوں ۲۹ حروف تہجی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اردو نے ۲۹ کے ۲۹ تمام حروف تہجی عربی سے لیے۔ ۴ حروف فارسی سے یعنی پ چ گ اور ژ لیے۔ یوں ۳۳ حروف ہوئے۔ تین حرف مقامی زبان سے مستعار لیے۔ یعنی ٹ ڈ ڑ باقی رہے بھ تھ ٹھ وغیرہ وغیرہ یعنی ۱۵ حروف یہ خالص ہندی سے آئے۔ اور اردو حروف تہجی کی تعداد ۵۱ مقرر ہوئی۔ لیکن ماہرین لسانیات کی تحقیق کچھ اور کہتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ 'ا' اور 'آ' دونوں آوازیں، واضح فرق رکھتی ہیں۔ اس لیے 'ا'

اور "آ" کو مدغم کر کے ایک حرف بنا لینا مناسب نہیں۔ "آ" کی الگ حیثیت ہے۔ اس طرح حروف تہجی کی تعداد ۵۲ ہوتی ہے۔ اس رائے کو یہ بات بھی تقویت دیتی ہے کہ جب ہم ترکی زبان کے حروف تہجی کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں بھی 'آ' اور 'ا' کے لیے الگ الگ حرف موجود ہیں یعنی 'a' آ کی آواز دیتا ہے اور 'e' اے کی اس کے باوجود حروف تہجی کی تعداد کی بحث میں کیا اس رائے کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

''...... ہماری قومی زبان کی ابجد کو جو آج کل زائد حروف سے بڑھایا جا رہا ہے، وہ کس حد تک صوتیات (Phonetics) کی نظر میں جائز ہے۔ اس سلسلے میں ماہرین نے صوتیہ کی اصلاح تو اس لیے وضع کی تھی کہ جس زبان کی کوئی ابجد نہ ہو یا اس کے لیے کوئی نئی اعد تجویز کرنی ہو تو نئے حروف بنانے میں کم سے کم تعداد کو پیش نظر رکھا جا سکے۔ مگر اس کے الٹ ہمارے ہاں ہو یہ رہا ہے کہ ہم اپنی موجودہ ابجد کو بزعم خویش ترقی دے رہے ہیں۔ کوئی زبان بھی اپنی ابجد میں تبدیلیاں کرتا خوش آئند نہیں سمجھتی مگر اردو ہی ایک ایسی ابجد ہمارے ہاتھ آ گئی ہے کہ اس کا حلیہ بگاڑنے میں ہر کوئی آمادہ ہے...... ہماری قومی زبان کی ابجد میں دو قسم کے حروف نئے زائد کر لیے گئے ہیں۔ پہلے ہم ایسے نئے حرف "آ" کو زیر بحث لاتے ہیں۔ عربی زبان کی ابجد کو جب اردو فارسی کے لیے سنوارا گیا تو اس کے زبر یعنی الف کے لیے چونکہ ہمارے ہاں کوئی حرف صحیح کا تلفظ نہیں ہے اس لیے ہم الف کو محض حرکاتی نشان (Vowel Point) لگانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اگر اس الف کے بعد حرکاتی الف استعمال کرنا ہو تو "الف الف" کا استعمال اردو میں نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے بجائے حرکاتی الف کو مخفف کر کے چھوٹی مد کی شکل میں لکھتے ہیں۔ یہ مد یقیناً کسی قسم کی حرکاتی نشانی نہیں ہے، ورنہ اس کو کسی دوسرے حرف پر لکھیں تو وہ حرکاتی الف کا کام نہیں دے گی۔ مثلاً "کٓ" کو ہم "کا" نہیں پڑھ سکتے۔ مزید یہ کہ اگر "آ" کو ایک نیا حرف تصور کر بھی لیں تو (Syllabry) کی طرح کا، با، جا وغیرہ سب نئے حروف بن جائیں گے۔ دوسری قسم ان مرکب حروف کی ہے جو پنانی حروف کے ساتھ دو چشمی ہا زائد کر کے بنے ہیں۔ ان پر ایک اعتراض تو سیدھا سادا ہے کہ یہ اصولاً ہی غلط ہے کہ کسی ابجد میں مرکب حروف شامل کر لیے جائیں''۔

(اردو املا میں اصلاح کی کوشش سردار محمد خان اردو املا، رموز و اوقاف کے مسائل، مرتبہ اعجاز راہی، مقتدرہ قومی زبان صفحہ ۵۲۔ ۶۲)

حروف تہجی سے زیادہ اہم مسئلہ "املا" کا ہے۔ اردو لشکری زبان ہے اور مختلف زبانوں کے الفاظ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور ہر زبان کے اپنے قواعد اور اصول و ضوابط مقرر ہیں۔ اردو املا کے اصول و ضوابط موجود ہیں لیکن ہم اپنی نادانی کے باعث شعوری یا غیر شعوری طور پر، تیزی میں، رواداری میں اپنی مرضی کا 'املا' لکھ جاتے ہیں۔ پڑھنے والے اسی کی تکرار کرتے ہیں اور غلطی عام ہو جاتی ہے۔ یہاں میں صرف ان چند ایک باتوں کی طرف اشارہ کروں گی کہ جن سے ہمارا روز کا واسطہ ہے اور ہر طالب علم کو بار بار بتانا پڑتا ہے کہ درست املا کیا ہے جب بھی کسی طالب علم کی کاپی یا پرچہ جانچا جاتا ہے وہاں آپکا، آپکو، اسکا، انکا، اسوقت، ایکدن، ہونگا۔ الفاظ لکھے نظر آتے ہیں۔ جبکہ 'آپ' الگ لفظ ہے اور 'کا' الگ۔ اس لیے ان تمام الفاظ کو الگ الگ لکھنا چاہیے۔

دوسری غلطی جو بار بار دیکھنے میں آتی ہے لیئے۔ دیئے۔ چاہیئے۔ دیکھیئے۔ کیجیئے۔ کھولیئے لکھا جاتا ہے جبکہ ان تمام الفاظ میں ہمزہ کی آواز موجود نہیں بلکہ ے کی آواز ہے۔ لہٰذا انہیں لیے۔ دیے۔ کیے۔ چاہیے وغیرہ لکھا جانا چاہیے۔ جبکہ آیئے، جایئے، کھایئے، فرمایئے میں ہمزہ کا استعمال درست ہے کہ یہاں (ء) کی آواز موجود ہے۔ مرکب اضافی و مرکب توصیفی کے درمیان آنے والی 'ے' پر ہمزہ کا استعمال زائد ہے۔ شعرائے کرام، گیسوئے تاجدار۔ آشنائے قدیم کو شعراے کرام گیسوے تاجدار اور آشناے قدیم لکھا جائے کہ یہاں ے، ء کی قائم مقام ہے۔

دوسری ایک اہم غلطی جو بار بار دہرائی جاتی ہے وہ یہ کہ 'ھم، ھمیشہ، ھندو وغیرہ' اکثر و بیشتر لکھا دکھائی دے جاتا ہے جبکہ ہم بھی جانتے ہیں کہ ڑ۔ ھ اور ء سے کسی لفظ کا آغاز نہیں ہوتا۔ اس لیے ہم، ہمیشہ، ہندو لکھا جانا چاہیے۔

دوران تحریر میں اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ وہ الفاظ جو ہائے مخلوط کی آواز دیتے ہوں یعنی ہ کی آواز کسی دوسرے حرف سے مل کر مرکب آواز بنتی ہو، وہ تمام الفاظ دو چشمی ھ یعنی ہائے مخلوط سے لکھے جائیں۔ مثلاً انہیں، انہوں، تمہیں، تمہارے، جنہیں، جنہوں کا درست املا مقتدرہ قومی زبان کی رو سے انھیں، جنھیں، تمھیں، جنھوں وغیرہ ہے۔

ز اور ذ میں طلبہ ہی نہیں بسا اوقات ہم اساتذہ بھی فرق نہیں کر پاتے۔ زندگی اور زیادہ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں لیکن چند ایک طلبہ انہیں ہمیشہ ذندگی اور ذیادہ ہی لکھتے ہیں وہ جو شروع سے عادت پڑی ہے درست ہونے ہی میں نہیں آ رہی۔ زے اور ذال استعمال کرتے ہوئے، بڑے بھی کبھی سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ زے استعمال کی جائے یا ذال۔ گذارش ہے کہ گزارش (حتیٰ کہ ماہرین لسانیات بھی اس بارے میں متفق نہیں ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ گذارش درست ہے اور کچھ گزارش کو درست مانتے ہیں)

گزار، جیسے شکر گزار، خدمت گزار، مال گزاری، زرا، آزر، ازدحام، زخار وغیرہ میں زاور گذشتہ، پذیرائی، ذوالحجہ میں 'ذ' استعمال ہوگا۔ واضح رہے کہ گزاردن کے تمام صیغوں میں 'ز' ہے۔ مثلاً گزارش، شکر گزار وغیرہ، جبکہ گذشتن کے تمام صیغوں میں 'ذ' ہے جیسے گذشتہ وغیرہ۔

وہ الفاظ جو اکثر و بیشتر غلط لکھے جاتے ہیں۔ موقعہ، بمعہ، مصرعہ، اسلام وعلیکم، وسلام۔

جبکہ درست املا موقع، مع، مصرع، السلام علیکم، والسلام۔

خط لکھتے ہوئے اختتام پر فقط، خدا حافظ کے الفاظ ضرور استعمال کیے جاتے ہیں۔ جبکہ والسلام کافی ہے۔

طالبات پرنسپل کے نام درخواست تحریر کرتے ہوئے جناب پرنسپل صاحبہ یا جنابہ عالیہ کی ترکیب استعمال کرتی ہیں۔ جناب مذکر، مونث دونوں کے لیے مستعمل ہے اس لیے جناب عالیہ لکھا جاتا چاہیے۔ پھر جناب کے ساتھ صاحب کا لکھنا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ مثلاً جناب پرنسپل صاحب۔ یاد رہے کہ جناب کے ساتھ صاحب کا استعمال درست نہیں۔ درخواست تحریر کرتے ہوئے مشکور ہوں گا رہوں گی کے الفاظ ضرور استعمال کیے جاتے ہیں۔ مشکور، شکر گزار یا متشکر کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے جو غلط ہے۔ دیکھیے نور اللغات مشکور، صفت اس شخص کی ہوگی جس نے احسان کیا ہے نہ اس شخص کی جس پر احسان کیا گیا۔ درخواست کے اختتام پر آپ کی رآپ کا تابعدار، بھی لکھنا ضروری خیال کیا جاتا ہے جبکہ تابعدار کے معنی ہیں تابع رکھنے والا۔ اس لفظ سے گریز کیا جائے۔ درخواست کے آخر میں اپنے نام کے بعد، جماعت دوئم، سوئم یا سال دوئم اور سال سوئم تحریر کیا جاتا ہے۔ دوئم اور سوئم کوئی لفظ نہیں، درست املا دوم اور سوم ہے۔

عربی زبان کے وہ الفاظ جو ہمزہ پر ختم ہوتے ہیں۔ اردو میں ان کے آخر میں ہمزہ حذف کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ الفاظ اب ہمزہ کے بغیر لکھے جائیں گے۔ مثلاً اولیا، ادبا، شعرا، حکما، منشا، فقرا، طلبا وغیرہ۔

اردو کے ساتھ ہم ہر سلوک روا سمجھتے ہیں۔ صرف اس ایک جملے کی بنا پر، جو ہمارے ذہنوں میں روز اول سے ہی موجود ہے۔ اردو بڑی کشادہ زبان ہے، بڑی وسیع النظر ہے، سب کچھ اپنا لیتی ہے لیکن اس بات سے بھی صرف نظر نہیں کیا جانا چاہیے کہ اصول و ضوابط زبان کو محدود نہیں کرتے بلکہ اس کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ قطع و برید نہ ہو تو باغ، جھاڑ جھنکار کا روپ دھار لیتا ہے۔ ہم

روزمرہ زندگی میں اتنی غلط اردو بولتے ہیں اور ہر غلط تلفظ اور غلط استعمال کو غلط العام الفصیح کے پردے میں جائز تصور کر لیتے ہیں۔

خواب، خواہش، تنخواہ، خدانخواستہ، افسانہ خواں، خود، خوش وغیرہ الفاظ میں 'د' لکھی جاتی ہے لیکن پڑھی نہیں جاتی۔ ان الفاظ کا تلفظ خاب، خاہش وغیرہ ہوگا۔

مَشعلِ راہ ہوتا ہے	مِشعلِ راہ نہیں
معافی چاہی جاتی ہے	مانگی نہیں جاتی
رسم ادا کی جاتی ہے	منائی نہیں جاتی
شور مچایا جاتا ہے	ڈالا نہیں جاتا
چغلی کھائی جاتی ہے	کی نہیں جاتی
غزل کہی جاتی ہے	لکھی نہیں جاتی

ایک اور مسئلہ جس سے اردو زبان لکھنے والے دوچار رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ انگریزی کے اپنائے جانے والے وہ الفاظ جو S سے شروع ہوتے ہیں مثلاً سکالر، سکول، سٹیشن وغیرہ، انہیں الف سے لکھا جائے یا سین سے۔ اس سلسلے میں ثاقب رزمی 'اردو زبان میں نراجیت' کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں تحریر کرتے ہیں:

''انگریزی کے حرف S سے شروع ہونے والے الفاظ جنہیں اردو زبان میں اپنا لیا گیا ہے کچھ عرصے سے ایک تنازع کا موضوع بن گئے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ ابتدا ہی سے الف کے ساتھ لکھے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً اسکول، اسٹیشن وغیرہ۔ کچھ لوگ انہیں بغیر الف کے لکھنے لگے ہیں مثلاً سکول، سٹیشن وغیرہ۔ بعض درسی کتابوں میں بھی اس قسم کا املا اختیار کیا گیا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ ان الفاظ کو الف سے شروع کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اردو زبان میں کوئی لفظ کسی ساکن حرف سے شروع نہیں ہوتا۔ اس لیے جب انہیں اپنایا گیا تو اس سے پہلے الف لکھ کر ان کا تلفظ متعین کیا گیا''۔

(اردو زبان میں نواجہت، منتخبات اخبار اردو۔ ثاقب رزمی، مقتدرہ قومی زبان، صفحہ ۲۵۰)

ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی اس امر کی تائید کرتے ہیں:

''انگریزی کے جن الفاظ کی ابتدا درست صحیح آوازوں سے ہوئی تھی۔ اردو نے اپنے عام رجحان کی رعایت سے ان کے شروع میں الف وصل مکسور اضافہ کر کے انہیں ہلکا بنایا ہے۔ جیسے اسکول، اسٹول، اسٹیشن، اسٹو، اسٹینڈ وغیرہ''۔ (شوکت سبزواری، اردو لسانیات، صفحہ ۱۴۰)

سکول کو اسکول لکھا گیا، درست، لیکن اس یلغار کو کون روک سکے گا جو ذرائع ابلاغ کے سب سے بڑے بصری ذریعے سے ہر گھر میں ہر فرد پر حملہ آور ہو رہی ہے۔

اردو زبان کشادہ دلی، کشادہ ذہنی اور کشادہ دامن کے ساتھ دیگر زبانوں کے الفاظ اپنے اندر سمیٹتی جا رہی ہے، لیکن کیا ہمیں اس خطرے کا احساس نہیں کرنا چاہیے کہ مبادا ہماری اپنی شناخت اپنا تشخص ہی فنا ہو جائے۔ یہ احساس آج کی پیداوار نہیں ہے۔ زبان سے متعلق ہمارا غیر سنجیدہ رویہ ہمیں ان مشکلات سے دوچار کر سکتا ہے کہ جس کا احساس ہمارے اکابرین کو اشد تھا۔ دیکھا جائے تو عملی طور پر دو قومی نظریے کے وجود کا ایک بڑا سبب اردو زبان اور اس کا فارسی رسم الخط تھا۔ قائداعظم نے اردو کو

پاکستان کی حقیقی قومی زبان قرار دیتے ہوئے ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو جامعہ ڈھاکہ کے جلسہ تقسیم اسناد میں دوران تقریر کہا تھا:

''پاکستان کی مشترکہ قومی زبان جو مملکت کے مختلف صوبوں کے درمیان افہام و تفہیم کا ذریعہ ہو سکتی ہے اور وہ اردو ہے۔ اردو کے سوا اور کوئی زبان نہیں۔ ملک کی سرکاری زبان ظاہر ہے اردو ہی کو ہونا چاہیے''۔

اور اس بات سے بہت پہلے سر راس مسعود ۴ر اکتوبر ۱۹۲۴ء کو کہہ چکے تھے۔

''اگر انگریز مزید سات سو سال بھی ہمارے حاکم رہیں تب بھی ہمارے ملک کے باشندوں کی زبان انگریزی نہیں بن سکتی''

جس آسانی سے ہم اپنی روایات، اپنی تہذیب، اپنا تشخص اور اپنی زبان سے کنارہ کر رہے ہیں کیا کوئی اور قوم اس عمل میں ہماری ہم پلہ ہو سکتی ہے۔ جاپان، چین، کوریا انگریزی کے بغیر ہی ترقی کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ بھی اس جناتی زبان سے خائف تھے جو حکام کی سطح پر اور نجی سطح پر زیادہ رواج پاتی جا رہی ہے۔ آج فرق صرف اتنا ہو گیا ہے کہ معاشرے میں ہر سطح پر اس کا امتیاز قائم ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس جناتی زبان کے لیے انگلی یا انگلو در کے نام منتخب کیے۔ آج کا نقاد اسے اردش کہتا ہے۔ ہم اردو کے نام پر انگریزی بولتے اور سنتے ہیں۔ ٹی۔ وی پر کسی میزبان کی گفتگو سنیے۔ دس پندرہ جملوں تک اندازہ نہیں ہو پاتا کہ پروگرام اردو زبان میں ہو رہا ہے یا انگریزی میں۔ اس انداز بیان کا اثر ہمارے طلبہ اور عوام کھلے دل سے قبول کر رہے ہیں۔ کامیابی کا زینہ صرف اور صرف انگریزی بولنا ہے (انگریزی زبان جاننا ضروری نہیں)

دلاور فگار نے برسوں پہلے کسی سے تعارف حاصل کرنا چاہا تھا تو یوں جواب ملا تھا:

اک یونیورسٹی میں کسی سوٹ پوش سے	میں نے کہا آپ ہیں کیا کوئی سارجنٹ
کہنے لگے جناب سے مس ٹیک ہو گئی	آئی ایم دی ہیڈ آف دی اردو ڈیپارٹمنٹ

آج کا شاعر بھی ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہے:

کہا بیگم نے شوہر سے ڈنر تیار کر لینا	فرج میں بیف ہے فش ہے چکن ہے اور مٹن بھی ہے
کلب میں آج کافی دیر تک بزی رہوں گی میں	وہاں اردو زباں پر ایک پینل ڈس کشن بھی ہے

(شوکت جمال)

ماہرین لسانیات بے شک کتنے ہی فکرمند کیوں نہ رہیں کہ زبان میں اخذ و قبول کا سلسلہ فطری اصول کے تحت جاری رہنا چاہیے۔ لیکن ہر طرح کے قواعد و ضوابط سے گریز کرتے ہوئے، سرکاری بالادستی، سماجی و سیاسی و تہذیبی مرتبے کے تعین، نجی اور تعلیمی سطح پر جذبہ تفاخر کی تسلی و تشفی کے لیے بدیسی زبان کا استعمال بلکہ شدت استعمال ناگزیر سمجھا جائے تو یہ اس کے فطری حسن، مزاج، تشخص اور پہچان کو داغدار کر دے گا۔ عوامی سطح پر بھی ہم اس بات کے عادی ہو چکے ہیں اور یہ بات تو بہت مشہور ہے کہ آپ رکشا والے سے کہتے ہیں کہ جامعہ کراچی جانا ہے۔ وہ آپ کو جامع کلاتھ لے جائے گا اور جب آپ اسے کہیں گے کہ بھئی مجھے کراچی یونیورسٹی جانا ہے تو وہ کہے گا صاحب یوں کہیے نا، آسان زبان میں۔

آپ سارا دن کمپیوٹر پر کام کرتے ہیں۔ ذرا کہہ کر تو دیکھیے، میرا احصائیہ خراب ہو گیا ہے۔ نہ جانے کون سا جراثیم اس میں آن گھسا ہے تو سبھی یہی کہیں گے 'آسان اردو بولیے نا.....'

اردو کا پہلا اساطیری افسانہ

ڈاکٹر قاضی عابد

اُسطورہ قصے اور کہانی کا اس کائنات میں قدیم ترین روپ ہے۔ عربی زبان کے اس لفظ کا مادہ 'سطر' ہے[۱] اور یہ معانی کی سطح پر اپنے یونانی متبادل Muthos سے حیران کن حد تک مشابہت رکھتا ہے۔ 'اسطورہ' کے معنی ایک ایسی کہانی کے ہیں جس کی سچائی کو عام طریقوں سے ثابت نہ کیا جا سکے جبکہ Muthos اور Logos کے تال میل سے جنم لینے والا لفظ Myth بھی کم وبیش انھی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسے بالعموم ایسی کہانی تصور کیا جاتا ہے جس کی واقعیت اس ثقافت کے لوگوں کے عقیدے، ایمان یا روایت کا اس طرح سے اٹوٹ حصہ ہو کہ اس ثقافت سے متعلق لوگوں کی اکثریت اس کی واقعیت یا سچائی کو زیر بحث نہ لاتی ہو[۲]۔

مختصر لفظوں میں 'اسطورہ' ایک ایسی کہانی ہوتی ہے جس میں دیوی دیوتاؤں یا ان کی نمائندہ یا قائم مقام شخصیات کے اوصاف وفضائل یا کارنامے بیان کیے گئے ہوں یا پھر مذہبی روایات سے متعلق ایسی کہانی جس میں کسی ماورائی یا مافوق الفطرت نوعیت کے مذہبی یا مابعد الطبیعیاتی تجربے کو بیان کیا گیا ہو[۳]۔ لیکن اساطیر فہمی میں اسے کسی معین کلیے کے طور پر نہیں لیا جا سکتا۔ اساطیر شناسوں کی ایک جماعت اساطیر کو کائنات اور فطرت کے رموز کو بیان کرنے والی کہانیاں بھی قرار دیتی ہے[۴]۔ یہ کہانیاں جدید نثری قصوں (داستان، ناول، افسانہ) کے قدیم اجداد میں شمار کی جاتی ہیں، اس لئے ان جدید نثری اصناف پر ان کہانیوں کے اثرات بھی بہت گہرے اور واضح ہیں، اس مضمون میں اردو کے اُس اولین افسانے کی نشاندہی کی جائے گی جس نے قدیم اساطیر سے اپنا رشتہ جوڑ کر اردو افسانے کو ایک نئی راہ دکھائی۔

پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کو اردو افسانے کا بانی قرار دیا جاتا رہا ہے اور اسی حوالے سے دوستووسکی کا وہ جملہ کہ ''ہم سب گوگول کے اوورکوٹ سے نکلے ہیں'' بطرز تعریض بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے لیکن جدید تحقیق نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ راشد الخیری[۵] اردو کے پہلے افسانہ نگار (پہلا افسانہ نصیر اور خدیجہ، مخزن، شمارہ ۳، جلد ۶، دسمبر ۱۹۰۳ء) ہیں[۶]۔ دوسری بات یہ کہ اردو افسانے کے ناقدین نے مغربی تنقید سے مرعوب ہو کر جن مباحث کو اپنا موضوع بنایا اس سے بھی یوں ہی محسوس ہوتا ہے کہ افسانے کی صنف کو ہم نے باقاعدہ کسٹم ڈیوٹی ادا کر کے مغرب سے درآمد کیا ہے[۷]۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس حوالے سے پریم چند پر اعتراض کرنے والے ناقدین بھی پریم چند کے ابتدائی افسانوں کو فراموش کر دیتے ہیں جو مواد، تکنیک اور مزاج تینوں اعتبار سے داستان سے گہرے طور پر جڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، اسی طرح سے راشد الخیری اور سجاد حیدر یلدرم کے افسانے بھی کئی حوالوں سے داستان کے مزاج کے قریب ہیں، مغرب کا اثر تو پریم چند اور ان کے مقلدین نے بہت دیر میں جا کر قبول کیا۔ پریم چند کے ہاں تو مطالعے کی ابتداء بھی داستان سے ہوئی۔ ڈاکٹر انوار احمد کے بقول ''ایک تمباکو فروش کے ہم مکتب بیٹے کے

ساتھ ''طلسم ہوشربا'' کے مطالعہ نے پریم چند کو کہانی بننے کا جو شعور دیا اس کا کھلا اظہار ان کے ابتدائی افسانوں میں ملتا ہے۔''[۸]

خود پریم چند نے ''میرے بہترین افسانے'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ''مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ عوام آج الف لیلے کی کہانیوں سے جس قدر محظوظ ہوتے ہیں اتنا جدید ناولوں سے نہیں ہوتے''[۹]۔ ہمارے ناقدین کی سہل انگاری کے سبب مقبول ہونے والا یہ نظریہ کہ افسانہ ہم نے مغرب سے درآمد کیا یا ہمارا افسانہ بھی ''گوگول'' کے اوورکوٹ سے نکلا، ادھوری صداقت پر مبنی ہے۔ افسانے نے اپنے تخلیقی اور تکنیکی نقوش داستان سے جدا کرتے ہوئے بھی داستان کے کئی اثرات کو اپنے اندر سمیٹا، انھی اثرات اور عناصر میں سے ایک اساطیر کے ساتھ تخلیقی وابستگی بھی ہے۔

اردو افسانے نے ابتداء ہی سے اساطیر کے ساتھ ایک زندہ تخلیقی تعلق استوار کیا، یہ افسانے کی اندرونی ضرورت تھی یا افسانہ نگاروں کی، یہ اس امر پر بحث کا محل نہیں لیکن اردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں نے شعور اور لاشعور ہر دو سطحوں پر اساطیر کو اپنی تخلیق کا حصہ بنانے کی کوشش کی۔

اردو کے اولین افسانہ نگار راشد الخیری کے ہاں ہمیں اسلامی اساطیر کے ساتھ ایک تخلیقی تعلق قائم کرنے کی کوشش ملتی ہے لیکن ان کے ہاں ''مصورِ غم'' ہونے کی خواہش اور کمزور مرثیوں والی رقت اس عنصر کو ابھرنے یا پنپنے نہیں دیتی، ان کے افسانے ''کلوبتیاں'' اور ''خیالستان کی پری'' اپنے تمثیلی انداز اور اسلامی ہیروز کی وجہ سے ''جدید اسطورہ'' بن سکتے تھے لیکن راشد الخیری کی جذباتیت نے ان کرداروں کے اندر وہ ''سورمائی خصائص'' پیدا نہیں ہونے دیئے جو اساطیری کرداروں کو ''اساطیری کردار'' بناتے ہیں۔ اصلاح پسندی کے جذبے نے راشد الخیری کو فن کے حوالے سے خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ اسلامی تاریخ سے اسی شغف کی وجہ سے پریم چند نے بھی راشد الخیری کی افسانہ نگاری پر کئی اعتراضات کیے:

> ''ان کے جتنے سوشل ناول اور افسانے ہیں، وہ بھی جوشِ اصلاح سے لبریز ہیں۔ وہ استقلال سے بھی کام لیتے ہیں، نصیحتوں سے بھی اور اسلام کی تاریخ اور روایات اور شرعی احکام سے بھی، کاش ان کی آواز صورِ اسرافیل کی سی ہنگامہ خیز ہوتی۔ اس انہماک میں بعض اوقات ان کی تصانیف میں فنی خامیاں پیدا ہو گئی ہیں، کبھی کبھی ایسا خیال ہونے لگتا ہے کہ یہ کسی خطیب کی اپیل ہے کوئی ادبی تخلیق نہیں۔''[۱۰]

سید سجاد حیدر یلدرم، وہ پہلے افسانہ نگار ہیں جن کے ہاں افسانے کی بنت میں اساطیر کی شمولیت کا عمل واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے یلدرم کے افسانے ''خارستان وگلستان'' کو اردو کا پہلا جنسی افسانہ قرار دیا ہے۔ یہی افسانہ اردو کا پہلا اساطیری افسانہ بھی ہے[۱۱]۔ اس افسانے کا موضوع مرد اور عورت کے تعلقات کی اساس ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد کا خیال ہے کہ ''اس افسانے میں اگرچہ بُعدِ زمان ومکان کی داستانوی تکنیک اختیار کی گئی ہے، مگر گلستان خارستان اور پھر شیرازہ کے عنوان سے تین حصے قائم کیے گئے ہیں۔ پہلے دو ادھوری دنیاؤں اور تیسرا اکمل اور بھرپور کائنات کا مظہر ہے''[۱۲]۔ اساطیر کا یہ ٹکڑا پہلی ادھوری دنیا میں موجود ہے:

> ''اس نے دیکھا کہ اس کے پاس ایک سفید براق فرس پھر رہا ہے، اسے ہی اس

نے گود میں لے لیا اور اس کے سفید سینے کو اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا
لیا، اس کی گردن کو اپنی گردن سے ملا دیا اور تمام قوت سے اسے بھینچنا شروع کیا
اور اس طرح پرندے کے نرم پروں میں اپنی آنکھوں کو کچھ کھولے، کچھ بند
کیے، بدن کو جھکائے، دیر تک بے حرکت پڑی رہی۔''[۱۳]

شمس الرحمٰن فاروقی اردو تنقید میں وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اس ٹکڑے کی اساطیری جہت کی طرف نشان دہی کی ہے اور اسے یونانی اساطیر کے ایک واقعہ سے جوڑا ہے۔

''یونانی صنمیات کی 'Leda' کی یہ صدائے بازگشت یلدرم کی پہلی نثر میں آ
کر خاصی رکیک معلوم ہونے لگی ہے۔''[۱۴]

مسئلہ یہ ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی کے نزدیک عظیم ترین خیالات کی ترسیل شاعری کے ذریعے ممکن ہے اس لئے انہیں ڈبلیو، بی ییٹس کی نظم "Leda and the Swan"[۱۵] تو اعلیٰ لگتی ہے لیکن موضوع کے سیاق وسباق میں جڑی ہوئی یہ تصویر ''پہلی'' محسوس ہوتی ہے، اس اساطیری حصے سے پہلے سیاق وسباق میں موجود یہ جملے اس حصے کو برمحل بھی بناتے ہیں اور معنویت کو بھی آگے بڑھاتے ہیں۔

''اتنے میں ایک قسم کی چھوٹی پریاں، صدف بحری بنی ہوئی نفیریاں اور دف اور سارنگی اور ستار غرض یہ کہ پورا ساز لیے ہوئے نسرین نوش کے گرداڑنے اور ستار بجانے لگیں۔''

''ماہتاب دھیما دھیما ہو کے غائب ہو گیا مگر نسرین نوش کے جسم نازک کو نو طلوع آفتاب کے سپرد کرتا گیا۔ اس وقت نسرین نوش کا چلنا، اس نہر کے پانی کی مانند ہوتا تھا جو بلور کی زمین پر بہہ رہی ہو۔''

''نسرین نوش اس نشہ شعر کی کیفیت سے لذت یاب معلوم ہوتی تھی اور اس آئین آفتاب پرستی میں دل سے شریک تھی۔''

''کاشانۂ بلور کے نزدیک جو نہر بہتی تھی، اس تک گئی اور نہر کے اندر جا کر لیٹ گئی اور دیر تک اس میں بے حرکت پڑی رہی۔''[۱۶]

شمس الرحمٰن فاروقی کی نظر ایک دور دراز کے تہذیبی منطقے کی اسطورہ (۱۷) کی طرف تو گئی ہے جس میں زیئس راج ہنس کا روپ دھار کر لیڈا سے محبت اور پھر شادی کرتا ہے لیکن اپنے تہذیبی خطے کی اساطیر کی طرف نہیں گئی، تل اور دمینتی کا قصہ جو مہابھارت کے تیسرے حصے ''بن پرب'' میں موجود ہے اس میں راج ہنس تل کا پیام الفت دمینتی کی طرف لے جاتا ہے، میکنزی کے الفاظ ہیں:

"All the fair young women gazed in wonder on the Swans, admiring their graceful forms and their plumage gleaming with gold, and eve long they began to persue them among the trees. Then of a suden the bird which Damayanati followed spoke to her in human language:

"Damayanati Hear! The Noble King Nala dewells in Nishadha.

Comely is he as a god nor can his equal be found in the world. Thou art the pearl of women and he is the pride of men.

If thou wert wed to him, then would perfect beauty and noble birth be united. Blessed in deed would be the union of the peerless with the peerless."[۱۸]

ڈاکٹر آرزو چوہدری[۱۹] اور ابن حنیف نے بھی اپنی کتابوں میں یہ اسطورہ بیان کی ہے، (ابن حنیف کی کتاب ''بھولی بسری کہانیاں'') بھارت میں اس کہانی پر خاصی تحقیق کی گئی ہے انہوں نے مہابھارت کا یہ حصہ اس طرح نقل کیا ہے:

''اے دمینتی! تل نشد ھاؤں کا راجہ ہے، وہ اشون (شہ سوار) کی طرح شکیل ہے اور انسانوں میں اس کا کوئی ہم سر نہیں، وہ مجسم کندرپ کی طرح جمیل ہے، اے خوش رنگ (دمینتی) اے پتلی کمر والی اگر تو اس کی بیوی بن جائے تو تیرے وجود اور تیری سندرتا کا مقصد پورا ہو جائے۔''[۲۰]

لسانیات اور تقابلی اساطیر کے ممتاز ماہر پروفیسر میکس میولر نے بھی ان دونوں خطوں کی اساطیر میں اشتراک کے اس پہلو کی نشان دہی کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہنس سورج کی علامت ہے۔ انہوں نے تقابل کے لیے رگ وید کی ایک اور اسطورہ کا انتخاب کیا ہے جو اس وقت ہمارے موضوع سے تعلق نہیں رکھتی۔ لیکن اس تقابلی مطالعے میں بھی بنیادی اسطورہ زیئس اور لیڈا (Zeus & Leda) کی ہے[۲۱]۔ اساطیر تہذیبی تبادلے کا ایک ذریعہ بھی ہوتی ہیں خود ہمارے ہاں ہنس کی بجائے کبوتر کو محبت کا پیام دینے کی علامت سمجھا جاتا ہے، قیاس کیا جا سکتا ہے کہ زمانی ومکانی بعد میں کبوتر نے ہنس کی جگہ لے لی ہے، اولیاء کے مزار کی نسبت سے کبوتر کی مابعد الطبیعیاتی حیثیت کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے۔

بہر حال کہانی کی طرف مراجعت کریں تو اس اساطیری حصے کی وجہ سے جو معنویت بنتی ہے وہ یہ ہے کہ مرد اور عورت کا وجود ایک دوسرے کے لیے بامعنی ہوتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کی کھوج میں رہتے ہیں اور ایک دوسرے تک اپنا پیغام محبت پہنچانے کے لیے بظاہر ناممکن طریقہ ہائے کار بھی استعمال کرتے ہیں۔ یلدرم کی اس کہانی کے پس منظر میں بائبل کی آدم وحوا کی اساطیر بھی موجود ہیں۔ جن کے مطابق دونوں کو ایک دوسرے سے دور دور اس زمین پر اتارا گیا تھا اور پھر دونوں نے ایک دوسرے کی تلاش میں ایک لمبا سفر کیا۔ یہ اسرائیلی روایات مفسرین قرآن کی سخت تردید کے باوجود عوام الناس میں بے حد مقبول ہیں۔ اس کہانی میں سراندیپ اور ہندوستان کا حوالہ اسی عمومی روایت کا لاشعوری حصہ ہو سکتا ہے[۲۲]۔

حوالہ جات/حواشی

۱ ابن منظور، لسان العرب، بیروت، جلد چہارم، سن ندارد، ص ۳۶۳

۲ K.K.Bole, Encyclopaedia of Religion, Macmillan Publishing Company New York, 1987, Vol.10, P261-67

۳ ارشد مسعود ہاشمی نے اپنے ایک مضمون 'ادب اور اسطور' میں اس امر کی توضیح یوں کی ہے:
''اساطیر انسان کی فکری صورت گری کا وہ نامیاتی عنصر ہیں جس نے اس کے لیے ضابطہ حیات کا تعین کیا ہے۔ اساطیری ادب کے عالمی

اور زندگی بعد موت یعنی تخلیق اور تخلیق در تخلیق (شو کے رقص کی تحریک جس کی تخریب تعمیر حیات ہے یا حضرت عیسیٰ کی طرح جن کا مصلوب کیا جانا اور عرش پر اٹھالیا جانا نوید زندگی ہے یا حضرت محمد ﷺ کے ہفت افلاک کے سفر کی طرح یا یوسف اور یونس کی تجدید حیات کی طرح) کے آرکی ٹائپ کو فطرت کے دائروی نظام کی مانند پیش کرتے ہیں۔" (آئندہ، کراچی، شمارہ ۹، جنوری-مارچ ۱۹۹۸ء، ص ۵۰)

۴ Encyclopaedia of Religion & Ethics, T & T Clark Ltd; Edinburg, 1974, Vol:IX, P.117

۵ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ-تحقیق وتنقید، بیکن بکس، ملتان ۱۹۸۸ء، ص ۴۲

۶ اس افسانے (نصیر اور خدیجہ) کا متن ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے پہلے فون، لاہور میں شائع کرایا بعد میں اس اقرار کے باوجود کہ ڈاکٹر انوار احمد نے تا حال اس افسانے کا متن شائع نہیں کرایا (اردو افسانے کی روایت، ص ۱۵۹) اس سارے تحقیقی کارنامے کو اس کتاب کی فہرست (مزامیر) میں یوں اپنے کھاتے میں ڈال لیا ہے۔ "اردو کا پہلا افسانہ نگار، تحقیق: ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، ص ۱۵۵" حالانکہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی پہلی کتاب "افسانے کا منظر نامہ" (جس پر سال اشاعت درج نہیں ہے) میں اس طرح کی کوئی معلومات بہم نہیں پہنچائیں بلکہ راشد الخیری کا تذکرہ کیا بھی تو یوں:

(i) صفحہ نمبر ۳۱ پر معاشرتی اصلاح نگاروں سلطان حیدر جوش، قاضی عبدالغفار، میرزا ادیب، حکیم یوسف حسن، حامد اللہ افسر وغیرہ کے ساتھ راشد الخیری کا نام بھی ٹانک دیا۔

(ii) اگلے صفحے پر اصلاح معاشرت اور حقوق نسواں کے حوالے سے سات سطور میں بھگتا دیا ہے۔

(iii) ص ۵۱ پر بھی سلطان حیدر جوش کے ساتھ وہ ڈیڑھ سطر کے مستحق بنے ہیں۔

(iv) ص ۵۷ پر آدھی سطر

(v) ص ۸۹ پر آخری بار اس کتاب میں راشد الخیری کا تذکرہ ہے، آدھ سطر میں ایک افسانے "چہار عالم" کے حوالے سے کم وبیش پندرہ دیگر افسانہ نگاروں کے ساتھ۔

اس پہلے اس افسانے کی دریافت کو کس طرح سے ڈاکٹر حامد بیگ کے نام کے ساتھ منسلک کیا جا سکتا ہے۔

۷ اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ داستان کو افسانے کی اساس بتانے پر شد ومد سے زور دینے کے باوجود ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اردو کے پہلے افسانے "نصیر اور خدیجہ" کو ایک غیر معروف انگریز افسانہ نگار لیو لیپے سے متاثرہ تکنیک کا افسانہ قرار دیتے ہیں حالانکہ

(i) راشد الخیری کا انگریزی زبان سے رشتہ بے حد کمزور تھا۔ وہ سکول میں نویں درجے سے آگے نہ بڑھے۔

(ii) لیو لیپے کار کے مذکورہ افسانہ/افسانے اس قدر اہم نہ تھے کہ ان کی طرف اردو دان طبقہ متوجہ ہوتا۔

(iii) ڈاکٹر مرزا حامد بیگ بھی کم از کم اپنی پہلی کتاب "افسانے کا منظر نامہ" کی اشاعت تک لیو لیپے کے وجود سے آشنا نہ تھے۔

وہ پریم چند پر تو اس لیے غصہ کرتے ہیں کہ انہوں نے (پریم چند) اردو افسانے کا رشتہ داستان کی تخلیقی سپلائی لائن سے کاٹ کر مغرب سے جوڑ دیا لیکن خود راشد الخیری پر مسلمانوں کی زبان میں یہ "تہمت" لگا رہے ہیں کہ انہوں نے پہلا افسانہ لیپو لیپے سے مستعار تکنیکی ماڈل میں لکھا۔ وہ ایک طرف تو داستان کو افسانے کی بنیاد قرار دیتے ہیں لیکن دوسری طرف مغربی افسانے کو اردو افسانے کا باوا آدم سمجھتے ہیں۔ اُن کی دونوں کتابوں سے ذیل میں درج کئے گئے اقتباسات ان کے ذہن کے گنجلک پن کو ظاہر کرتے ہیں۔

"ہم سب گوگول کے اور کوٹ سے برآمد ہوئے ہیں"

یہ جملہ دوستوفسکی کا ہے اور اگرچہ اس کا روئے سخن روسی افسانہ نگاروں کی طرف تھا لیکن یہ قول روس اور غیر منقسم ہندوستان دونوں پر صادق آتا ہے۔" (اردو افسانے کی روایت، ص ۲۷)

"ہمارے ہاں مختصر افسانے کی ابتدا نہ تو گوگول کے زیر اثر ہوئی اور نہ ہی ایڈگر ایلن پو کے وضع کردہ فنی اصول وضوابط کے تحت، راشد الخیری کی معرفت اُردو افسانے کیلئے ابتدائی ماڈل لیو لیپے نے فراہم کیا" (اردو افسانے کی روایت، ص ۲۷)

"یہ حقیقت ہے کہ ہمارے افسانے میں داستان کے زیر اثر اپنا سفر آغاز کیا" (اردو افسانے کی روایت، ص ۲۹)

یہ گنجلک پن کبھی کبھی تضاد کی صورت حال بھی پیدا کر دیتا ہے۔

اردو افسانے پر مغربی افسانے کے اثرات کی بحث کو تو می زبان میں شائع ہونے والے ان دو مضامین میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

۱- ڈاکٹر علمدار بخاری، "غلام عباس کے افسانوں میں اخذ وقبول کے چند شواہد" قومی زبان، مئی، ۲۰۰۱

۲- ڈاکٹر مشرف احمد، "غلام عباس کے دفاع میں" قومی زبان، ستمبر ۲۰۰۱

۸ اردو افسانہ-تحقیق وتنقید، ص ۹۸

۹ مضامین پریم چند، مرتبہ عتیق احمد صدیقی، انجمن ترقی اردو، کراچی، بار اول، ۱۹۸۱ء، ص ۶۱

۱۰ ایضاً، ص ۲۷۲

۱۱ یہاں پر اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ آیا "خارستان وگلستان" کو اردو کا طبعزاد افسانہ تسلیم کیا جائے یا ترکی زبان سے ترجمہ یا محض۔ یلدرم نے خود اس افسانے کو احمد حکمت مفتی اوغلو کی اسی نام کی کہانی کا ترجمہ کہا ہے۔ یلدرم کے افسانوں کے اس پہلو پر ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اور ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن ان فاضلین کے دلائل زیادہ تر قیاسات پر مبنی ہیں۔ ۱۹۸۵ء سے ۱۹۸۸ء کے دوران ایک ترک فاضل ڈاکٹر ایرکن ترکمان (جو سلجوق یونیورسٹی، قونیہ میں اردو کے استاد تھے) نے یلدرم کی کہانیوں پر اپنی تحقیقات کے نتائج خدا بخش ریسرچ جرنل، پٹنہ اور ماہ نو لاہور میں شائع کرائے ان کا خیال ہے کہ یہ افسانہ (خارستان وگلستان) خالص ترجمہ نہیں ہے بلکہ یلدرم نے اس میں اپنی ثقافتی بو باس کی شمولیت سے اسے طبعزاد تخلیق کے قریب کر دیا ہے:

"مترجم نے حسب معمول زبان اور اسلوب بیان کو اردو ادب اور ذوق کے مطابق بدل دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ کچھ مناظر اور ماحول میں بھی تبدیلیاں کی ہیں۔"

اصل ترک افسانے سے تقابل کے بعد انہوں نے نتیجہ نکالا ہے کہ:

"یہاں ان تینوں افسانوں {ثالث بالخیر، صحبت ناجنس، خارستان وگلستان} کے مقابلے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میر نیرنگ کا بیان بالکل صحیح ہے۔ وہ کہتے ہیں "ان کے بیان میں کہیں کہیں تو انگریزیت کی جھلک ہے اور کہیں کہیں غالباً ترکی زبان کا چربہ ہے مگر داد کے قابل یہ بات ہے کہ انگریزی اور ترکی یہ تقلید عملی طور پر ایجاد کا حکم رکھتی ہے کیونکہ وہ غیر مانوس اور ناخوش گوار نہیں ہونے پاتی"۔

(ڈاکٹر ایرکن ترکمان، سجاد حیدر یلدرم اور ان کے ترکی تراجم، ماہ نو، لاہور، جون ۱۹۸۸، ص ۳ تا ۷)

اسلئے اس کہانی کو خالص ترجمہ سمجھنے کی بجائے غیر ملکی زبان کے ایک افسانے سے ماخوذ اردو افسانہ ہی قرار دیا جانا چاہیے۔

۱۲ اردو افسانہ-تحقیق وتنقید، ص ۲۵، ۲۶

۱۳ یلدرم، سجاد حیدر، خیالستان، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، تاج بک ڈپو، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۷۱

۱۴ فاروقی، شمس الرحمٰن، افسانے کی حمایت میں، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۹۰

۱۵ ڈبلیو-بی-یٹس کی مذکورہ بالا نظم کا اردو ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے اس ترجمہ کے لئے مضمون نگار اپنے عزیز شاگرد کاشف بلوچ کا شکر گزار ہے:

لیڈا اور راج ہنس

سہمی ہوئی لڑکی پر
اچانک جھکا گتے ہی
پھڑپھڑاتے ہوئے بڑے بڑے پر
ٹھہر جاتے ہیں

وہ اس کے بے بس سینے کو اور گدی کو
اپنی چونچ میں بھر لیتا ہے
لیکن یہ خوفزدہ اندھی انگلیاں اسکی ڈھیلی ہوتی
ہوئی رانوں پر پروں کے ٹکڑوں کو
کیسے ہٹا سکتی ہیں
اور اس جسم کو بھی جو اس سفید ملبہ کے
نیچے دبا پڑا ہے
ماسوائے ویران دل کی دھڑکن کو محسوس کرنے کے جو ابھی تک اپنی
جگہ پر موجود ہے
پسلیوں میں ایک جھرجھری اٹھتی ہے
گری ہوئی دیوار، جلتی ہوئی چھت اور مینار
اور ایگا ممنن مر چکا ہے
اس قدر انہماک
فضا میں پھیلی ہوئی بے رحم لہو کی پکڑ
ایسے میں وہ اسکی طاقت کو یہ سب سمجھا سکے گی؟
اس سے پہلے کہ سرد مہر چونچ اسے گرنے کے لیے چھوڑ دے

۱۶ خیالستان، ص ۶۹-۷۱

۱۷ ٹرائے کی ہیلن زیئس اور لیڈا کی اسی محبت کی یادگار ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

Robert Graves, Greek Myths & Legends, Cassell, London, 1967, P:98-100

۱۸ Mackenzie, Donald, A; India, Senate, London, 1995, P.330

اس سے اگلے صفحے پر اس کتاب میں دمیتی اور راج ہنس کے اس وصال یا راز و نیاز کی خوبصورت تصویر بھی دی گئی ہے۔

۱۹ عالمی داستان، ص ۱۹۶، ۱۹۷

۲۰ ابن حنیف، بھولی بسری کہانیاں، بھارت بیکن بکس، ملتان، ص ۵۷۳

۲۱ Muller, Max, F. Contrubutition to the Science of Mythology, Longman's Green & Co: London, 1897, Vol.II, P.515-517

۲۲ خیالستان، ص ۸۸

ادب کے فروغ میں اردو رسائل کا کردار

ڈاکٹر وزیر آغا

آج سے بہت پہلے کی بات ہے کہ ایک روز میں نے مولانا صلاح الدین احمد مدیر ادبی دنیا سے پوچھا کہ تقسیم عظیم سے پہلے 'ادبی دنیا' کے مستقل خریدار کتنے تھے۔ فرمایا کہ ساڑھے تین ہزار سے اوپر تھے۔ پوچھا کہ یہ کون لوگ تھے۔ مولانا نے کہا کہ دور افتادہ دیہاتی مدرسوں کے ٹیچر، چنگی محرر، دکاندار، گھریلو خواتین، غیر معروف ریلوے اسٹیشنوں کے سٹیشن ماسٹر اور اسی طرح کے لوگ جن کا بظاہر ادب سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن وہ ''ادبی دنیا'' خریدتے تھے۔ مگر پھر زمانہ بدلا اور ادب شہروں پھر بڑے بڑے شہروں تک محدود ہو گیا۔

مولانا اس بات سے رنجیدہ تھے کہ ادب کے فروغ میں اردو رسائل کا کردار رو بہ زوال ہو گیا ہے مگر یہ تو ابھی ابتداء تھی۔ پچھلے چالیس برس کے دوران میں بھی صورت حال کچھ اور بھی بگڑ گئی ہے بلکہ آج ہمیں اس سے بھی ایک بحران کا سامنا ہے۔ اس کی کئی وجوہ کیں۔ آغاز کار میں تو ادبی رسائل کو ڈائجسٹ رسائل نے دھکیل کر کونوں کھدروں تک پہنچایا مگر اس کے بعد پڑھنے کی عادات میں ایک بہت بڑی تبدیلی آئی اور ادب کے مطالعہ کا رجحان ماند پڑ گیا۔ یوں کئی میگزین مقبول ہو گئے اور ادب سے جمالیاتی حظ کی تحصیل کی بجائے سستی تفریح کے حصول کا رویہ عام ہو گیا۔ ڈائجسٹ رسائل کی حد تک تو صورت حال قابو میں تھی کیونکہ یہ رسائل تفریح کے علاوہ معلومات بھی بہم پہنچا رہے تھے اور تراجم کے ذریعے ادب کی کچھ خدمت بھی کر رہے تھے، مگر ان کی اصل خدمت زبان کے حوالے سے تھی۔ ایک زمانہ تھا جب ساڑھے تین ہزار مستقل خریداروں کی موجودگی ایک بہت بڑا کارنامہ متصور ہوتا تھا مگر اب ڈائجسٹ لاکھوں کی تعداد میں چھپ رہے تھے۔ ان ڈائجسٹوں نے ادب کے فروغ میں کم لیکن اردو زبان کے فروغ میں ایک اہم کردار ادا کیا جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

آج اردو رسائل کی صورت یہ ہے کہ وہ ادب کی تخلیق کے سلسلے میں تو خاصے فعال ہیں اور پچھلی نصف صدی کے دوران میں انہوں نے مضامین نو کے انبار لگائے لیکن جو مقدار اور معیار ہر دو اعتبار سے تقسیم عظیم سے پہلے کے اردو رسائل کا بآسانی مقابلہ کر سکتے ہیں بلکہ بعض صورتوں میں تو ادب کا معیار پہلے سے بلند بھی نظر آتا ہے مگر ادب کے فروغ کے معاملے میں آج کے رسائل بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

ادب کو فروغ تو تب ملے گا جب اس کا کوئی پڑھنے والا بھی ہوگا۔ آج کا اردو رسالہ ایک فیملی میگزین بن کر رہ گیا ہے۔ ایک ایسا میگزین جسے ادیب لکھتا، ادیب ہی پڑھتا اور ادیب ہی اس پر نقد و نظر کا مظاہرہ کرتا ہے۔ رسالے کا دائرہ قرأت وسیع ہو تو اس کے بارے میں آرا بھی زندگی کے ایسے متعدد شعبوں سے آئیں گی جن کا براہ راست ادب سے تعلق نہیں ہوتا مگر آج کے

ادبی رسائل میں شاید ہی کوئی ایسا خط شائع ہوتا ہو جو ایک عام قاری کا لکھا ہوا ہو۔ المیہ یہ ہے کہ رسالے کے قارئین میں مکتوب نگاروں کی ایک پوری جماعت بھی وجود میں آ گئی ہے جس نے مکتوب نگاروں کو مقصود بالذات بنالیا ہے۔ قاری سے رسالے کی انقطاع کی یہ ایک عام سی مثال ہے جو اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ آج اردو رسائل ادب کے فروغ میں کوئی اہم خدمت انجام نہیں دے رہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ادبی رسائل ایک ایسے بحران کی زد میں آ گئے ہیں کہ ان کے لیے ایسا کرنا اب ممکن ہی نہیں رہا۔

دیگر مصنوعات کی طرح ادبی رسائل بھی ''رسد اور طلب'' کے قانون کے تابع ہیں۔ اگر طلب زیادہ ہوگی یعنی خریدار قارئین کی تعداد زیادہ ہوگی تو رسائل بھی زیادہ تعداد میں شائع ہوں گے ورنہ وہ شائع تو بہر حال ہوں گے۔ لیکن ادبا کے ایک محدود حلقے سے باہر کی دنیا سے کٹے رہیں گے۔ لہٰذا ادب کے فروغ میں کوئی اہم خدمت انجام نہیں دے سکیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ رسائل کو کس طرح قارئین مہیا کیے جائیں؟ عام حالات میں تو قارئین کی نمو ایک فطری عمل ہوتا ہے لیکن خاص حالات میں جن سے ہمارے رسائل گزر رہے ہیں، کچھ ایسے اقدامات ضروری ہیں جن سے رسالے کے پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ آج سے چند سال پہلے میں اور اظہر جاوید صاحب نے پروگرام بنایا کہ وفاقی سیکرٹری تعلیم سے مل کر یہ تجویز پیش کی جائے کہ کوئی سرکاری یا نیم سرکاری ادارہ مثلاً 'اکادمی ادبیات' بلند پایہ رسائل کی ایک فہرست مرتب کر کے ہر رسالے کی تین صد کاپیاں براہ راست خریدے اور پھر ان رسائل کو ملک کی لائبریریوں تک پہنچائے۔ ڈاکٹر محمد اجمل صاحب نے جو سیکرٹری تعلیم تھے، اس تجویز کو پسند کیا مگر ایک عرصہ دراز تک یہ کاغذوں کے انبار ہی میں دبی رہی اور جب اس نے انبار سے سر نکالا تو اس کا اطلاق محض ایک مقتدر رسالے پر کر دیا گیا اور باقی رسائل منہ تکتے رہ گئے۔ میرا خیال ہے کہ اب بھی اس تجویز کو قبول کر لیا جائے تو رسالے اور قاری کا رشتہ ایک حد تک بحال ہو سکتا ہے۔ یوں رسائل ادب کے فروغ میں اپنا کردار بخوبی ادا کر سکتے ہیں۔

'طلب' کے حوالے سے ایک اور نکتے پر بھی غور کر لینا چاہیے۔ ادب کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے کہ ادب سے جمالیاتی حظ حاصل کرنے کی تربیت دی جائے۔ تفریح حاصل کرنے کے لیے تربیت کا اہتمام کرنا غیر ضروری ہے کیونکہ اس کا تعلق جبلت کی طلب سے ہے جو عام سی بات ہے۔ مگر جمالیاتی حظ ایک ایسا مظہر ہے جو ثقافت کا زائدہ ہے اور ثقافت، تراش خراش، ریاضت اور تربیت سے انسانی سٹاکل کو جمالیاتی حظ کی تحصیل کے قابل بناتی ہے۔ اگر کسی معاشرے سے فنون لطیفہ غائب ہو جائے تو قدرتی طور پر اس سے جمالیاتی حظ کے حصول کا میلان بھی منہا ہو جائے گا اور صرف تفریح حاصل کرنے کا وظیفہ باقی رہ جائے گا۔ جمالیاتی حظ سے قاری کو آشنا کرنے اور پھر ریاضت اور تربیت سے اسے نکھارنے اور سنوارنے کے حوالے سے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کردار کی اہمیت سے سب لوگ آگاہ ہیں۔ آج سے نصف صدی پہلے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں یہ ماحول موجود تھا اور اساتذہ، طلبا میں ادبی ذوق پیدا کرنے کی خاص کوشش کرتے تھے مگر اب وہ بعض دیگر ضروری کاموں کے سلسلے میں مصروف ہو گئے ہیں اور ادب کے گلشن کا کاروبار قریب قریب ختم ہونے کو ہے۔ کالج اور یونیورسٹیاں مستقبل کے قارئین ادب کی نرسیاں ہیں۔ اگر وہ اس حیثیت میں باقی رہیں گی تو ادب کی طلب بھی باقی رہے گی ورنہ طلب کے خاتمے کے ساتھ ادب کی رسد بہم پہنچانے والے رسائل بھی باقی نہیں رہ سکیں گے!

ادبی رسائل۔ ضرورت یا محض روایت؟

ڈاکٹر شبیہ الحسن

یہ امر انتہائی ملال انگیز ہے کہ ہم ایک ایسے بنجر اور غیر تخلیقی معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں شعر و ادب کی پذیرائی کرنے والے ناپید ہو گئے ہیں۔ ادیب، ادب اور قاری کی مثلث ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔ لہٰذا معاشرے پر غیر تخلیقی گروہ قابض ہو چکے ہیں۔ اس صورت حال میں علمی و ادبی مباحثہ کرانا ایک جہاد سے کم نہیں اور خاص طور پر ''ادب کے فروغ میں اردو رسائل کا کردار'' جیسے موضوع کو منتخب کرنا کسی ''ادبی دیوانے'' کا کام ہی ہو سکتا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ جس معاشرے میں ادبی گفتگو جگ ہنسائی کا موجب ہو وہاں ادبی رسالہ نکالنا ''جہاد اکبر'' سے کم نہیں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم سب لوگ سنجیدگی سے اس سوال کا کھوج لگائیں کہ:

''کیا عصر حاضر میں کسی ادبی رسالے کی ضرورت ہے''؟؟؟

اس حوالے سے کئی نقاط ہمارے سامنے آ جائیں گے۔ بعض دانشوروں کا کہنا ہے کہ ادبی رسائل ہر مہذب معاشرے کی ضرورت ہوتے ہیں لہٰذا معاشرے کی ترقی اور فروغ کے لیے ادبی رسائل کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ میرے خیال میں اس وقت ہمیں ان دانش مندوں کے خیالات کو زیادہ اہمیت دینا چاہیے جو ادب کے فروغ اور معاشرتی ترقی کے لیے اردو رسائل کے کردار کو اہمیت دینے کے لیے کسی بھی صورت میں آمادہ نہیں ہیں۔ ان ''بالیدہ فکر'' حضرات کا موقف یہ ہے کہ عصر حاضر کے رسائل کم حیثیت اور بے وقعت ہو گئے ہیں لہٰذا ان سے کسی اچھائی کی توقع کرنا کم فہمی بلکہ حماقت ہے۔ اردو رسائل کی اہمیت و افادیت کے منکر ان دانشوروں کے خیالات نکات کی شکل میں آپ کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ان نکات کو نہ صرف یہ کہ گوش ہوش سے سماعت فرمائیں گے بلکہ اس پروقار سیمینار میں اپنے طور پر ان اعتراضات کے تسلی و تشفی بخش جوابات بھی تلاش فرمائیں گے۔

(۱) موجودہ زمانہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے لہٰذا معاشرے کو سائنسی علوم کی زیادہ ضرورت ہے، ادبی مباحث کی نہیں۔ اس صورت حال میں ادبی رسائل بے مصرف ہو جاتے ہیں۔ اب تو ان ادبی رسالوں کو اپنی حیثیت ختم کر کے سائنسی کلام کا آرگن بن جانا چاہیے۔

(۲) ہمارا معاشرہ ذہنی و فکری اعتبار سے انتہائی بنجر اور غیر زرخیز ہے۔ لہٰذا یہاں ادب کی تخم ریزی کار بے کاراں ہے۔ اس غیر ادبی ماحول میں کسی ادبی رسالے کا نکالنا غیر دانشمندانہ عمل ہے۔

(۳) موجودہ زمانہ انتہائی متحرک ہے۔ لہٰذا یہاں جامد یا غیر متحرک چیز کی نہ تو اہمیت ہے اور نہ اس کی ضرورت۔ ہمارے ادبی

رسائل فضول اور لایعنی مباحث چھیڑتے ہیں جن کا عملی زندگی میں نہ تو کوئی فائدہ ہوتا ہے اور نہ اثر۔ اس صورت حال میں یہ ادبی رسائل معاشرے پر ایک بوجھ ہیں۔

(۴) عصر حاضر کے بیشتر رسائل ذاتی مفادات اور ذاتی تشہیر کی خاطر نکالے جاتے ہیں۔ ان رسائل میں خودستائشی اور دوست نوازی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ ان رسائل کے اہم اور غیر اہم تمام شمارے ذاتی توصیف اور ستایش سے بھرے ہوتے ہیں، گویا یہ رسالے ذات کے لیے ہوتے ہیں ادب کے فروغ کے لیے نہیں۔

(۵) موجودہ دور کے رسالوں کا معیار یہ ہے کہ ان میں شامل مقالات سطحی، تخلیقات غیر معیاری اور شاعری وزن و بحور سے خارج ہوتی ہے۔ یہ رسائل ادب کے فروغ کی بجائے اس کے زوال کے حقیقی ذمہ دار ہیں۔

(۶) ان خودساختہ ادبی رسائل کے ذریعہ دشنام طرازی کو بھی فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنا ہر مدیر کا فرض منصبی قرار پاتا ہے۔ اس طرز عمل میں چھوٹے بڑے اور اچھے برے سب برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ ہر تخلیق کار جلب منفعت کے لیے دوسرے کی ذات پر کیچڑ اچھالنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ادبی رسائل غیر ادبی ماحول، مذاق اور فضا قائم کرنے کے حقیقی ذمہ دار ہیں۔

(۷) عصر حاضر کے ادبی رسائل کسی بڑے طرز احساس کو اجاگر کرنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ اس ربع صدی میں کوئی ایسا ادبی رسالہ نہیں ہے، جس کے ذریعہ کوئی بڑی ادبی تحریک شروع ہوئی ہو۔

(۸) بیشتر ادبی رسالے تجارتی مقاصد کے لیے نکالے جاتے ہیں۔ کوئی ادارہ اپنا ٹیکس بچانے کے لیے ادبی رسالے کو اپنا ذریعہ بناتا ہے اور کوئی کاغذ کا پرمٹ فروخت کرتا ہے۔ بعض مدیران عمومی و خصوصی کا رزق ہی ان ادبی رسائل سے وابستہ ہے۔ اس صورت حال میں ادب کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے جو کسی بھی صورت میں مناسب نہیں ہے۔

(۹) ایک زمانہ تھا کہ ادب اور ادیب کا رشتہ بہت توانا اور قوی ہوتا تھا۔ ادیب ادب کے فروغ کے لیے اپنے تمام ممکنہ ذرائع بروئے کار لاتا تھا اور اسی طرح ادب ادیب کو ہمدوش ثریا کر دیتا تھا۔ عصر حاضر کا المیہ یہ ہے کہ ادیب ادب کو اپنے ذاتی مقاصد و فوائد کے لیے استعمال کرتا ہے اور ادبی رسائل کو ذریعہ بناتا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ادیب کو عروج حاصل ہوتا جا رہا ہے اور ادب زوال پذیر ہے۔

(۱۰) ہر ادبی رسالے کا ایک حلقۂ اثر ہے۔ ہر رسالے کا مدیر اپنے ذوق اور مشرب کے مطابق تخلیق کاروں کی تخلیقات شائع کرتا ہے۔ اس طرز عمل سے خیالات میں یکسانیت کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو ایک ہی شمارے میں ایک جیسے افکار کی اتنی کثرت ہو جاتی ہے کہ ادبی رسالہ کسی تبلیغی جماعت کا ''منشور نامہ'' محسوس ہونے لگتا ہے۔ ادبی رسائل کے مدیران کی اس سے بڑھ کر اور کیا بددیانتی ہوگی کہ بہتر تخلیق کو چھوڑ کر گھٹیا تخلیق کو محض اس لیے طبع کر دیا جائے کہ یہ کسی دوست، رفیق یا ہم نوا کی ہے۔

(۱۱) عصر حاضر میں بعض ادبی رسائل میں مخرب اخلاق اور حیا سوز مواد شائع ہو رہا ہے۔ یہ مواد محض ادب کی تباہی کا موجب ہی نہیں بلکہ نوجوان نسل کو بھی تباہ برباد کر رہا ہے۔ جنسی مسائل اور نوجوانوں کی بے راہ روی کو یوں نثری و شعری تخلیقات میں کھلے عام پیش کر کے ادبی رسائل خدا جانے کون سی علمی و ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

(۱۲) عصر حاضر کے ادبی رسائل کا اسلوب بیان متعین نہیں ہے۔ ادبی زبان اور عام بول چال میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن

ہمارے ادبی رسائل اس اہم خبر سے ہنوز بے خبر ہیں۔ یہ امر انتہائی ملال انگیز ہے کہ ادبی رسائل کی زبان عامیانہ سطح سے بھی کم تر ہے۔ لکھنے والے زبان کی نزاکتوں سے بے خبر ہیں۔ املا، امالہ اور انشا کے اصولوں سے مدیران جرائد خود بے خبر ہوتے ہیں وہ کسی تخلیق کار کو ان کی کوتاہیوں سے کیا باخبر کریں گے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے معاشرے میں کسی رسالے کا کوئی اسلوب متعین نہیں ہے۔ ہر شمارے کا اسلوب بیان دوسرے سے مختلف بلکہ بعض اوقات تو متضاد ہو جاتا ہے۔ اسلوب کی یہی بے سمتی کسی بھی ادبی رسالے کو معتبر نہیں بننے دیتی۔

(۱۳) عصر حاضر کے رسائل معاشرے میں کسی بھی قسم کا مثبت کام کرنے کے اہل ہی نہیں ہیں۔ کیا یہ رسائل عصر حاضر کے نوجوانوں میں کسی قسم کا شعور اجاگر کر رہے ہیں.....؟؟؟ کیا یہ اپنے قارئین کی سمت نمائی کر رہے ہیں.....؟؟؟ کیا یہ اپنے پڑھنے والوں کے لیے کوئی لائحہ عمل مرتب کر رہے ہیں.....؟؟؟ ظاہر ہے کہ ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہوگا۔ تو پھر آپ خود فیصلہ کیجئے کہ ادبی رسائل کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔

آپ نے جس توجہ اور انہماک کے ساتھ اردو رسائل کے پرتشدد مخالفین کی آرا سماعت فرمائیں وہ قابل قدر ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان آرا کا بغور مطالعہ فرمائیں اور ان کا پرمغز اور مدلل جواب دیں۔

ایک بات بہرحال طے ہے کہ جب تک اردو زبان و ادب موجود ہے۔ ''ادب کے فروغ میں اردو رسائل کا کردار'' جاری و ساری رہے گا۔

ہوسکتا ہے کہ آپ میں سے کچھ ناقدین محققین اور حاضرین نے ان مہمل، لغو، ناقص اور کمزور اعتراضات کو اہمیت نہ دی ہو لیکن میرا موقف اب بھی یہی ہے کہ ان پیش کردہ اعتراضات کا جائزہ لیجئے اور اس سوال کا کھوج لگائیے کہ:

''کیا عصر حاضر میں کسی ادبی رسالے کی ضرورت ہے''

؟؟؟

اردو ادبی رسائل کا جائزہ

(۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۰ء تک)

ڈاکٹر عفیرہ حامد

سر سید احمد خاں نے صحافت کو علمی انداز فکر کا مظہر بنایا لیکن بیسویں صدی کے آغاز سے صحافت ایک بار پھر نیا روپ لے کر ابھری اور اس پر علم و ادب کی چھاپ گہری ہوگئی۔ ''مخزن'' اور ہم عصر رسائل نے اردو نثر کی کایا پلٹ دی۔ اس نے اسلوب میں شگفتگی اور رومانیت کو رواج دیا۔ اس دور کی مجلاتی صحافت آراستہ و پیراستہ اپنی ڈگر پر چل رہی تھی کہ جنگ عظیم اول کے بعد اس کی ہیئت میں ایک بار پھر تبدیلی رونما ہوئی اور مجلاتی صحافت، علمی و ادبی صحافت بن گئی اور رسائل نے علم و ادب کے فروغ کے لیے اپنا راستہ الگ ہموار کیا۔

اس دور کے رسائل نے رومانیت اور شگفتہ نثر سے ہٹ کر عملی تنقید اور تحقیق کو اپنی راہ بنایا اور اردو زبان کو ترقی یافتہ زبانوں کے برابر لا کھڑا کیا۔ ان میں اردو، نگار، ادبی دنیا، ہمایوں، نیرنگ خیال اور اورینٹل کالج میگزین کے نام سرفہرست ہیں جنہوں نے اردو ادب کی کایا پلٹ دی اور ادب میں نئے اضافے کیے۔

یہ سیاسی اضطراب کا دور تھا۔ سیاسی تحریکوں کا اثر اردو ادب پر بھی پڑ رہا تھا۔ جدید مغربی خیالات تیزی سے اردو میں منتقل ہو رہے تھے اور اردو ادب ترقی کے اس دوراہے پر تھا جہاں اس کی منزل بہت قریب تھی کہ ادب میں ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا اور ادب کے دھارے موڑ دیئے گئے۔ اس میں آزادی، غلامی، سرمایہ داری، جاگیرداری، اشتراکیت، مادیت، ملوکیت اور اقتصادی مساوات کے نظریات کو متعارف کرایا گیا۔ نظم و نثر میں مزدور، کسان، افلاس، بیکاری، بھوک، بے روزگاری اور طبقاتی کشمکش جیسے موضوعات رواج پانے لگے تو اردو رسائل بھی اسی راہ پر چل نکلے۔ چند رسائل نے صرف ترقی پسند ادب کو فروغ دیا اور نئے نئے موضوعات کو جگہ دی ان میں ساقی، نیا ادب، ادب لطیف، ادبی دنیا، نیرنگ خیال، عالمگیر، جدید اردو، ادیب (دہلی) اور سویرا کے نام قابل ذکر ہیں، جنہوں نے ترقی پسند ادب کو فروغ دیا۔

۱۹۳۶ء کے بعد ادب و صحافت کے راستے جدا ہو گئے اور جرائد صرف ادب کے عکاس بن گئے۔ اس دور میں ایسے رسائل جاری ہوئے جنہوں نے ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ چند ایک کے نام قابل ذکر ہیں۔

بیسویں صدی۔ لاہور (۱۹۳۶)	ہمدرد۔ دہلی (۱۹۳۶)	صبح امید۔ بمبئی (۱۹۳۶)
نظام جوبلی گزٹ۔ دہلی (۱۹۳۶)	بہارستان۔ جالندھر (۱۹۳۷)	فردوس۔ لاہور (۱۹۳۷)
محقق۔ بہاول پور (۱۹۳۸)	مشعل۔ صوبہ سرحد (۱۹۳۸)	ہندوستانی۔ پٹنہ (۱۹۳۸)
کارنامہ۔ الہ آباد (۱۹۳۸)	داستان۔ لاہور (۱۹۳۹)	شعاعیں۔ حیدر آباد دکن (۱۹۳۹)

اقبال۔ علی گڑھ (۱۹۴۰)	سیاست۔ حیدر آباد دکن (۱۹۴۰)	سالنامہ۔ بنگلور (۱۹۴۰)
ساز نو۔ حیدر آباد دکن (۱۹۴۰)	ندائے حرم۔ دہلی (۱۹۴۱)	چمنستان۔ دہلی (۱۹۴۱)
آج کل۔ دہلی (۱۹۴۲)	ضیاء۔ لکھنو (۱۹۴۲)	کتاب۔ لاہور (۱۹۴۲)
اسلامیہ کالج میگزین۔ الہ آباد (۱۹۴۲)	نئی زندگی۔ الہ آباد (۱۹۴۳)	پیام ادب۔ حیدر آباد دکن (۱۹۴۳)
قوم۔ دہلی (۱۹۴۴)	نیا دور۔ بنگلور (۱۹۴۴)	نئی روشنی۔ لکھنو (۱۹۴۷)
پرچم۔ میرٹھ (۱۹۴۷)	عروج۔ بدایوں (۱۹۴۷)	چاند۔ لاہور (۱۹۴۷)
آہنگ۔ کراچی (۱۹۴۸)	ماہ نو۔ کراچی (۱۹۴۸)	نو بہار۔ پشاور (۱۹۴۸)
بولان۔ کوئٹہ (۱۹۴۹)	فیض الاسلام۔ راولپنڈی (۱۹۴۹)	کارواں۔ کوئٹہ (۱۹۵۰)
آداب عرض۔ لاہور (۱۹۵۰)	فاران۔ کراچی (۱۹۵۰)	پیام حق۔ کراچی (۱۹۵۰)
الحمرا۔ لاہور (۱۹۵۰)	معلم۔ کوئٹہ (۱۹۵۰)	حقیقت (پندرہ روزہ) سبی (۱۹۵۰)

اس دور میں ادب کے فروغ میں جن رسائل نے اہم کردار ادا کیا ان کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

معیار:

۱۹۳۶ء میں پٹنہ سے ماہنامہ جاری ہوا۔ اس کے مرتب قاضی عبدالودود اور معاون آرزو جلیلی تھے۔ یہ انجمن ترقی اردو کا رسالہ تھا۔ جس نے قلیل عرصے میں ادب کی بہت خدمت کی۔

''معیار'' نے ادب میں تحقیق کے نئے معیار قائم کیے اور رسالہ اردو کے طرز پر تحقیقی مضامین شائع کر کے ادب میں عملی تنقید کی نئی راہیں کھولیں۔ اس کے مضامین میں تحقیق اور تحریر کی کاوش نظر آتی ہے جو قاضی عبدالودود کی علمی بصیرت کا خزانہ ہیں۔

''معیار'' نے تحقیق کے ساتھ تخلیقی ادب کو پیش کیا جو اس سے پہلے اردو ادب میں مفقود نظر آتا ہے۔ اس نے تراجم کے ذریعے سے بھی ادب کی تخلیق کی۔ جس سے انداز تحریر میں ادبی رنگ پیدا ہو گیا اور یہ ٹھوس علمی مجلہ بن گیا۔

''معیار'' نے خالص ادبی و شعری تنقید کو رواج دیا اور فن تنقید کو ایسے اصولوں سے روشناس کرایا جن پر چل کر ادب ترقی یافتہ ممالک کے ہم پلہ ہوا۔ اس مجلے نے قدیم تذکروں اور شعراء کے دیوان پر بھی عالمانہ مضامین شائع کیے جو اردو ادب کے فروغ میں مفید ثابت ہوئے۔

''معیار'' نے اردو زبان کی اصلاح کی اور غلط الفاظ کے صحیح مفہوم کو بیان کیا۔ اس سے اردو کے لسانی ذخیرے میں زبردست اضافہ ہوا۔ اس رسالے کی انفرادیت یہ تھی کہ اس نے اردو کے تمام اہم رسائل کے مضامین کو پیش کیا اور ان پر جامع تبصرے کیے جس سے تنقید میں بھی تخلیق کا عنصر نمایاں ہوا اور اردو ادب میں تنقید نگاری کا ایک نیا باب روشن ہوا۔

''معیار'' کے مضامین کا معیار بہت بلند تھا۔ اس نے اردو میں تحقیقی اور تخلیقی ادب کا عمدہ نمونہ پیش کیا جس سے فروغ ادب ایک نئے راستے پر گامزن ہوا۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار لکھتے ہیں:

> '' 'معیار' نے اپنے لیے جو حدود متعین کیے تھے ان میں رہ کر ۱۹۳۶ء میں اس نے ایک ادبی اور تحقیقی جریدے کا وہ معیار پیش کیا جو یورپ کے اعلیٰ ادبی مجلات کے پیش نظر رہتا تھا۔ اعلیٰ معیار کو قائم رکھنے کے لیے بیشتر پرچہ ایڈیٹر کو خود ہی لکھنا پڑتا تھا جس کے تنوع کی خاطر مختلف قلمی نام بھی اختیار کرنے پڑتے تھے''۔[1]

جدید اردو:

کلکتہ سے یہ ماہنامہ ۱۹۳۷ء میں جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر پرویز شاہد، جوائنٹ ایڈیٹر احمد اشک، سعد منیر اور مدیر اعزازی محمد ظہور الحسن قاضی تھے۔ یہ رسالہ ترقی پسند ادب کا ترجمان تھا۔ اس کے افسانے ترقی پسند نظریات کے ترجمان تھے جن میں طبقاتی کشمکش اور دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کے نتائج کے بارے میں کہانیاں بیان کی گئی تھیں جن کا انجام المیہ تھا۔ ان افسانوں میں زندگی کی تلخیوں کا شدت سے احساس ملتا ہے۔

ترقی پسند ادب کے ساتھ ''جدید اردو'' نے تنقیدی ادب کو بھی اہم مقام دیا۔ اور نئی سوچ اور فکر کے زاویے متعین کیے۔ یہ وہ دور تھا جب اردو ادب نئی کروٹ لے رہا تھا۔ فکر و تخیل کی اس تبدیلی کا اثر ''جدید اردو'' نے بھی لیا اور اپنے نام کی مناسبت سے جدید خیالات کا ترجمان بن گیا۔ اس رسالے نے آسان اور سادہ زبان کے ذریعے ترقی پسند خیالات کی ترجمانی کی۔

سب رس:

۱۹۳۸ء میں حیدر آباد دکن سے جاری ہوا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اس کے سرپرست تھے اور مدیر صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش تھے۔ یہ خالص علمی و ادبی رسالہ تھا۔

''سب رس'' نے حیدر آباد دکن میں علم و ادب کے نئے چراغ روشن کیے اور ایسا مواد پیش کیا جس سے ادب میں نئے اضافے ہوئے۔ اس نے فن تنقید اور تبصروں کے نئے معیار قائم کیے جس سے اردو دان طبقے میں تنقید نگاری کا صحیح ذوق پیدا ہوا۔

''سب رس'' کی انفرادیت یہ تھی کہ یہ نہ صرف ادبی مجلّہ تھا بلکہ خواتین اور بچوں میں ادبی ذوق پیدا کرنے کا سبب بھی بنا۔ اس نے بچوں کے لیے کہانیاں اور نظمیں شائع کیں اور خواتین کا ادب بھی پیش کیا۔ اس کے علاوہ غیر ملکی تراجم کو اردو میں ڈھال کر اس کے لسانی ذخیرہ میں اضافہ کیا۔ یہ وہ مکمل، جامع اور مدلل ادبی جریدہ تھا جس نے اعلیٰ ادب کے نمونے پیش کیے جس سے اردو ادب کے ارتقا میں مزید تقویت ملی۔

برہان:

دہلی سے ماہنامہ ''برہان'' ۱۹۳۸ میں جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر سعید احمد اکبر آبادی تھے۔ یہ علمی و ادبی رسالہ تھا۔ اس نے مذہب، تاریخ، عمرانیات، لسانیات اور احادیث کو اپنے صفحات میں جگہ دی۔

''برہان'' نے اردو زبان کے مسئلے کو شرعی نقطہ نظر سے پیش کیا اور مختلف آیات کے حوالوں سے یہ بات ثابت کی کہ کسی قوم کا تہذیب و تمدن کا تحفظ اور بقا اس کی زبان میں مضمر ہے لیکن ہندوستان میں ہندی زبان کے حامی صرف اس لیے اردو کی مخالفت کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کی قومی حیثیت کو ختم کیا جائے۔ ''برہان'' نے اپنے مضامین کے ذریعے اردو زبان کی الگ حیثیت متعین کی اور مسلمانوں کی بقا کے لیے اس کے تحفظ کو اہم قرار دیا تا کہ مسلمان اپنا وجود اپنی زبان کے ذریعے سے برقرار رکھ سکیں۔

''برہان'' نے اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تاریخ کو فروغ دینے میں اہم خدمات انجام دیں اور مسلمانوں کے بنیادی عقائد کو قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کیا۔ یہ دور ادب میں جدید نظریات کے فروغ کا دور تھا۔ اس نے ادب کے رشتے کی اہمیت کا احساس قرآن و سنت کی روشنی میں دلایا۔ ''برہان'' کی سب سے بڑی ادبی خدمت یہ ہے کہ اس نے اردو زبان کے تحفظ کے لیے منفرد نظریے کو اپنایا اور شرعی نقطہ نظر سے اس کی وضاحت کی۔ اس لیے اس کی ادبی خدمات کو اس دور کا ہر رسالہ تسلیم کرتا ہے جس نے دین

اسلام اور تاریخ اسلام کو اردو دان طبقے میں دوبارہ زندہ کیا۔

نیا ادب:

۱۹۳۹ء میں لکھنو سے جاری ہوا۔ اسے سبط حسن، مجاز اور سردار جعفری کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہ ترقی پسند تحریک کا ترجمان تھا۔ ۱۹۴۱ء میں یہ حیدر آباد دکن سے نکلنے لگا اور اس کی ادارت قاضی عبدالغفار کے سپرد ہوئی۔

''نیا ادب'' ترقی پسند مصنفین کا رسالہ تھا اس کے آغاز میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک اور جلسوں کی کارروائی شائع ہوتی تھی اس کا تمام تر مواد ترقی پسندانہ خیالات پر مبنی ہوتا تھا۔ اس نے ترقی پسند مصنفین کی تحریروں اور مقاصد کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا اور ادب کے فروغ میں یہی اس کا مثبت کردار تھا۔

اقبال:

۱۹۳۹ء میں سیالکوٹ سے جاری ہوا۔ اس کے مدیر غلام سرور فگار تھے۔ ''اقبال'' کا مقصد علامہ اقبال کی ادبی اور ملی خدمات کو قارئین تک پہنچانا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس کا تمام تر مواد اقبالیات پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ ٹھوس علمی و ادبی جریدہ تھا۔ اس کے مقاصد میں اقبال کی خدمات کو زندہ کر کے دوام بخشنا تھا۔ اس نے اپنے اوراق میں بلند پایہ مضامین کے ذریعے علامہ اقبال کے فلسفوں اور شاعری کو سمویا۔

''اقبال'' کا انداز تحریر عالمانہ تھا اور زبان میں ادبی چاشنی پائی جاتی تھی۔ اس نے علامہ اقبال کے نظریات کو پیش کر کے فروغ ادب میں بہت بڑی خدمت انجام دی۔

ہندوستانی ادب:

۱۹۳۹ء میں حیدر آباد دکن سے ماہنامہ جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر غلام محمد وفا خان تھے۔ یہ مجلّہ قدیم اور جدید ادب کا عکاس تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہو۔ لیکن یہ جب تک قبول عام حاصل نہیں کرے گی اس وقت تک ترقی نہیں کر سکے گی۔ اس لیے اس نے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے پر زور دیا۔

''ہندوستانی ادب'' نے اردو دان طبقے کو یہ احساس دلایا کہ برطانوی حکومت ان کے حقوق کو پامال کر رہی ہے اسی لیے ان حقوق کے تحفظ کے لیے سب سے ضروری زبان کا تحفظ ہے لہٰذا مسلمان اردو زبان کے ارتقا، بقا اور تحفظ کے لیے کوشش کریں اور انگریزی زبان پر اپنا انحصار کم کر دیں۔ ان مقاصد کو اس رسالے نے پورا کیا۔ اس کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اردو کو فروغ اور سیاسی تحفظ دیا۔ ''ہندوستانی ادب'' نے سلیس اور سادہ زبان کو رواج دے کر فروغ ادب میں اہم کردار ادا کیا۔

مشرقی دنیا:

۱۹۴۰ء میں لاہور سے جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر الطاف پرواز اور نگران تاجور نجیب آبادی تھے۔ یہ علمی، ادبی، فنی، تعلیمی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ تھا۔

''مشرقی دنیا'' ہلکے پھلکے ادب کا نمونہ تھا جو قارئین کی دلچسپی کے لیے نکالا گیا تھا۔ اس میں نظموں اور غزلوں کو بھی شائع کیا جاتا تھا۔ اس کے اسلوب کی سادگی نثر اور نظم دونوں میں جلوہ گر تھی۔ اگرچہ اس مجلّے نے زیادہ شہرت حاصل نہ کی لیکن اس کے باوجود اہم ادیبوں کی نگارشات شائع کیں۔ اس قسم کے رسالوں سے اردو ادب کی حد تک ضرور متاثر ہوا چونکہ ادبی رسالے کا مقصد ہی ادب کا

فروغ ہوتا ہے۔ اسی لیے ''مشرقی دنیا'' اس مقصد میں کامیاب نظر آتا ہے۔

علم وادب:

دہلی سے ۱۹۴۰ء میں جاری ہوا۔ اس کے مالک و مدیر سیفی ندوی تھے۔ یہ ایک ایسا علمی مجلّہ تھا جس نے اپنے اوراق میں معیاری ادب پیش کیا اور علوم عقلیہ کو فروغ دیا۔ اس میں مذہبی مضامین بھی پیش کیے جاتے تھے جس سے ادب اور مذہب کا رشتہ استوار ہوا۔ اس کا انداز تحریر علمیت وادبیت میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا۔ ہیت اور مواد کے لحاظ سے یہ ''اردو'' سے ملتا جلتا تھا۔ اس نے اپنے دور میں بیش بہا ادبی خدمات انجام دیں۔ دہلی علم وادب کا مخزن تھا وہاں سے بے شمار رسائل جاری ہوئے ان میں ''علم وادب'' کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جس نے ٹھوس مواد کو ادب میں دوبارہ رواج دینے کی کوشش کی اس لیے اس کی ادبی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ادیب:

دہلی سے ۱۹۴۱ء میں جاری ہوا۔ اس کے مدیر سید محمد ارتضیٰ واحدی اور فصیح الدین احمد تھے۔

''ادیب'' کا اجرا ایسے دور میں ہوا جب اردو ہندی تنازعہ عروج پر تھا۔ اس رسالے نے اردو زبان کی اہمیت کا جائزہ لیا اور اسے ہندوستان کی اہم ترین زبان قرار دیا۔

''ادیب'' نے انسانوں میں ترقی پسند ادب کی ترجمانی کی اور تاریخی مضامین کو واقعات کی روشنی میں دوبارہ زندہ کیا۔

''ادیب'' نے اردو ادب کو جدید طرز کی کہانیاں دیں جن سے کہانیوں کی معنوی صورت میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ اس رسالے نے ادب ومعاشرت کو ہم آہنگ کیا اور ادب کو سماج کا ترجمان بنا کر اردو دان طبقے کے سامنے پیش کیا۔

افکار:

۱۹۴۵ء میں بھوپال سے جاری ہوا۔ اس کے نگران حکیم سید قمر الحق تھے اور ادارہ تحریر میں صہبا لکھنوی اور پرویز رشدی شامل تھے۔ یہ ترقی پسند ادب کا ترجمان تھا اس کا تمام تر مواد ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھانے میں کوشاں تھا۔ اس میں علمی وادبی مضامین، افسانے، نظمیں اور غزلیں شائع ہوتی تھیں۔

سویرا:

۱۹۴۶ء میں لاہور سے جاری ہوا۔ اس کے سرورق پر یہ عبارت شائع ہوتی تھی۔

''جدید فن کاروں کے خیالات کا سلسلہ''

''سویرا'' کا تمام تر مواد ترقی پسند خیالات کا ترجمان تھا اور اپنی پالیسی کا کھل کر اظہار کرتا تھا۔ اس نے اشتراکی نظریات کو فروغ دیا۔ اس رسالے نے ترقی پسندی کے نام پر عورت اور جنس کا بے باکانہ اظہار کیا اسی وجہ سے اس کے افسانوں میں عریانیت نظر آتی ہے۔ اس نے علامتی افسانہ نگاری کو پیش کیا اور ادب میں مادی نظریات کو متعارف کرایا۔

ترقی پسند ادب کے فروغ میں ''سویرا'' کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ اہم اور بلند پایہ مجلّہ تھا جس نے جدید نظریات کو پیش کیا جو ادب کی ماہیت اور نظریات میں انقلاب کا موجب بنے۔ ترقی پسند نظریات کے فروغ کے لیے جتنے رسائل جاری ہوئے ان میں ''سویرا'' کا معیار سب سے بلند تھا۔ اس نے قیام پاکستان کے بعد بھی ترقی پسند ادب کو فروغ دیا۔

قیام پاکستان سے نہ صرف سیاسی انقلاب رونما ہوا بلکہ یہ اردو دان طبقے کی سوچ کے لیے نیا زاویہ فکر تھا کہ کس طرح علوم

تہذیبی روایات کو دوبارہ زندہ کر سکتے تھے۔ انفرادی واجتماعی زندگی کا دارومدار ان اقدار حیات پر مبنی ہے جن کی بنیاد انقلابی موضوعات پر ہو۔ یہ انقلابی تبدیلی ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک کے بعد بہت نمایاں تھی۔ علمی وادبی صحافت اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھی اور زیادہ تر رسائل ترقی پسند ادب کے ترجمان تھے۔

قیام پاکستان کے بعد بھی یہ رنگ قائم رہا اور کئی رسائل اپنی پرانی آب وتاب کے ساتھ ادب کی روایات کو برقرار رکھے ہوئے تھے۔ ہمایوں، ادبی دنیا، نیرنگ خیال، ادب لطیف، ساقی، نگار، نقاد، انتخاب، بہارستان، سہیل، ندیم، خیالستان، کاروان، رومان، شاہکار، نئی روشنی پاکستان میں بھی مقبول ہوئے اور کئی سال تک ادب کے فروغ میں اپنا کردار ادا کرتے رہے۔

نقوش:

۱۹۴۸ء میں بلند پایہ ''نقوش'' جاری ہوا۔ احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور اس کی ادارت میں شامل تھے۔ شروع میں یہ ترقی پسند ادب کا ترجمان رہا اور ادب کے ساتھ نیم سیاسی موضوعات کو بھی جگہ دیتا تھا۔ جب محمد طفیل نے ادارت سنبھالی تو یہ خالص ادبی مجلّہ بن گیا۔ ''نقوش'' نے اردو ادب کے فروغ میں تاریخ ساز کردار ادا کیا۔ اس وقت مواد، معیار اور اشاعت کے اعتبار سے یہ پاکستان کا سب سے زیادہ معیاری رسالہ تھا۔ اس نے ضخیم خاص نمبر شائع کر کے ادبی روایات کو زندہ کیا اور تحقیق طلب مواد کو قارئین کے سامنے پیش کیا۔ اس کے لاہور نمبر، شخصیات نمبر، افسانہ نمبر، مکاتیب نمبر، طنز ومزاح نمبر دہ سالہ نمبر، رسول نمبر اردو ادب کے لافانی شاہکار ہیں۔

ماہ نو:

۱۹۴۸ء میں کراچی سے سید وقار عظیم کی ادارت میں جاری ہوا۔ اس نے پاکستان کے علاقائی امور، ادب وثقافت کی عمدہ عکاسی کی۔ اسے سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔

اردو:

مولوی عبدالحق پاکستان بننے کے بعد ''اردو'' کو کراچی لے آئے اور ۱۹۴۹ء میں اسے دوبارہ جاری کیا۔ اس رسالے کا مقصد اردو زبان وادب کی ترقی اور فروغ تھا۔ اس نے پاکستان میں ادب کی گراں قدر خدمات انجام دیں اور لسانی اعتبار سے اسے مزید ترقی دی۔

☆☆☆☆

پاکستان میں ادبی رسائل کا مقصد جدید ادب کے تقاضوں کو پورا کرتا اور گم شدہ ادب کو دوبارہ زندہ کرتا تھا تاکہ اردو دان طبقے کی فکر میں آفاقی وسعت پیدا ہو سکے۔ انہی مقاصد کے تحت سید عابد علی عابد کی زیر ادارت ''صحیفہ'' اور احمد ندیم قاسمی نے ''فنون'' کا ڈول ڈالا۔ سیپ اور اوراق بھی اسی دور کے رسائل ہیں جنھوں نے ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

علم وادب کے فروغ کے لیے پاکستان کے پسماندہ علاقوں سے بھی اعلیٰ پائے کے رسائل شائع ہوئے۔ پشاور سے رضا ہمدانی نے ۱۹۴۸ء میں ''سنگ میل'' جاری کیا جو علاقائی ثقافت اور ادب کا عکاس تھا۔ کوئٹہ سے ۱۹۵۰ء میں عبدالباقی درخانی نے ''علم'' جاری کیا۔ یہ علمی وادبی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے صفحات میں مذہبی امور کو بھی جگہ دیتا تھا۔ مشرقی پاکستان ڈھاکہ سے ڈاکٹر

عندلیب شادانی نے "خاور" جاری کیا جو ایک معیاری رسالہ تھا اور اس نے ادب کے فروغ میں معاونت دی۔

پاکستان میں ادبی رسائل مسلسل تنزل کا شکار رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ عوام کا ادبی ذوق ختم ہوتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے ادبی رسائل کی مانگ کم ہوگئی ہے۔ اقتصادی مجبوریوں کے باعث اعلیٰ رسائل آہستہ آہستہ بند ہو رہے ہیں اور نئے رسائل کے اجرا کی طرف بہت کم توجہ دی جا رہی ہے۔ ایک جائزے کے مطابق ۱۹۵۲ء میں اردو زبان میں ۳۱۵ ماہنامے اور ۱۲ سہ ماہی رسائل جاری تھے[2] لیکن ۱۹۸۳ء میں صرف ۲۳۶ رسائل رہ گئے[3]۔ ان میں زیادہ تر تفریحی رسائل یا ڈائجسٹ رسالے شامل تھے جن میں سستی تفریح کے لیے مواد مہیا کیا جاتا ہے۔

ڈائجسٹ رسالے:

ادبی رسائل کی کمی کے باعث عوام کا رجحان بھی تبدیل ہوگیا اور ادب کے ساتھ متنوع موضوعات پر مواد کی مانگ بڑھ گئی۔ ان حالات میں ایک نئی تبدیلی ہوئی اور امریکہ کے ریڈرز ڈائجسٹ کی طرز پر ڈاکٹر اعجاز حسین قریشی اور الطاف حسن قریشی نے ۱۹۶۰ء میں "اردو ڈائجسٹ" جاری کیا جو پاکستانی قارئین کے ذوق کے عین مطابق تھا۔ معاشرت، تہذیب، مذہب، جاسوسی، سائنس اور نفسیات اس کے موضوعات میں شامل تھے۔ یہ رسالہ بہت مقبول ہوا اور پاکستانی صحافت میں نئی طرز کا اضافہ ہوا۔ اس کے بعد "سیارہ ڈائجسٹ" جاری ہوا اور یہ بھی بہت مقبول ہوا۔

علمی و ادبی صحافت کے نمایاں نقوش اور ادب کے فروغ میں کردار:

ادب و صحافت اس دور میں ایک دوسرے کے ہم رکاب تھے۔ ادب کا فروغ صحافت کے ذریعے سے ہوا۔ اس نے اپنے اظہار کے لیے صحافت کو ذریعہ بنایا اور صحافت نے ہر دور میں اپنا کردار بخوبی انجام دیا۔ انیسویں صدی میں ادب و صحافت ایک ساتھ جس سفر پر گامزن ہوئے اس کی پہلی منزل اس نے بیسویں صدی کے ربع اول میں پائی۔ اس دور میں بھی ادب و صحافت الگ نہ ہو سکے اور صحافت نے ادب کی کئی نئی اصناف کو متعارف کروا کر اپنے کردار کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ادب و صحافت اسی ڈگر پر چل رہے تھے۔ اخبارات ادب و سیاست کی عکاسی کر رہے تھے کہ ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک نے ادب و صحافت کی راہوں کو جدا کر دیا۔ اخبارات صحافتی تقاضوں کی عکاسی کرنے لگے اور رسائل کو ادب تک محدود کر دیا گیا۔ بظاہر ادب و صحافت کی راہوں کو الگ کر دیا گیا لیکن صحافت ادب کے دامن سے الگ نہ ہو سکی اور اس دور کے اخبارات نے ادب کی ترویج کے لیے ادبی ایڈیشن نکالنے شروع کیے۔ اس طرح ادب و صحافت الگ نہ ہو سکے اور ایک ساتھ خدمات انجام دیتے رہے۔

علمی و ادبی صحافت کا یہ دور ادب کا تابناک دور کہلاتا ہے اس دور میں اعلیٰ پائے کے رسائل جاری ہوئے جن کا ہم پلہ آج تک کوئی رسالہ نہ بن سکا۔ اس دور میں تحقیق کے اعلیٰ معیار قائم کیے گئے اور مشرقی و مغربی علوم کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔ اس دور کی مجلاتی صحافت نے ادب کے دھاروں کو موڑ دیا۔ تاریخ ادب میں ان جرائد کے نقوش ان مٹ ہیں۔ ادبی تاریخ ہو یا صحافتی اس دور کے رسائل کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ ان میں رسالہ اردو، نگار، ہمایوں، جامعہ، نیرنگ خیال، اورینٹل کالج میگزین، انتخاب، بہارستان، سہیل، ادبی دنیا، خیالستان، ساقی، ادب لطیف، شاہکار، معیار، اقبال، سویرا، نقوش، ماہ نو، سنگ میل اور خاور کے نام سنہرے حروف میں لکھا جا سکتا ہے۔

۱۔ اس دور کے رسائل نے اردو ادب کو مغربی ادب کے معیار کے برابر لا کھڑا کیا۔
۲۔ "ادب برائے زندگی" کے مقولہ کو فروغ دیا۔
۳۔ اس دور میں انشاپردازی کی صنف کو دوبارہ زندہ کیا۔
۴۔ رسائل نے جذباتی اور خطیبانہ اسلوب بیان کو متعارف کرایا۔
۵۔ صحافتی شاعری کا سنگ بنیاد اسی دور میں رکھا گیا۔
۶۔ ادب کو "رومانیت" سے بھرپور رکھا۔
۷۔ رسائل نے عملی تنقید کو اردو ادب میں رواج دیا۔
۸۔ اعلیٰ تحقیق طلب مواد کو رسائل کے ذریعے سے فروغ دیا۔
۹۔ اسی دور کے رسائل نے اردو زبان کی اصلاح کی اور اسے نئی شکل دی۔ آج ہمیں جو اردو زبان نظر آتی ہے یہ مولوی عبدالحق کے رسالہ "اردو" کی مرہون منت ہے۔
۱۰۔ اس دور کے رسائل نے اردو ادب کو فکر، تخیل اور جدیدیت سے روشناس کیا۔
۱۱۔ انشائی ادب کے اعلیٰ معیار قائم کیے جو مغربیت کے ہم پلہ تھے۔
۱۲۔ اس دور کے رسائل نے ٹھوس علمی مواد کو پیش کر کے اردو دان طبقے سے متعارف کرایا۔
۱۳۔ مجلاتی صحافت نے ادب کے ذریعے اسلامی تاریخ کو دوبارہ زندہ کیا۔
۱۴۔ رسائل نے ترقی پسند ادب کی تحریک کا آغاز کیا اور اسے فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔
۱۵۔ جرائد کے ذریعے سائنسی اصلاحات کو اردو میں منتقل کیا۔ اس طرح اردو کے لسانی ڈھانچے کو از سر نو مرتب کیا۔
۱۶۔ اردو شاعری کو حقیقت نگاری کے سانچے میں ڈھالنے میں رسائل نے اہم کردار ادا کیا۔
۱۷۔ اردو شاعری کی مختلف اصناف کو رسائل نے اپنے صفحات میں جگہ دی۔
۱۸۔ مجلاتی صحافت کے ذریعے مشرقی اور مغربی شاعری کی عکاسی ہونے لگی۔
۱۹۔ نظم کے ساتھ آزاد شاعری کو بھی اس دور کے رسائل نے فروغ دیا۔
۲۰۔ اس دور کے رسائل نے اردو شاعری کا ذوق پیدا کیا۔

ادب و صحافت کا وہ تعلق جو انیسویں صدی میں ایک ساتھ شروع ہوا اس دور میں اپنی راہوں کو الگ کرنے کے باوجود الگ نہ ہو سکا۔ جرائد نے اعلیٰ ادب کے جو معیار قائم کیے وہ اس سے پہلے نظر نہیں آئے۔ اگرچہ اخبارات میں ادب کو الگ کر دیا گیا لیکن اس کے باوجود ادب و صحافت سے الگ نہ ہو سکا اور دونوں کا لازوال رشتہ اس دور میں اور مستحکم ہوگیا۔ اس رشتے کو ادبی جرائد نے جو استحکام بخشا وہ آج بھی قائم ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار، جرنل خدا بخش لائبریری (پٹنہ) جلد ۱۷۔۱۸، ۱۹۸۱ء

2. Majid Nizami, Press in Pakistan, Punjab University press, Lahore, 1958, P.68

3. Pakistan Times, 9 August 1983 statement Raja Zafarul Haq.

نگارشاتِ پروفیسر محمد اسلم

محمد عالم مختار حق

پروفیسر محمد اسلم بیک وقت محقق بھی تھے اور مورخ بھی، سفرنامہ نگار بھی تھے اور سوانح نگار بھی اور ان متنوع عنوانات پر ان کے سیکڑوں مضامین و مقالات برصغیر پاک و ہند کے علمی و تحقیقی جرائد میں چھپ چکے ہیں۔ وہ دو درجن کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں جن میں سے گیارہ کتابیں اعلیٰ جماعتوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ کئی کتابیں ان کی تصحیح و نظر ثانی کے بعد طبع ہوئیں اور ایم اے کے بہت سے تحقیقی مقالات ان کی زیر نگرانی لکھے گئے جس سے ان کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ زندگی بھر اس اصول پر کاربند رہے کہ وہ خواہ کتنے ہی عدیم الفرصت ہوں، تھوڑا بہت وقت تحریر کے لیے ضرور نکال لیتے اور اس میں تساہل کو گناہ سمجھتے۔ وہ ایک وقت میں کئی موضوعات پر کام کرنا شروع کر دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قلم سے نکلے ہوئے مضامین/مقالات نے ایک انبار کی صورت اختیار کر لی:

ہم یہاں ان کے رشحاتِ قلم کی ایک تعارفی فہرست پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں مگر ذرا رک جائیے۔ مطالعہ سے پیشتر ہم چاہتے ہیں کہ قارئین کرام کو ان کے مختصر سوانح حیات اور ان کے ان اساتذہ کرام کے اسمائے گرامی سے روشناس کرائیں، جن سے انہوں نے اکتساب فیض کر کے تاریخ میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ تو سنیے:

پروفیسر محمد اسلم صاحب ۲۸ نومبر ۱۹۳۲ء کو پھلور (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار ریلوے میں ملازم تھے۔ جب سکول جانے کے قابل ہوئے تو والدین لاہور لے آئے جہاں کنیئرڈ سکول میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ اقبال ہائی سکول سے میٹرک کرنے کے بعد اسلامیہ کالج میں داخلہ ملا جہاں میاں شمس الدین اور پروفیسر حمید احمد خان کی صحبت ملی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد دیال سنگھ کالج میں داخلہ مل گیا جہاں علامہ تاجور نجیب آبادی، پروفیسر خادم محی الدین، پروفیسر عاشق محمد اور پروفیسر رفیق احمد کی صحبت ملی۔ اسی کالج میں پروفیسر محمد شجاع الدین مرحوم و مغفور سے متعارف ہوئے۔ موصوف کا پروفیسر محمد اسلم صاحب کی شخصیت بنانے میں بڑا اہم کردار ہے۔

بی اے کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ میں داخلہ ملا اور ۱۹۵۵ء میں تاریخ میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ ایم اے کے بعد علی گڑھ چلے گئے اور وہاں تاریخ کا مطالعہ شروع کیا۔ لیکن وہاں کی بدلی ہوئی فضا میں زیادہ عرصہ قیام نہ کر سکے۔ اس لیے کچھ عرصہ بعد واپس چلے آئے۔ علی گڑھ سے واپسی کے بعد کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لے کر شاہجہان پر تحقیقی مقالہ لکھنا شروع کیا لیکن اسے ادھورا چھوڑ کر انگلستان چلے گئے۔ خوش قسمتی سے وہاں ڈرہم یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ اس جگہ پروفیسر جان ہے وڈ، پروفیسر بیگلی اور پروفیسر رچرڈ ہل جیسے شفیق اساتذہ کی صحبت مل گئی اور پروفیسر محمد اسلم صاحب نے دو سال بعد ۱۹۶۰ء میں علوم اسلامیہ اور عربی میں آنرز حاصل کیا۔

ڈرہم یونیورسٹی سے آنرز کے بعد مانچسٹر یونیورسٹی میں داخلہ لیا جہاں پروفیسر براؤن سے فارسی زبان پڑھی اور حضرت مجدد الف ثانی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ۱۹۶۲ء میں ایم اے کی ڈگری لی۔ مانچسٹر سے فارغ ہوتے ہی کیمبرج چلے گئے جہاں داخلہ پہلے سے ہو چکا تھا۔ کیمبرج میں چار سال قیام کیا اور پروفیسر آربری، پروفیسر ہیوبرٹ ڈارک اور پروفیسر پیٹر ایوری کی نگرانی میں قرون وسطیٰ کے ایک معروف مسلم مفکر مولانا فضل اللہ بن روزبہان اصفہانی کے سیاسی افکار پر تحقیق کی۔ جنوری ۱۹۶۷ء میں اپنا مقالہ یونیورسٹی میں پیش کر دیا (اس پر بھی انہیں ایم لٹ کی ڈگری ملی) وہ انگلستان میں نو سال قیام کے بعد واپس پاکستان آ گئے۔

ستمبر ۱۹۶۷ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ میں لیکچرار کی حیثیت سے تقرر ہوا اور تین سال کے بعد ریڈر بن گئے (تعارف نامہ از ہمدرد فاؤنڈیشن) سوا پانچ سال تدریس کے بعد بطور صدر شعبہ تاریخ ان کا تقرر ہو گیا جہاں سے بیس سال کے بعد وہ ۲۲ نومبر ۱۹۹۲ء کو سبکدوش ہوئے۔ اس سارے عرصہ ملازمت میں انہوں نے اپنے فرائض منصبی کی نہایت دیانتدارانہ ادائی کے ساتھ مضمون نویسی اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھا اور قلم و قرطاس سے یہ رشتہ تادم واپسیں استوار رہا اور اس میں انقطاع صرف اسی دم صورت پذیر ہوا جب دست بیداد اجل سے ان کا طائر روح مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو جسد خاکی سے عالم بالا کو پرواز کر گیا۔

اعلان واجب الاظہار۔ ''نگارشات پروفیسر محمد اسلم'' کو بطریق احسن پایہ تکمیل تک پہنچانے کے سلسلے میں جناب پروفیسر محمد اسلم مرحوم کے خلفِ اصغر فاروق نافع سلمہٗ اور ان کی دختر نیک اختر تنویر انجم سلمہا کا سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے میری استدعا پر میرے کام کی اہمیت کے پیش نظر صرف اپنے والد مرحوم کی لائبریری تک رسائی کا موقع ہی بہم نہیں پہنچایا بلکہ رسائل میں سے مضامین تلاش کرنے میں خود بھی عملی طور پر مظاہرہ کیا۔ ان کے اس بے لوث تعاون پر اگر میں یہ کہوں کہ:

ہر مو مرے بدن کا زبانِ سپاس ہے

تو یہ مبنی بر مبالغہ نہ ہوگا۔ میں دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس اعانت اور للہی یاوری پر دارین میں کامرانیوں سے ہمکنار فرمائے اور انہیں توفیق ارزانی فرمائے کہ وہ اپنے مرحوم باپ کے علمی و تحقیقی مشن کو جاری و ساری رکھ سکیں:

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

اب پیش خدمت ہے پہلے ان کی کتابوں کا تعارف اور بعد ازاں ان کے مقالات/مضامین کے کوائف اور آخر میں ایم اے کے ان مقالات کی فہرست جو ان کی زیر نگرانی لکھے گئے:

تصانیف:

۱۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر۔ ندوۃ المصنفین، سمن آباد، لاہور، جنوری ۱۹۷۰

اس عنوان پر پروفیسر صاحب کا ایک مضمون ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے ماہنامہ ''المعارف'' میں چھپا تھا۔ بعد ازاں حکیم اہل سنت جناب حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری دامت برکاتہم کی تحریک پر پروفیسر صاحب نے اس مضمون پر نظر ثانی کی اور اس میں اتنے اضافے کیے کہ مضمون نے کتابی شکل اختیار کر لی۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن ندوۃ المصنفین دہلی سے اگست ۱۹۶۹ء میں اشاعت پذیر ہوا جب کہ اس کی طبع ثانی ندوۃ المصنفین لاہور سے تین ابواب کے اضافہ کے ساتھ جنوری ۱۹۷۰ء میں منصۂ شہود پر

آئی۔ کتاب پر تقریظ مرحوم کے خسر مولانا سعید احمد اکبرآبادی (سابق مدیر "برہان" دہلی) کے قلم سے ہے جس میں انہوں نے مصنف کی توصیف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "عزیز موصوف کا نظریہ عہد زیر بحث کی تاریخ میں ایک نیا اور انقلاب آفرین نظریہ ہے اور اس کو ایسے قطعی دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے کہ کسی کے لیے مجال انکار و تردید باقی نہیں رہتی۔ دین الٰہی کی اصل حقیقت اور اس کا پس منظر معلوم ہو جانے کے بعد حضرت مجدد رحمہ اللہ کی تحریک اور ان کے کام کی اہمیت اور عظمت بھی دہ چند ہو جاتی ہے"۔ اس متنازعہ فیہ مسئلہ پر پروفیسر صاحب نے فیصلہ کن بحث کر کے اہل علم سے داد وصول کی۔ یہ کتاب ایم اے کے نصاب میں شامل ہے۔ اخبارات و رسائل میں اس کتاب پر شائع شدہ تبصرے اسی نام سے الگ کتابچے کی صورت میں ندوۃ المصنفین لاہور نے شائع کیے۔

۲۔ ملفوظاتی ادب کی تاریخی اہمیت۔ ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور، مارچ ۱۹۹۵ء

بزرگان دین کے ملفوظات پر جرح و تعدیل کے نقطہ نظر سے بعض مستقل تصانیف وجود پذیر ہو چکی ہیں۔ جیسے شیخ محمد اکرام کی "آب کوثر" علامہ اخلاق حسین دہلوی کی "آئینہ ملفوظات" اور نثار احمد فاروقی کی "نقد ملفوظات" وغیرہ مگر تاریخی نقطہ نظر سے ملفوظات کی اہمیت کا غالباً پروفیسر صاحب سے پہلے کسی نے جائزہ نہیں لیا۔ پروفیسر صاحب ملفوظات کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ تصوف میں "امیر حسن علا سجزی نے ایک نئی صنف ایجاد کی اور ملفوظ نویسی کی داغ بیل ڈال دی اور یہ فن تصوف کی نشر و اشاعت کا ایک موثر ذریعہ بن گیا۔ امیر حسن کے اس تجربے نے اہل قلم کو اس طرف متوجہ کیا اور اوچ شریف سے لے کر بہار شریف تک ملفوظات کی ترتیب و تدوین کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا"۔ پروفیسر صاحب نے زیر نظر کتاب میں "فوائد الفواد" (۷۰۷ھ) ملفوظات سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا دہلویؒ مرتبہ امیر حسن علا سجزی (س ج ز ی نہ کہ س ن ج ر ی) سے لے کر دار المعارف (۱۲۳۱ھ) ملفوظات حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ مرتبہ شاہ رؤف احمد فاروقیؒ تک کے عرصہ کے درمیان مرتب ہونے والے ۲۹ ملفوظات کا جائزہ پیش کیا ہے اور یہ دور کم و بیش سوا پانچ سو سال پر محیط ہے۔ پروفیسر صاحب نے ان تمام ملفوظات کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور ان واقعات کی خاص طور پر نشان دہی کی ہے جن کا عام طور پر ہم عصر کتب تاریخ میں ذکر نہیں ملتا اور ان واقعات کا واحد ماخذ ملفوظات ہی ہیں جیسے "مخدوم جہانیاں فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ غزوہ احد سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ تشریف لائے تو شہدا کے گھروں میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی اور آہ و بکا کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن سید الشہدا حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں خاموشی تھی۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت پر آنسو بہانے والا کوئی نہیں ہے؟ جب انصار تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے اپنی خواتین کو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی تعزیت کے لیے بھیجا۔ مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ اس کے بعد وہاں یہ رواج ہو گیا کہ جب لوگ کسی کے ہاں تعزیت کے لیے جاتے ہیں تو پہلے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی تعزیت کرتے ہیں اور پھر متوفی کے لواحقین سے اظہار تعزیت کرتے ہیں"۔ پروفیسر صاحب نے ملفوظات حضرت مخدوم شاہ مینا لکھنوی کے مطالعہ سے یہ حیرت انگیز انکشاف بھی کیا ہے کہ مشہور انگریز فلسفی و ریاضی دان نیوٹن (م ۱۷۲۷ء) نے کشش ثقل کا نظریہ ۱۶۶۶ء میں ایک سیب کو درخت سے نیچے گرتے دیکھ کر پیش کیا تھا۔ اس نظریے کی دریافت سے دو صدیاں پیشتر حضرت شاہ مینا (م ۱۴۷۹ء) نے حرکت طبعی، حرکت قصری اور حرکت ارادی کے عنوان سے نیوٹن کے نظریے سے ملتا جلتا نظریہ پیش کیا تھا"۔ پروفیسر صاحب نے ایک ملاقات میں راقم کو بتایا تھا کہ جس سیب کے درخت سے یہ دانہ گرا تھا اسے انگریزوں نے محفوظ کر رکھا

ہے۔ مگر ایک ہم ہیں کہ آثار قدیمہ (مقابر و مساجد) کو منہدم کیے جا رہے ہیں۔ مزید تاریخی انکشافات کے لیے کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ مختصر مضمون مزید امثال کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

۶۔ سفرنامۂ ہند۔ ریاض برادرز، اردو بازار، لاہور، جولائی ۱۹۹۵ء

پروفیسر صاحب نے ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۸۶ء تک ہندوستان کے تاریخی، علمی، دینی اور روحانی مراکز کے متعدد مرتبہ سفر کیے اور ان میں سے بعض اسفار کی روئیداد انہوں نے پاکستان کے علمی مجلات میں شائع بھی کرائی۔ بعد میں انہوں نے پورا سفرنامہ کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ بقول پروفیسر صاحب اس کی طباعت محترم حکیم محمد موسیٰ امرتسری کے تعاون کے بغیر ممکن نہ تھی۔ یعنی ع:

مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی

یہ سفرنامہ عام سفرناموں سے امتیازی شان کا حامل ہے۔ جو قاری کو صرف مقامات سفر سے ہی متعارف نہیں کراتا بلکہ تاریخی اہمیت کے حامل اکابر اور اہل اللہ کے آثار و قبور اور مزارات بزرگان دین کی الواح کے حوالے سے مستند اور بنیادی معلومات بھی فراہم کرتا ہے۔ طرز تحریر ایسا دل نشین ہے کہ قاری اپنے آپ کو پروفیسر صاحب کے ساتھ ہمسفر محسوس کرتا ہے۔ کتاب کے آخر میں آثار قدیمہ کی متعدد تصاویر بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ کانپور میں قیام کے دوران پروفیسر صاحب کی ملاقات حکیم حافظ حبیب الرحمٰن سے ہوئی۔ انہوں نے دوران گفتگو پروفیسر صاحب کو ہائی بلڈ پریشر کا نسخہ لکھ کر دیا جسے پروفیسر صاحب نے رفاہ عامہ کے لیے سفرنامہ میں نقل کر دیا ہے۔ (ص ۳۸۳)۔ چونکہ پاکستان میں بھی یہ مرض ایک وبائی صورت اختیار کر چکا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ یہ نسخہ پروفیسر صاحب کے لیے صدقہ جاریہ کے طور پر یہاں بھی درج کر دیا جائے۔ وھوھذا:

اسرول، دانہ ہیل خورد، تخم کاہو مقشر، برادہ صندل سفید، یشب، طباشیر نقرہ اصلی، زہر مہرہ، گل سرخ، یہ آٹھوں چیزیں ہم وزن لے کر ان کا سفوف تیار کر لیں اور صبح و شام چائے کا نصف چمچہ استعمال کریں۔ اس مرض میں خمیرہ مروارید اصلی یا خمیرہ صدف میٹھے انار کے رس کے ساتھ استعمال کیا جائے تو وہ بھی کارگر ثابت ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ یہ سفرنامہ گوناگوں علمی و ادبی نکات کا حامل اور لطائف نفیسہ اور معلومات مفیدہ کا مرقع ہے۔ اس سفرنامہ پر جناب خلیل احمد رانا صاحب نے پروفیسر صاحب کی اخذ کردہ بعض معلومات سے اختلاف کرتے ہوئے علمی انداز میں محاکمہ کیا ہے (ماہنامہ "جہان رضا"۔ شمارہ نمبر ۷ برائے جون و جولائی ۱۹۹۸ء) پروفیسر صاحب اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ ان کی مخالفت میں اگر کوئی خامہ فرسائی کرتا تو وہ جواب الجواب کے تردیدی سلسلہ میں نہیں الجھتے تھے اور نہ ہی اس بے حاصل شوق میں اپنی ذہنی توانائی ضائع کرتے۔ پروفیسر صاحب نے ہندوستان کے علاوہ بھی بعض ممالک کے سفر کیے جن میں برطانیہ، فرانس، بلجیم، سوئزرلینڈ، اٹلی، یوگوسلاویہ، ترکی، شام، اردن، عراق، ایران، سعودی عرب، کینیڈا اور امریکہ شامل ہیں۔ ان اسفار میں سے امریکہ کا سفرنامہ قلمبند کرنے کا ان کا پختہ ارادہ تھا۔ جس کے لیے ضروری یادداشتیں ان کی ڈائری میں درج ہیں مگر افسوس مرگ ناگہانی نے انہیں اس ارادہ کو روبہ عمل لانے کی مہلت نہ دی:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

۴۔ خفتگان خاک لاہور۔ ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب، لاہور، مارچ ۱۹۹۳ء

مرحوم پروفیسر محمد اسلم تھے تو تاریخ کے سکالر مگر انہوں نے اردو ادب کی اصناف میں بھی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ بالخصوص جس موضوع پر انہیں درجہ تخصص حاصل تھا وہ تھا الواح مزارات وقبور کی دریافت، یعنی زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہم افراد کی قبروں کا سراغ، ان کا محل وقوع اور کتبوں کی نقل جس پر انہوں نے اپنی عمر عزیز کے تقریباً چالیس برس صرف کیے۔ وہ سفر میں ہوں یا حضر میں، جہاں انہیں کسی قدیم قبر یا مزار کا پتا چلتا، کاغذ قلم سنبھال اس قبر یا صاحب مزار کے کتبہ کے کوائف درج کر لیتے۔ کتبوں کی شناخت میں انہیں اتنی مہارت حاصل ہوگئی تھی کہ انہیں یہ تک معلوم تھا کہ کس کتبہ میں کیا لفظی غلطی ہے اور یہ کہ وہ کس کاتب کا لکھا ہوا ہے۔ میں منشی عبدالمجید پرویں رقم کے فن خطاطی پر کام کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں انہوں نے متعدد مرتبہ پیشکش کی کہ ''میرے ساتھ گورستان میانی چلو۔ میں بتاؤں گا کہ پروین رقم کے لکھے ہوئے پتھر کس کس قبر پر نصب ہیں'' مگر شومئی قسمت کہ میں ان کی اس پیشکش سے اپنی کسالت کے سبب بہرہ اندوز نہ ہو سکا۔ پروفیسر صاحب نے کتبوں کے غائر مطالعہ سے یہ دلچسپ بات بھی استنباط کی کہ ''کتبے سے صاحب قبر کے عقائد بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔ دیوبندی مسلک سے تعلق رکھنے والے اصحاب قبور کی قبروں پر اللہ محمد اور یا حی یا قیوم کندہ ہوتا ہے۔ بریلوی مسلک سے تعلق رکھنے والے اصحاب قبور کے کتبوں پر یا اللہ جل جلالہ، یا رسول اللہ ﷺ یا پھر صلی اللہ علیک یا رسول اللہ مرقوم ہوتا ہے۔ جن اصحاب قبور کا رجحان تصوف کی جانب ہوتا تھا ان کے کتبوں پر یا غوث الاعظم دستگیر ما، یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ یا ان کے سلسلہ تصوف کے اساطین کے اسماء رقم ہوتے ہیں۔ اثنا عشری فرقے کے اصحاب کی قبور پر عموماً کلمہ طیبہ کے بعد علی ولی اللہ وصی رسول اللہ خلیفۃ بلافصل اور دوازدہ ائمہ کرام کے اسماء رقم ہوتے ہیں'' (صفحہ م)۔ (جن اصحاب پر توحید کا غلبہ ہوتا ہے ان کے کتبوں پر یا حی یا قیوم کندہ ہوتا ہے۔ اثنا عشری فرقے سے تعلق رکھنے والوں کی قبروں کے کتبوں پر پنجتن پاک کے نام کندہ ہوتے ہیں۔ ان کی بعض قبروں کے کتبوں پر خط طغریٰ میں ذوالجناح کی شبیہ بھی میری نظروں سے گزری ہے۔ اسی طرح سلیمانی بوہروں کی قبروں کے کتبوں پر اگر مرد ہو تو اس کے نام کے ساتھ ''الحر'' اور عورت ہو تو ''الحرۃ'' ضرور مرقوم ہوتا ہے۔ ماخوذ خفتگان کراچی۔ صفحہ ط) البتہ ان میں گنتی کی چند قبور اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ ہیں اور یہ ان لوگوں کی ہیں جو اپنی زندگی میں تو اپنے مسلک کے مطابق ''یا محمد'' کہنے کے قائل نہ تھے مگر ان کے اخلاف نے شعوری یا غیر شعوری طور پر مرنے کے بعد مرحوم کے لیے اسی میں عافیت سمجھی کہ لوح مزار پر ''یا اللہ'' کے ساتھ ''یا محمد'' بھی کندہ کرا دیا جائے جیسا کہ مولانا غلام رسول مہر، جو مسلکاً اہل حدیث تھے، کی قبر کے پتھر پر کندہ یہ الفاظ انہیں اپنی حفظ وامان میں لیے ہوئے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے مرحومین کے بارے میں بنیادی سوانحی معلومات بھی فراہم کر کے کتاب کو مزید نافع بنا دیا جائے۔ کتاب میں فن خطاطی کے نامور اساتذہ کے مکتوبہ پتھروں کے فوٹو بھی فراہم کیے گئے ہیں۔

۵۔ خفتگان کراچی۔ (اس میں لفظ خاک محذوف ہے)۔ ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب، لاہور، نومبر ۱۹۹۱ء

یہ کتاب بھی ''خفتگان خاک لاہور'' کے نہج پر مرتب کی گئی۔ کتاب کے پائین ایک ضمیمہ بعنوان ''رفتید و لے نہ از دل ما'' میں ان مشاہیر کی فہرست دی گئی ہے جن کی قبریں تو موجود ہیں مگر ان پر کتبے نہیں لگائے گئے۔ ان لوگوں نے اپنے بزرگوں کی قبور پر تو کتبے لگوائے مگر اپنے لیے جائز نہ سمجھا (سلفی عقیدے کی رو سے)۔ چند سطور آگے پروفیسر صاحب رقم طراز ہیں کہ ''مولانا تمنا

عمادی نے تو باقاعدہ یہ وصیت کی تھی کہ ان کی قبر پر نہ تو کتبہ لگایا جائے، نہ ہی اس پر دوبارہ مٹی ڈالی جائے اور نہ ہی کوئی ان کی قبر پر آئے۔ ایسی ہی وصیت توحید کے علم بردار ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی نے بھی کی تھی۔ اگر انہیں ایک روز کے لیے اختیار مل جاتا تو وہ پاکستان میں ایک بھی پکی قبر باقی نہ رہنے دیتے''۔ (ص ۳۵۱)

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

۶۔ وفیات مشاہیر پاکستان۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ستمبر ۱۹۹۰

یہ کتاب وفیات نگاری پر ہے اور اس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے مرحومین کی تواریخ وفات درج کی گئی ہیں اور ساتھ ہی دو چار سطری سوانحی خاکہ۔ یہ کتاب ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء سے ۱۴/اگست ۱۹۸۷ء تک وفات پانے والی پاکستانی شخصیات کا احاطہ کرتی ہے۔

۷۔ وفیات اعیان پاکستان۔ ندوۃ المصنفین ۹۵۰۔ این سمن آباد لاہور (مصنف کی رہائش گاہ) غیر مورخہ

اس کتاب کو ''وفیات مشاہیر پاکستان'' کا ضمیمہ سمجھنا چاہیے کیونکہ اس میں ۱۵۔ اگست ۱۹۸۷ء سے لے کر ۳۱ دسمبر ۱۹۹۰ء تک فوت ہونے والے ۶۰۰ مشاہیر کے کوائف جمع کر دیے گئے ہیں۔ پیش ازیں یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی لاہور کے مجلہ تاریخ میں بطور ایک مقالہ کے چھپ چکی ہے۔

۸۔ تاریخی مقالات۔ ندوۃ المصنفین، سمن آباد لاہور، ۱۹۷۰ء۔ (طبع ثانی ۱۹۹۱ء بک ٹاک، میاں چیمبرز، ٹمپل روڈ لاہور)

یہ کتاب مصنف کے تیرہ علمی، ادبی اور تحقیقی مقالات کے مجموعہ پر مشتمل ہے جو تاریخ، موسیقی، فن تعمیر، طب، مسکوکات اور سوانح جیسے اہم موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ان مقالات میں سے ایک مقالے میں فضل اللہ بن روزبہان اصفہانی کے ''رسالہ در حقیقت وانواع حدیث قدسی'' کا فارسی متن جب کہ ایک دوسرے مقالے میں سلطان فیروز شاہ تغلق کے رسالہ ''فتوحات فیروز شاہی'' کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ اسی طرح بقیہ مقالات بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ کتاب ایم اے کے نصاب میں شامل ہے۔ اس ایڈیشن میں (طبع ثانی) تین مضامین خارج کر کے ان کی جگہ تین نئے مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۹۔ سرمایۂ عمر (باتصویر)۔ ندوۃ المصنفین سمن آباد، لاہور، ۱۹۷۶ء

یہ کتاب بھی مصنف کے تیرہ تحقیقی وتاریخی مقالات کا مجموعہ ہے جس میں قرون وسطیٰ کے تمدنی حالات، مذہبی افکار اور ادبی رجحانات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ہونہار پوتے نے اپنے جد امجد چودھری حاجی عمر دین کے پچاسویں یوم ولادت کے موقع پر ان کی خدمت میں بطور ارمغان علمی پیش کی۔ علامہ محمد حسین عرشی نے قطعہ تاریخ کہا:

سرمایۂ عمر اسلم ما در شکل حروف گنج گوہر
فرمود سروش سال طبعش سرمایۂ عمر جام کوثر

۱۳۹۶ھ

یہ کتاب ایم اے کے نصاب میں شامل ہے۔

۱۰۔ مسلم کنڈکٹ آف سٹیٹ (انگریزی)۔ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد، (بتعاون یونیسکو) ۱۹۷۴ء

یہ کتاب سلوک الملوک (فارسی) مصنفہ فضل اللہ بن روزبہان اصفہانی (م ۱۵۲۱ء) کا انگریزی ترجمہ ہے جو مصنف کے دیگر علمی کارناموں میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب ایران کے نامور امیر عبیداللہ خان (م ۱۵۳۹ء) بن محمود چہارمین ازامرائے شیبانی کے لیے لکھی گئی۔ کتاب ایک مسلم ریاست کے انتظامی ڈھانچہ اور مسلم حکمرانوں کے لیے مکمل دستور فرمانروائی ہے جو شرعی مقتضیات کے مطابق ترتیب دی گئی ہے۔ پایان کتاب علامہ محمد حسین عرشی کا قطعہ تاریخ ترجمہ درج ہے جس کے مادہ ''باغ معارف'' سے سنہ اشاعت ۱۳۹۴ھ مستخرج ہوتا ہے۔

۱۱۔ ہیر وارث شاہ کی تاریخی اہمیت۔ گورونانک یونیورسٹی، امرتسر، ۱۹۸۰ء

پروفیسر صاحب کے اس تحقیقی مقالہ کو گورمکھی رسم الخط میں شائع کیا گیا ہے۔

۱۲۔ طہماس نامہ۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۸۶ء

یہ فارسی زبان کا خطی نسخہ ہے جس کا مصنف محکم الدولہ اعتقاد جنگ طہماس بیگ خاں بہادر رومی ہے۔ یہ تو ران سے آ کر لاہور میں نواب معین الملک معروف بہ میر منو کی سرکار میں چند روز رہا۔ اس کے بعد دلی میں نواب ضابطہ خاں اور نواب نجف خاں کے درباروں سے وابستہ رہا۔ یہ اردو کے مشہور شاعر سعادت یار خان رنگین کا والد ہے۔ ۱۷۳۸ء میں ترکی میں پیدا ہوا اور ۱۸۰۳ء میں دہلی میں وفات پائی۔ طہماس نامہ اس نے ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء میں مکمل کیا جس میں اس دور کے ملکی حالات قلم بند کیے ہیں۔ اسے پروفیسر صاحب نے بار اول ایڈٹ کر کے اہل علم کو روشناس کرایا۔

۱۳۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی۔ ندوۃ المصنفین، سمن آباد لاہور

(اس کا ایک ایڈیشن المعارف گنج بخش روڈ لاہور سے بھی شائع ہوا)

مندرجہ ذیل کتب تعلیمی نصاب کے لیے تصنیف کی گئیں:

۱۴۔ تاریخ پاکستان اور دنیائے اسلام (حصہ دوم) پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور ۱۹۷۴ء
(برائے انٹرمیڈیٹ لاہور)

۱۵۔ تاریخ پاکستان برائے میٹرک پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور ۱۹۷۷ء
(پنجاب وسندھ) باشتراک مس طاہرہ شاہ

۱۶۔ جدید دنیائے اسلام (باشتراک پروفیسر سید علی عباس) پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور

۱۷۔ تحریک پاکستان برائے ہائی کلاسز ریاض برادرز، اردو بازار لاہور ۱۹۹۸ء

۱۸۔ محمد بن قاسم اور اس کے جانشین ریاض برادرز، اردو بازار لاہور ۱۹۹۶ء

۱۹۔ وسط ایشیا کا شاندار ماضی

۲۰۔ لاہور تاریخ کے آئینہ میں

۲۱۔ تاریخ اسلامی ہند (عہد مغلیہ) بارھویں جماعت کے لیے

مندرجہ ذیل کتب پروفیسر صاحب کی تصحیح اور نظر ثانی کے بعد شائع ہوئیں:

۱۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ ڈاکٹر حنیف رضی ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۶۸ء
(طبع ثانی) ندوۃ المصنفین سمن آباد لاہور ۱۹۷۱ء

(اس ایڈیشن میں پروفیسر صاحب نے ''حرف آخر'' کے عنوان سے پانچ صفحات کا اضافہ کر دیا ہے)

۲۔ سید علی ہمدانی (مقالہ پی ایچ ڈی پنجاب یونیورسٹی)، سیدہ اشرف ظفر، ندوۃ المصنفین سمن آباد لاہور ۱۹۷۲ء

۳۔ فہرست مخطوطات شیرانی (جلد دوم) ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان لاہور

۴۔ کیٹلاگ کتب سیرت محمد احمد رائٹر گلڈ، لاہور

مضامین رسائل واخبارات:

۱۔ اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور جولائی ۱۹۹۷ء
(جولائی میں جدا ہونے والے ۱۷ اصحاب کے حالات)

۲۔ احسن الاقوال کی تاریخی اور سماجی اہمیت سہ ماہی اقبال ریویو، لاہور (اقبال نمبر) جنوری ۱۹۸۴ء

۳۔ احمد شاہ بٹالوی تے اوہدی تاریخ ہندوستان (پنجابی) ششماہی کھوج، لاہور جنوری ۱۹۸۱ء

۴۔ احوال آصف خان اورینٹل کالج میگزین، لاہور (ج ۶۰ شمارہ ۳، ۴)

۵۔ احوال وآثار اشرف جہانگیر سمنانی سہ ماہی اقبال، لاہور (اقبال نمبر) جولائی۔ اکتوبر ۱۹۸۳ء

۶۔ احوال وآثار حضرت شاہ عالم گجراتی مجلہ تاریخ وثقافت پاکستان اسلام آباد دسمبر ۱۹۸۲

۷۔ اذان کی حقیقت ۱۔ ماہنامہ جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ جون
۲۔ ماہنامہ بینات، کراچی جولائی ۱۹۸۸ء

۸۔ اسلامیہ کالج پشاور کے چند قلمی نوادر ماہنامہ الکتاب، لاہور جنوری ۱۹۷۳ء

۹۔ اسلامی ہند میں سکوں پر شاعری

۱۰۔ اصغر وجگر کا پیر خانہ ماہنامہ قومی زبان کراچی ستمبر ۱۹۸۴ء

۱۱۔ اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ والی افغانستان کے دو نادر اردو خطوط مارچ ۱۹۸۲ء

۱۲۔ افتتاحیہ (سلطان شہید ٹیپو اور مذہبی رواداری از بشمبر ناتھ پانڈے) ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور ستمبر ۱۹۹۸ء

۱۳۔ اقبال کا ایک نادر خط سہ ماہی اقبال ریویو، لاہور جولائی ۱۹۸۰ء

۱۴۔ اکبر اور نقطوی تحریک ماہنامہ الفرقان، لکھنو جولائی ۱۹۶۹ء

۱۵۔ اکبر کا دین الٰہی اور اس کا پس منظر ۱۔ ماہنامہ المعارف، لاہور جنوری ۱۹۶۹ء
۲۔ ماہنامہ الفرقان، لکھنو اپریل ۱۹۶۹ء

۱۶۔	البیرونی اور علم جغرافیہ (کنگرس عالمی ابوریحان البیرونی پاکستان، ۲۶ نومبر تا ۱۲ دسمبر ۱۹۷۳ء)	ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کراچی	دسمبر ۱۹۷۳ء
۱۷۔	الدر المنظوم کی تاریخی، مذہبی اور سماجی اہمیت	سہ ماہی اقبال ریویو، لاہور	جولائی ۱۹۸۴ء
۱۸۔	الواح الصنادید	ماہنامہ برہان دہلی	جولائی ۱۹۸۲ء
	الواح الصنادید	ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ	اگست ۱۹۸۲ء
	الواح الصنادید	ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ	اکتوبر ۱۹۸۲ء
	الواح الصنادید	ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ	جون ۱۹۸۳ء
	الواح الصنادید	ماہنامہ برہان، دہلی	اگست ۱۹۸۳
	الواح الصنادید	ماہنامہ برہان، دہلی	اکتوبر ۱۹۸۳ء
	الواح الصنادید	ماہنامہ برہان، دہلی	اپریل ۱۹۸۴ء
	الواح الصنادید	ماہنامہ برہان، دہلی	نومبر ۱۹۸۴ء
	الواح الصنادید	ماہنامہ برہان، دہلی	اکتوبر ۱۹۸۵ء
	الواح الصنادید	ماہنامہ برہان، دہلی	اپریل ۱۹۸۶ء
	الواح الصنادید	ماہنامہ برہان، دہلی	اکتوبر ۱۹۸۶ء
	الواح الصنادید	ماہنامہ برہان، دہلی	نومبر ۱۹۸۷ء
	الواح الصنادید	ماہنامہ برہان، دہلی	فروری ۱۹۸۸ء
	الواح الصنادید	ماہنامہ برہان، دہلی	جولائی ۱۹۸۸ء
۱۹۔	الواح الصنادید دیوبند	ماہنامہ بینات، کراچی	اپریل ۱۹۸۴ء
۲۰۔	الواح الصنادید علی گڑھ	سہ ماہی العلم، کراچی	مارچ ۱۹۸۴ء
۲۱۔	ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کا مقام قرآن حکیم کی روشنی میں	۱۔ ہفت روزہ الاسلام، گوجرانوالہ ۲۔ تہذیب الاخلاق، لاہور	۲۰ اکتوبر ۱۹۷۸ء جون ۱۹۹۸ء
۲۲۔	امام الہدی ابواللیث سمرقندی (مسودہ)		۴ نومبر ۱۹۹۴ء
۲۳۔	امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی کا ایک نادر خط	ماہنامہ المعارف لاہور	جون ۱۹۹۲ء
۲۴۔	انگلستان میں علوم شرقیہ کا ایک عظیم ادارہ	ماہنامہ حرم لاہور	۱۹۵۹ء
۲۵۔	اورنگزیب کی تخت نشینی میں علماء و مشائخ کا کردار	ماہنامہ المعارف، لاہور	اگست ۱۹۶۸ء
۲۶۔	ایک تمبا کو فروش (میاں عطا محمد بٹ دہلوی) کا اردو ادب میں ذکر	ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور	ستمبر ۱۹۹۷ء
۲۷۔	ایم اسلم۔ شخصیت اور فن	ماہنامہ جامعہ، دہلی	اکتوبر ۱۹۸۴ء

۲۸۔	اے مجموعہ خوبی بہ چہ نامت خوانم	ماہنامہ برہان، دہلی	ستمبر ۱۹۸۸ء
۲۹۔	بحرالمیت	ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، لاہور	نومبر ۱۹۷۲ء
۳۰۔	برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی آمد اور تبلیغ دین	ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک	جولائی ۱۹۹۳ء
۳۱۔	برصغیر کی تاریخ کے حوالے سے فارسی کی اہمیت (مشمولہ ہشت سخن مرکز ساجد اللہ تفہیمی۔ بخش فارسی)	دانش گاہ، کراچی	۱۹۹۴ء
۳۲۔	برصغیر میں مسلم معاشرہ کی تشکیل اور ارتقاء	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد	۱۹۸۲ء
۳۳۔	برطانیہ میں علوم اسلامیہ	مجلس، لاہور	
۳۴۔	بشمبر ناتھ پانڈے الہ آبادی (نظم: کیا عالمگیر اورنگزیب ہندو کش تھا۔ تعارفی خاکہ)	ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور	جون ۱۹۹۸ء
۳۵۔	بلخ۔ تاریخ کے آئینے میں	ماہنامہ سیارہ لاہور (خاص اشاعت ۳۹) سالنامہ	۱۹۹۵ء
۳۶۔	بھارت کا ایک تازہ سفرنامہ	ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک	جون ۱۹۸۴ء
	بھارت کا ایک تازہ سفرنامہ	ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک	نومبر ۱۹۸۴ء
	بھارت کا ایک تازہ سفرنامہ	ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک	دسمبر ۱۹۸۴ء
	بھارت کا ایک تازہ سفرنامہ	ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک	اپریل ۱۹۸۵ء
	بھارت کا ایک تازہ سفرنامہ	ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک	اکتوبر ۱۹۸۵ء
۳۷۔	بہاء الدین زکریا ملتانی	ایشیا ویکلی، برمنگھم	۱۱۶ اپریل ۱۹۶۵ء
۳۸۔	بہشتی مقبرے میں چند لمحے	ہفت روزہ ختم نبوت، کراچی	۲۷ اگست ۱۹۸۲ء
۳۹۔	بیدم وارثی (نعت رسول مقبول۔ تعارفی خاکہ)	ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور	جون ۱۹۹۸ء
۴۰۔	بیگم پورہ اور اس کے اطراف	ماہنامہ نقوش، لاہور	شمارہ نمبر ۱۳۹ (سالنامہ)
۴۱۔	بیگم پورہ لاہور کے آثار قدیمہ (نقوش ایوارڈ یافتہ)	ماہ نامہ نقوش، لاہور	شمارہ نمبر ۱۳۸ (سالنامہ)
۴۲۔	بین الاقوامی تعلقات میں شائستگی اور تہذیب کے علمبردار		
۴۳۔	پاکستان میں پیشہ تدریس کا مقام	سہ ماہی تعلیمی زاویے، لاہور	جولائی ۱۹۹۵ء
۴۴۔	پانی پت	ماہنامہ صدف۔ حضرو	فروری مارچ ۱۹۹۵ء
۴۵۔	پروفیسر ڈاکٹر چودھری غلام علی (اجڑا گھر۔ تعارفی خاکہ)	ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور	ستمبر ۱۹۹۸ء
۴۶۔	پروفیسر عاشق محمد غوری (تضمین۔ روح غالب سے معذرت کے ساتھ۔ تعارفی خاکہ)		ستمبر ۱۹۹۸ء
۴۷۔	پنجابی تے گجراتی دی لفظاولی وی کجھ سانجھ (پنجابی)	ششماہی کھوج، لاہور	جنوری۔ جون ۱۹۸۰ء
۴۸۔	پیر سید محمد شاہ، ایک عظیم مصنف، ایک عظیم مبلغ	ہفت روزہ جہاں نما، لاہور	۳۱ دسمبر ۱۹۶۸ء
۴۹۔	پیر محمد شاہ اور ان کا نادر کتب خانہ	ماہنامہ المعارف، لاہور	دسمبر ۱۹۶۸ء

۵۰۔ تاریخ شاہجہاں — ماہنامہ برہان، دہلی — فروری ۱۹۸۱ء

۵۱۔ تاریخ عرب بقلم عجم

۵۲۔ تاریخ ہندوستان اور اس کا مصنف — ماہنامہ برہان، دہلی — ستمبر ۱۹۷۸ء

۵۳۔ تحریک پاکستان اور دو قومی نظریہ — ۱۔ مجلہ حریم ادب اپوا کالج لاہور — گولڈن جوبلی نمبر
۲۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور مئی ۱۹۹۷ء

۵۴۔ تحریک پاکستان کا پس منظر — مجلہ برگ گل۔ اردو کالج کراچی (قائداعظم نمبر) — ۱۹۷۶ء

۵۵۔ تحریک خلافت — ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور — نومبر ۱۹۹۷ء

۵۶۔ تحریک ریشمی رومال — ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور — ستمبر ۱۹۹۷ء

۵۷۔ تحفۃ السعداء — ماہنامہ المعارف، لاہور — مارچ ۱۹۸۲ء

۵۸۔ تذکرۃ الشیخ والخدم — ماہنامہ المعارف، لاہور — اکتوبر ۱۹۷۳ء

۵۹۔ تذکرہ ماہ وسال (مالک رام) ایک مطالعہ — ماہنامہ سیارہ لاہور (اشاعت ۳۳) سالنامہ ۱۹۹۳ء

۶۰۔ تصوف کا ارتقاء اور برصغیر میں سہروردی بزرگوں کی خدمات — مجلہ گل آفتاب۔ گورنمنٹ کالج بھائی پھیرو ۹۱۔۱۹۹۰

۶۱۔ تفسیر بحر مواج کا اجمالی تعارف — ماہنامہ حکمت قرآن، لاہور — جون ۱۹۸۴ء

۶۲۔ تقسیم ہند کی تجاویز — ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور — اگست ۱۹۹۷ء

۶۳۔ جناب حکیم سید ظل الرحمٰن کے عظیم علمی کارنامے — ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور — اپریل ۱۹۹۷ء

۶۴۔ جہاں آرا بیگم — ماہنامہ سیارہ، لاہور

۶۵۔ جہانگیر کی تخت نشینی میں راسخ العقیدہ امراء کا کردار

۶۶۔ جہانگیر کی تخت نشینی میں علماء ومشائخ کا کردار — ماہنامہ بینات، کراچی — ستمبر ۱۹۷۵ء

۶۷۔ چند قلمی نوادرات — ۱۔ ماہنامہ الکتاب، لاہور — نومبر ۱۹۷۲ء
۲۔ ماہنامہ انوار مدینہ، لاہور — (۱) دسمبر ۱۹۷۲ء
(۲) جنوری ۱۹۷۳ء

۶۸۔ چند یادیں، چند تاثرات۔ مشمولہ یاد وحید (مولانا وحید الدین احمد خان کے احوال، افکار اور آثار) از ڈاکٹر شعائر اللہ خان

۶۹۔ چودھری برہم ناتھ دت قاصر (نعت۔ تعارفی خاکہ) — ماہنامہ تہذیب الاخلاق۔ لاہور — اگست ۱۹۹۸ء

۷۰۔ چودھری عبدالغفور مرحوم، شخصیت وکردار — ۱۔ ماہنامہ جامعہ، نئی دہلی — مئی ۱۹۸۸ء
۲۔ الانسان، کراچی — جون ۱۹۸۸ء

۷۱۔ حاجی عبداللہ قادری — ماہنامہ برہان، دہلی — اگست ۱۹۸۲ء

۷۲۔ حدیث وتاریخ کا باہمی ربط اور امتیاز — ماہنامہ المعارف، لاہور — دسمبر ۱۹۷۸ء

۷۳۔ حسنت جمیع خصالہ — ۱۔ مجلہ حریم ادب، اپوا کالج لاہور — ۱۹۹۱ء
۲۔ ہفت روزہ خدام الدین، لاہور — ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۲ء
۳۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور — (۱) جولائی ۱۹۹۷ء
(۲) اگست ۱۹۹۷ء

۷۴۔ حضرت امیر مینائی شیعہ نہیں تھے (مراسلہ) — ہفت روزہ خدام الدین لاہور — ۲۹ اپریل ۱۹۸۸ء
(خدام الدین لاہور کے شمارہ مورخہ ۱۱ مارچ ۱۹۸۸ء میں شائع شدہ مضمون ''کونڈے ایک قبیح رسم'' از محمد آصف پر تنقید)

۷۵۔ حضرت ایشاںؒ لاہوری کا ایک نایاب تذکرہ — سہ ماہی اردو، کراچی — ج ۲ شمارہ ۲، ۱۹۸۰ء

۷۶۔ حضرت بابا فرید کا آبائی وطن — ماہنامہ المعارف، لاہور — جولائی ۱۹۸۳ء

۷۷۔ حضرت بقا نظامی عظیم آبادی (نعت رسول مقبول۔ تعارفی خاکہ) ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور جولائی ۱۹۹۸ء

۷۸۔ حضرت شاہ ابو اسحٰق قادری کی ایک نادر تصنیف۔ رسالہ ناطقہ اورینٹل کالج میگزین لاہور — دسمبر ۱۹۸۲ء

۷۹۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور جہانگیر — ماہنامہ الولی، حیدرآباد — فروری۔ مارچ ۱۹۷۵

۸۰۔ حضرت مجدد الف ثانی کا ایک نادر تذکرہ — ۱۔ ماہنامہ المعارف لاہور — جنوری ۱۹۸۲ء
۲۔ ماہنامہ بینات، کراچی — جنوری ۱۹۸۲
۳۔ ماہنامہ انوار مدینہ، لاہور — نومبر ۱۹۹۳ء

۸۱۔ حضرت مخدوم شاہ مینا لکھنوی۔ احوال وآثار — اورینٹل کالج میگزین لاہور — فروری ۱۹۷۹ء

۸۲۔ حضور نبی کریم ﷺ کا اسلوب سیاست — ماہنامہ انوار مدینہ، لاہور — نومبر ۱۹۹۳ء

۸۳۔ حفیظ جالندھری اور کشمیر — ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور — جون ۱۹۹۷ء

۸۴۔ خانوادہ غالبؔ — فروری ۱۹۹۷ء

۸۵۔ خزانہ جواہر جلالیہ — مجلہ شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی — ۱۹۸۴ء

۸۶۔ خلیفہ عبدالحکیم۔ چند یادیں چند تاثرات — ماہنامہ جامعہ دہلی — مئی ۱۹۸۴ء

۸۷۔ خواجہ باقی باللہ دہلوی کی سیرت — ماہنامہ حقیقت اسلام لاہور — مئی ۱۹۵۷ء

۸۸۔ خواجہ محمد ہاشم کشمی — ماہنامہ المعارف لاہور — مئی ۱۹۶۸ء

۸۹۔ خوان پر نعمت — اپریل ۱۹۸۳ء

۹۰۔ خیر المجالس کی سیاسی اور تہذیبی اہمیت — حریم ادب۔ اپوا کالج برائے خواتین لاہور — ۱۹۹۴ء

۹۱۔ داتا گنج بخش کی لاہور میں آمد — ماہنامہ دارالفرقان، لاہور — مارچ ۱۹۵۷ء

(پروفیسر محمد اسلم صاحب کی گوت چند پال تھی۔ اس حوالہ سے ان کے بعض مضامین اس

رسالہ میں اسلم چند پال کے نام سے بھی چھپے۔)

۹۲۔ دارا شکوہ کے مذہبی رجحانات — ماہنامہ المعارف لاہور — جولائی ۱۹۷۵ء

۹۳۔ درس نظامی کی تاریخی، دینی اور سماجی اہمیت — ماہنامہ برہان، دہلی — ستمبر ۱۹۸۴ء

۹۴۔ دنیا کا قدیم ترین تمدن قرآن پاک کی روشنی میں — ۱۔ روزنامہ شہباز، پشاور — ۲۰ نومبر ۱۹۵۶

۲۔ ماہنامہ دارالفرقان، لاہور — ستمبر ۱۹۵۷ء

۹۵۔ دور اکبر میں موسیقی اور موسیقار

۹۶۔ دوقومی نظریہ — ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور — مئی ۱۹۹۷ء

۹۷۔ دہلی کا تازہ سفرنامہ (۱) — ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک — اکتوبر ۱۹۸۳ء

دہلی کا تازہ سفرنامہ (۲) — ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک — نومبر ۱۹۸۳ء

دہلی کا تازہ سفرنامہ (۳) — ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک — دسمبر ۱۹۸۳ء

دہلی کا تازہ سفرنامہ (۴) — ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک — جنوری ۱۹۸۴ء

دہلی کا تازہ سفرنامہ (۵) — ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک — فروری ۱۹۸۴ء

دہلی کا تازہ سفرنامہ (۶) — ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک — مئی ۱۹۸۴ء

۹۸۔ دیال سنگھ کالج لاہور میں میرا زمانہ طالب علمی — ماہنامہ جامعہ دہلی — جون ۱۹۸۵ء

۹۹۔ دیوان خواجہ معین الدین اجمیری — مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ — ۸۷۔۱۹۸۰ء

(ج ۱۳، شمارہ ۲۔۱)

۱۰۰۔ دیوان معین (تلخیص) — رسالہ تحقیق، سندھ یونیورسٹی جامشورو ۹۷۔۱۹۹۶ء

(شمارہ ۱۰۔۱۱)

۱۰۱۔ دیوبند میں دو روز — ماہنامہ بینات، کراچی — مارچ ۱۹۷۹ء

۱۰۲۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی۔ فن اور شخصیت — ماہنامہ برہان، دہلی — مارچ ۱۹۸۵ء

۱۰۳۔ ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی — روزنامہ مشرق لاہور — ۲۴ جنوری ۱۹۸۱ء

۱۰۴۔ ڈاکٹر منیر الدین چغتائی (غزل۔ تعارفی خاکہ) — ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور — اکتوبر ۱۹۹۸ء

۱۰۵۔ ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کر (فروری کی ۱۳ مرحوم شخصیات) — فروری ۱۹۹۸ء

۱۰۶۔ رسالہ صاحبیہ (اردو ترجمہ مع متن فارسی) — جرنل ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان جنوری ۱۹۸۰ء

۱۰۷۔ رفتید و لے نہ از دل ما — ماہنامہ بینات، کراچی — ستمبر ۱۹۷۹ء

۱۰۸۔ (اپریل میں رحلت کرنے والے ۱۷ اصحاب کے حالات) — ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور — اپریل ۱۹۹۷ء

۱۰۹۔ روح تصوف — مارچ ۱۹۹۷ء

۱۱۰۔ ردولی سے اعظم گڑھ تک — سہ ماہی العلم، کراچی — جنوری۔ مارچ ۱۹۸۱ء

۱۱۱۔ زمین کھا گی آسماں کیسے کیسے — ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور — اگست ۱۹۹۷ء

(اگست میں وفات پانے والی ۱۲ شخصیات)

۱۱۲۔ سرسید احمد خاں اور شاہ غلام علی دہلوی — ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور — مارچ ۱۹۹۷ء

۱۱۳۔ سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک — ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور — مارچ ۱۹۹۷ء

۱۱۴۔ سرسید احمد خاں اور ہومیو پیتھی (از افادات قاضی عارف حسین) — ۔ایضاً۔ — نومبر ۱۹۹۷ء

۱۱۵۔ سرسید اور یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن از محمد یوسف عباسی (اردو ترجمہ) — مارچ ۱۹۹۸ء

۱۱۶۔ سرسید کے ایک مخالف کا انجام (محرم علی چشتی) — ۔ایضاً۔ — دسمبر ۱۹۹۷ء

۱۱۷۔ سرکاری ملازمین کی گروپ انشورنس — سہ ماہی منہاج دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور، جولائی ۱۹۹۱ء

(پیش کردہ وفاقی شریعت کورٹ۔ شامی و مصری علماء کی آراء کی روشنی میں)

۱۱۸۔ سرور الصدور — جرنل پنجاب یونیورسٹی ہسٹاریکل سوسائٹی، جنوری ۱۹۷۷ء

۱۱۹۔ سفرنامہ بالاکوٹ — دسمبر

۱۲۰۔ سکندر لودھی کا ذوق موسیقی — ماہنامہ المعارف، لاہور — نومبر ۱۹۷۱ء

۱۲۱۔ سلاطین دہلی کی مذہبی رواداری — ۔ایضاً۔ — اکتوبر ۱۹۷۲ء

۱۲۲۔ سلطان علاء الدین کے دو نقرئی تنکے — ماہنامہ جامعہ دہلی — فروری ۱۹۸۶ء

(یہ مضمون انگریزی میں پیشتر ازیں پنجاب یونیورسٹی کے مجلہ شعبہ تاریخ ۱۹۸۴ء میں چھپ چکا ہے)

۱۲۳۔ سنت رسول اور جدید سائنس — روزنامہ شہباز، پشاور — ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۶

۱۲۴۔ سید وارث شاہ کے عہد میں پنجاب کی سیاسی حالت — جرنل آف دی پنجاب یونیورسٹی ہسٹاریکل سوسائٹی — جنوری۔ ستمبر ۱۹۸۵ء

۱۲۵۔ سیدہ ام کلثوم بنت علیؓ — ہفت روزہ الاسلام، گوجرانوالہ — ۱۲ مئی ۱۹۷۸ء

۱۲۶۔ سیرت النبی کے مطالعہ کی وسعت — ۱۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور — ۹ جون ۱۹۶۸ء

۲۔ ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ لاہور — نومبر ۱۹۷۳ء

(رسول نمبر)

۱۲۷۔ سیرت پاک کا مطالعہ — ۱۔ روزنامہ شہباز، پشاور — ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۶

۲۔ ماہنامہ الحبیب، لاہور — مارچ ۱۹۷۰ء

۱۲۸۔ سیرت فیروز شاہی — مجلہ تحقیق، اورینٹل کالج لاہور — دسمبر ۱۹۸۲ء

۱۲۹۔ شاد باش اے سرزمین دیوبند — ماہنامہ بینات، کراچی — ستمبر ۱۹۸۰

۱۳۰۔ شاہ ابوالمعالی کی شاعری — ماہنامہ دارالفرقان، لاہور — نومبر ۱۹۵۶ء

۱۳۱۔ شاہان مغلیہ کا ذوق موسیقی

۱۳۲۔ شاہجہان پادشاہ دیں پرور — ماہنامہ المعارف، لاہور — دسمبر ۱۹۷۴ء

۱۳۳۔ شاہجہان کا ذوق موسیقی — روزنامہ انجام، پشاور — ۱۸ دسمبر ۱۹۵۶ء

۱۳۴۔ شاہجہان کی مذہبی پالیسی (۱) — روزنامہ شہباز، پشاور — ۸ جنوری ۱۹۵۷

۱۳۵۔ شاہ عبدالرزاق بانسوی — ماہنامہ بینات، کراچی — اکتوبر ۱۹۸۲ء

۱۳۶۔ شاہ غلام علی دہلوی کے ملفوظات درالمعارف کی تاریخی، دینی اور سماجی اہمیت — ماہنامہ المعارف، لاہور (۱) — ستمبر ۱۹۸۳

ماہنامہ المعارف، لاہور (۲) — اکتوبر ۱۹۸۳

ماہنامہ المعارف، لاہور (۳) — نومبر ۱۹۸۳

۱۳۷۔ شاہ فتح اللہ شیرازی (مغلیہ دور کا ایک نامور مکینک) — ۱۔ سہ ماہی صحیفہ لاہور — جولائی ۱۹۷۳ء

۲۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور — اکتوبر ۱۹۹۸ء

۱۳۸۔ شاہ فضل اللہ انگیلانی کے چند نادر خط (سات عدد) — ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک — مئی ۱۹۸۲ء

۱۳۹۔ شاہ محمد جعفر پھلواروی، یادیں اور تاثرات — ماہنامہ جامعہ دہلی — جنوری ۱۹۸۵ء

۱۴۰۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور مسلمانان جنوبی ایشیا کی نشاۃ ثانیہ — ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور — فروری ۱۹۹۷ء

۱۴۱۔ شریف التواریخ (جلد اول) از شریف احمد شرافت نوشاہی — ماہنامہ برہان دہلی — نومبر ۱۹۸۲

ادارہ معارف نوشاہیہ ساہن پال شریف ضلع گجرات ۱۹۷۹ء پر تنقید (قسط اول)

(قسط دوم) — دسمبر ۱۹۸۲ء

(قسط سوم) — جنوری ۱۹۸۳ء

(قسط چہارم) — فروری ۱۹۸۳ء

(قسط پنجم) — جون ۱۹۸۳ء

۱۴۲۔ شہزادی زیب النساء کی قبر از برق دہلوی (حالات زیب النساء) — ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور، جولائی ۱۹۹۸ء

۱۴۳۔ شیخ احمد کھٹو گنج بخش — جرنل ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان — اپریل ۱۹۷۹ء

۱۴۴۔ شیخ سعدالدین خیرآبادی — ماہنامہ برہان، دہلی — فروری ۱۹۸۰ء

۱۴۵۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی — ۱۔ ماہنامہ حقیقت اسلام، لاہور — جون ۱۹۵۷ء

۲۔ ہفت روزہ جہاں نما، لاہور (۱) — ۴ نومبر ۱۹۶۷ء

۲۔ ہفت روزہ جہاں نما، لاہور (۲) — ۱۱ نومبر ۱۹۶۷ء

۱۴۶۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ذوق سخن — ماہنامہ دارالفرقان، لاہور — اپریل ۱۹۵۷ء

۱۴۷۔ شیراز ہند جونپور میں ایک روز — ۱۔ ماہنامہ الولی، حیدرآباد — مارچ ۱۹۷۹ء

۱۴۸۔ طہماس بیگ خاں — جرنل آف دی پنجاب یونیورسٹی ہسٹاریکل سوسائٹی — اکتوبر۔دسمبر ۱۹۸۶ء

۱۴۹۔ عبدالقدوس گنگوہی کے ملفوظات "لطائف قدوسی" کی تاریخی اہمیت — ۱۔ جرنل آف دی پنجاب یونیورسٹی ہسٹاریکل سوسائٹی — اپریل ۱۹۷۷

۲۔ ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک (۳) — نومبر ۱۹۷۸

۱۵۰۔ عبیداللہ ازبک

۱۵۱۔ عبیداللہ سندھی کے سیاسی مکتوبات (بنام اقبال شیدائی متوفی ۱۹۷۴۔۰۱۔۱۳) — ۱۔ مجلہ شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ — ۲۔ ماہنامہ حکمت قرآن، لاہور — نومبر ۱۹۸۶ء

(یہ مجموعہ مکاتیب بعد میں کتابی صورت میں ندوۃ المصنفین سمن آباد لاہور نے شائع کیا جس کا آخری صفحہ نمبر ۹۲ سادہ تھا۔ دوسرے ایڈیشن میں اس صفحہ کی جگہ مولانا عبیداللہ سندھی کی تصویر نے لے لی جب کہ تیسرے ایڈیشن میں تصویر کے بجائے مولانا عبیداللہ سندھی کے ایک مکتوب کا عکس چھاپ دیا گیا۔ پھر یہ مجموعہ مزید حواشی کے اضافوں کے ساتھ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری صاحب نے اپنے مرتبہ "مکاتیب مولانا عبیداللہ سندھی" میں شامل کرلیا جسے عبیداللہ سندھی اکیڈمی پاکستان، کراچی نے ۱۹۹۷ء میں شائع کردیا۔)

۱۵۲۔ عربوں کے عہد میں سندھ میں تہذیب وثقافت — ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور — فروری ۱۹۹۷ء

۱۵۳۔ عربوں کے عہد میں سندھ میں علم وادب — ماہنامہ برہان دہلی — جولائی ۱۹۷۴ء

۱۵۴۔ عظیم آباد پٹنہ میں چار روز — ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک — دسمبر ۱۹۸۳ء

۱۵۵۔ علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد کا سیاسی اور سماجی پس منظر

(علامہ اقبال سیمینار منعقدہ ملتان یونیورسٹی میں مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۷۷ء کو پڑھا گیا)

۱۵۶۔ علی گڑھ اور دیوبند کے روابط — ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور — مارچ ۱۹۹۸ء

۱۵۷۔ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام عید ملن پارٹی اور مشاعرہ (رپورتنگ) — مئی ۱۹۹۸ء

۱۵۸۔ علی گڑھ میں چند روز (۱) — ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک — فروری ۱۹۸۳ء

علی گڑھ میں چند روز (۲) — ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک — اپریل ۱۹۸۳ء

علی گڑھ میں چند روز (۳) — ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک — اکتوبر ۱۹۸۳ء

۱۵۹۔ عورت کے حکمران بننے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں — ماہنامہ الولی، حیدرآباد سندھ — جنوری ۱۹۸۹ء

۱۶۰۔ عہد اورنگزیب میں موسیقی اور موسیقار (مشمولہ نذر مختار مرتبہ مالک رام) — مجلس نذر مختار، نئی دہلی — ۱۹۶۸ء

۱۶۱۔ عہد مغلیہ میں لاہور کا ایک پرشکوہ محلہ (محلہ شاہ کا کوچشتی) — ماہنامہ دارالفرقان لاہور — ۱۹۵۸ء

۱۶۲۔ غلطی ہائے مضامین نہ پوچھ — مجلہ حریم ادب، اپوا کالج برائے خواتین لاہور — ۱۹۹۲ء

۱۶۳۔ فتاویٰ نقشبندیہ — ماہنامہ المعارف لاہور — فروری ۱۹۸۲ء

۱۶۴۔ فتوحات فیروز شاہی (اردو ترجمہ)

۱۶۵۔ فدا صاحب اوران کا فن — ماہنامہ مہر و ماہ لاہور — اگست ۱۹۹۹ء
اشاعت خاص (تذکار فدا)

۱۶۶۔ فرانسیسی تحریک — ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور — جون ۱۹۹۷ء

۱۶۷۔ فضل اللہ بن روزبہان اوران کا ایک نادر رسالہ — ماہنامہ المعارف لاہور — اپریل ۱۹۶۸ء

۱۶۸۔ فوائد الفواد کی تاریخی وسماجی اہمیت — ششماہی مجلہ تاریخ وثقافت اسلام آباد اپریل۔ستمبر ۱۹۹۳ء

۱۶۹۔ فوائد فیروز شاہی — ماہنامہ بینات کراچی — فروری ۱۹۸۳ء

۱۷۰۔ فیروز تغلق کا ذوق موسیقی — ماہنامہ المعارف لاہور — اکتوبر ۱۹۷۱

۱۷۱۔ قاضی ابوالخیال امانت علی تسکیں بٹالوی (غزل۔تعارفی خاکہ) ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور — اکتوبر ۱۹۹۸ء

۱۷۲۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی (نظم: سید القوم خادمہم۔تعارفی خاکہ) — جون ۱۹۹۸ء

۱۷۳۔ قاضی عزیز احمد بلگرامی کا ہندو مسلم اتحاد پر کھلا خط — ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور — اگست ۱۹۹۷ء
مہاتما گاندھی کے نام (تعارف)

۱۷۴۔ قاضی محمود بحری — پندرہ روزہ راز و نیاز، کراچی — یکم تا ۱۵ دسمبر ۱۹۵۶ء

۱۷۵۔ قبرستان میانی صاحب میں ایک مرتد کی قبر — ہفت روزہ ختم نبوت انٹرنیشنل کراچی ۴ تا ۱۰ دسمبر ۱۹۸۸ء
(مولوی شیخ مجید متوفی ۲ رجنوری ۱۹۲۹ء یکے از اصحاب مسیح موعود)

۱۷۶۔ قرآن کا معاشرتی نظام — ۱۔ ماہنامہ میثاق لاہور — جون ۱۹۷۹ء
۲۔ سہ ماہی تعلیمی زاویے، لاہور — اکتوبر ۱۹۹۵ء

۱۷۷۔ قرارداد لاہور (پاکستان) — ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور — مارچ ۱۹۹۴ء

۱۷۸۔ قرون وسطیٰ میں ایران میں نظام آب رسانی و آبپاشی — مجلس ادبیات مشرق، لاہور — ۱۹۹۸ء
(مشمولہ ارمغان علمی)

۱۷۹۔ کانگرس کے راج میں مسلمانوں پر مظالم کی انتہا — ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور — جنوری ۱۹۹۸ء

۱۸۰۔ کتب خانہ اسلامیہ کالج لاہور کی نادر قلمی تفاسیر — ماہنامہ روح اسلام، لاہور — اکتوبر ۱۹۷۲ء

۱۸۱۔ کچھ ظفر عمر کے بارے میں — ماہنامہ قومی زبان، کراچی — اکتوبر ۱۹۹۴ء

۱۸۲۔ کلام اقبال کی تاثیر موقع ومحل کے اعتبار سے — ۱۔ ماہنامہ برہان، دہلی — ۱۹۸۰ء
۲۔ سہ ماہی الزبیر، بہاولپور — ۱۹۹۵ء
۳۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۱۹۹۷ء

۱۸۳۔ کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا — ماہنامہ برہان، دہلی — مارچ ۱۹۸۶ء

۱۸۴۔ کیا سلطان بلبن کی کوئی بیٹی بابا فرید الدین گنج شکر سے منسوب تھی؟ ماہنامہ برہان، دہلی — جولائی ۱۹۶۸ء

۱۸۵۔ کیا قافلہ جاتا ہے (ستمبر میں وفات پانے والے ۱۵ اصحاب کے حالات) — ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور — ستمبر ۱۹۹۷ء

۱۸۶۔ گردوپیش — ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور — نومبر ۱۹۹۷ء
(جناب سعید اختر بھوپالی اور جناب عشرت حسین کراچی کے اعزاز میں نیا علی گڑھ ہائر سیکنڈری پبلک سکول گلبرگ میں جناب غلام معین الدین صابری سیکرٹری تہذیب الاخلاق ٹرسٹ لاہور کی طرف سے دیے گئے عصرانے مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۹۷ء کی روداد)

۱۸۷۔ لاہور شہر کی تاریخی عمارتوں کے نقوش مٹتے جا رہے ہیں (سروے رپورٹ) روزنامہ جنگ لاہور ۱۴ اپریل ۱۹۹۸ء

۱۸۸۔ لاہور کے چڑیا گھر میں چند لمحے — (۱) — ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور — اگست ۱۹۹۸ء
(۲) — ایضاً — ستمبر ۱۹۹۸ء

۱۸۹۔ لکھنو سے بنارس تک — ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک — اکتوبر ۱۹۸۲ء
ایضاً — ایضاً — دسمبر ۱۹۸۲ء

۱۹۰۔ لکھنو میں تین روز — سہ ماہی العلم، کراچی — اپریل تا جون ۱۹۸۲ء
مضمون ہذا پر تبصرہ کے لیے دیکھیے سہ ماہی العلم کراچی جولائی تا ستمبر ۱۹۸۳ء)

۱۹۱۔ لکھنو میں دو روز — ماہنامہ البلاغ، کراچی — مارچ، اپریل ۱۹۸۰ء

۱۹۲۔ لیاقت علی کے اصلی خدوخال — روزنامہ شہباز، پشاور — ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۶

۱۹۳۔ مالک رام کے مذہب کے بارے میں (مسودہ)

۱۹۴۔ مبلغ الرجال — ماہنامہ برہان، دہلی — مئی ۱۹۶۹ء

۱۹۵۔ محسن الملک سید مہدی علی — ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور — اکتوبر ۱۹۹۷ء

۱۹۶۔ محمد بن عبدالوہاب — ماہنامہ جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ — ستمبر ۱۹۸۴ء

۱۹۷۔ محمد رسول اللہ والذین معہ' — مجلہ مطلع نو، بہاول پور (صحابہ نمبر) — جون ۱۹۸۲ء

۱۹۸۔ مذہبی رواداری — ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور — اپریل ۱۹۹۷ء

۱۹۹۔ مسجد قبا سے تاج محل تک — ماہنامہ دارالفرقان، لاہور — جنوری ۱۹۵۷ء

۲۰۰۔ مسلمانوں کی جغرافیائی خدمات

۲۰۱۔ مسلمانوں کی طبی خدمات

۲۰۲۔ مسلم دور حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کی چیرہ دستیاں — (۱) ہفت روزہ خدام الدین، لاہور — ۷ جنوری ۱۹۹۴ء

۲۰۳۔ مسلم ریاست کا قیام (۲) (۱۲۰۶ء۔۱۵۲۶ء) — علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد — ۱۹۸۸ء
(مشمولہ تاریخ برصغیر انٹرمیڈیٹ)

۲۰۴۔ مشاہیر کی قبروں کے کتبے (۱) سہ ماہی العلم، کراچی جنوری۔ مارچ ۱۹۸۳
(۲) ۔ایضاً۔ جنوری۔ مارچ ۱۹۸۴
۲۰۵۔ معارج الکمال ماہنامہ قومی زبان، کراچی مئی ۱۹۸۳ء
۲۰۶۔ معدن المعانی کی تاریخی اور دینی اہمیت ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک ستمبر ۱۹۸۲ء
۲۰۷۔ مکاتیب اجمل (حکیم اجمل خاں) ۸ عدد ۱۔ ماہنامہ برہان، دہلی ستمبر ۱۹۸۰ء
۲۔ ماہنامہ الولی، حیدرآباد اکتوبر ۱۹۸۶ء
۲۰۸۔ ملفوظات حضرت اخی جمشید راجگیری ماہنامہ الجامعہ محمدی شریف جھنگ مارچ ۱۹۸۴ء
۔ایضاً۔ اپریل ۱۹۸۴ء
۔ایضاً۔ مئی ۱۹۸۴ء
۲۰۹۔ ملفوظات حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ماہنامہ المعارف، لاہور مارچ۔ جون ۱۹۷۵ء
۲۱۰۔ ملفوظات شاہ رکن الدین عبدالباری شطاری کی تاریخی اہمیت ۔ایضاً۔ اکتوبر ۱۹۸۲ء
۲۱۱۔ ملفوظات شیخ وجیہ الدین گجراتی کی تاریخی، علمی اور سماجی اہمیت، اورینٹل کالج میگزین، لاہور فروری۔ مئی ۱۹۸۰ء
۲۱۲۔ ملک حسن علی جامعی۔ چند یادیں چند تاثرات (مسودہ)
۲۱۳۔ موت العالم موت العالم (پروفیسر خلیق احمد نظامی) ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور جنوری ۱۹۹۸ء
۲۱۴۔ موت العالم موت العالم (مولانا سعید احمد اکبرآبادی) ماہنامہ برہان دہلی جولائی ۱۹۸۵ء
۲۱۵۔ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک ۔ایضاً۔
۲۱۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے دو نادر خط ماہنامہ برہان، دہلی نومبر ۱۹۸۰ء
۲۱۷۔ مولانا حامد میاں سے میری آخری ملاقات ماہنامہ بینات، کراچی جون ۱۹۸۸ء
۲۱۸۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی ۱۔ ماہنامہ حکمت قرآن، لاہور اگست ۱۹۸۴ء
۲۔ ماہنامہ معارف، علی گڑھ جون ۱۹۸۵ء
۳۔ ماہنامہ سیارہ، لاہور سالنامہ ۱۹۹۳ء
(اشاعت خاص) ۳۴
۲۱۹۔ مولانا سید ابوالحسن نورالحق قادری ماہنامہ دارالعلوم دیوبند جنوری ۱۹۸۲ء
۲۲۰۔ مولانا عبدالقدوس گنگوہی کی لطائف قدوسی (۱) ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک ستمبر ۱۹۷۸ء
۔ایضاً۔ (۲) ۔ایضاً۔ نومبر ۱۹۷۸ء
۔ایضاً۔ (۳) ۔ایضاً۔ دسمبر ۱۹۷۸ء
۲۲۱۔ مولانا عبداللہ قریشی، ایک فعال اور متحرک ادیب سہ ماہی مجلہ اقبال، لاہور جولائی۔ اکتوبر ۱۹۹۰ء
(خصوصی نمبر)

۲۲۲۔ مولانا عبیداللہ سندھی کا سیاسی پروگرام ہفت روزہ خدام الدین لاہور ۴ نومبر ۱۹۹۴ء
(امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی نمبر)
۲۲۳۔ مولانا عزیز گل سے ایک ملاقات ماہنامہ برہان، دہلی اگست ۱۹۸۱ء
۲۲۴۔ مولوی برکت اللہ بھوپالی کے چند نادر خط ششماہی پاکستان، پشاور مارچ ۱۹۸۰ء
۲۲۵۔ میں نے پاکستان بنتے دیکھا حریم ادب اپوا کالج برائے خواتین لاہور ۹۸۔۱۹۹۷ء
۲۲۶۔ میں نے قادیان دیکھا ہفت روزہ ختم نبوت، کراچی ۴ تا ۱۰ جون ۱۹۸۲ء
۱۵ ستمبر (ج ۷ شمارہ ۱۵)
۲۲۷۔ نسبی تحقیق (مراسلہ) ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک فروری ۱۹۸۶ء
(''چند یادیں'' از مولانا عبدالعلیم اثر افغانی مطبوعہ ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک برائے جنوری ۱۹۸۶ء کے تسامحات کی نشان دہی۔ بعد میں یہ مراسلہ ''تذکار حضرت دیوان نعمت اللہ سہروردی'' مصنفہ میاں محمد اقبال ڈوگر سہروردی ۴۳۳۔ این سمن آباد لاہور ۱۹۹۲ء میں بطور پیش لفظ شامل کیا گیا)
۲۲۸۔ نظریہ پاکستان کا تاریخی پس منظر (مشمولہ نظریہ پاکستان اور نصابی کتب) دسمبر ۱۹۷۱ء
۲۲۹۔ نظریہ خلافت عہد بہ عہد ماہنامہ بینات، کراچی دسمبر ۱۹۷۸ء
۲۳۰۔ نفاذ اسلام کے راستے میں حائل رکاوٹیں
۲۳۱۔ نفائس الانفاس کی اہمیت ماہنامہ بینات، کراچی جون ۱۹۸۴ء
۲۳۲۔ نواب بہادر یار جنگ مجلہ برگ گل، کراچی دسمبر ۱۹۸۳ء
۲۳۳۔ نواب مرتضیٰ خان فرید بخاری ماہنامہ برہان، دہلی ستمبر ۱۹۸۲ء
۲۳۴۔ نوائے فرنگ ماہنامہ حرم، لاہور فروری ۱۹۶۳ء
۲۳۵۔ وارث شاہ اور ان کے عہد کی سیاسی افراتفری (جنگ فورم) روزنامہ جنگ، لاہور ۲۱ جولائی ۱۹۹۲ء
۲۳۶۔ وفیات ڈاکٹر محمد ایوب قادری (م 25/11/83) ماہنامہ برہان دہلی مارچ ۱۹۸۴ء
پروفیسر محمد سرور جامعی (م 20/9/83) ایم اسلم (م 23/11/83)
۲۳۷۔ وے صورتیں الٰہی (جون میں جدا ہونے والے ۱۱ اصحاب کا ذکر خیر) ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور جون ۱۹۹۷ء
۲۳۸۔ ہابی (نکٹ کولیکشن) ۔ایضاً۔ اپریل ۱۹۹۸ء
۔ایضاً۔ ۔ایضاً۔ مئی ۱۹۹۸ء
۲۳۹۔ ہمایوں اور علم ہیئت ....
۲۴۰۔ ہمایوں کا ذوق موسیقی ماہنامہ المعارف، لاہور جولائی ۱۹۷۱ء
۲۴۱۔ ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور نومبر ۱۹۹۷ء
(نومبر میں پیوند خاک ہونے والی ۱۰ شخصیات کے سوانحی خاکے)

۲۴۲۔ ہوئے خاک انتہا یہ ہے ۔ایضاً۔ اکتوبر ۱۹۹۷ء

(اکتوبر میں پیوند خاک ہونے والی ۱۳ شخصیات کے سوانحی خاکے)

۲۴۳۔ ہوئے دفن زیر زمین فخر دوراں (دسمبر کی ۹ مرحوم شخصیات کا ذکر) ۔ایضاً۔ دسمبر ۱۹۹۷ء

۲۴۴۔ ہیر وارث شاہ کی تاریخی اہمیت ماہنامہ المعارف لاہور دسمبر ۱۹۷۳ء

۲۴۵۔ ہیر وارث شاہ دچ اٹھارویں صدی دے پنجاب دا اتہاس ششماہی کھوج درپن (گورمکھی) امرتسر جولائی ۱۹۸۰ء

۲۴۶۔ ہیں مدفن میں صاحب قراں کیسے کیسے (جنوری کی ۱۶ مرحوم شخصیات) ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور جنوری ۱۹۹۸ء

۲۴۷۔ یادرفتگاں (مئی میں ۱۰ رحلت کنندگان کا تعارف) ۔ایضاً۔ مئی ۱۹۹۷ء

۲۴۸۔ یا رب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا (۱۷ اقساط) ہفت روزہ الاسلام، گوجرانوالہ ۱۹۷۸ء

۲۴۹۔ یدِ بیضا ماہنامہ برہان، دہلی اگست ۱۹۷۹ء

(نوٹ) پروفیسر صاحب نے بعد میں مندرجہ ذیل نمبروں والے مضامین اپنی قیام گاہ پر قائم کردہ اشاعتی ادارہ ''ندوۃ المصنفین'' سمن آباد لاہور کی طرف سے کتابچوں کی صورت میں الگ بھی شائع کر دیے:

مضامین نمبر ۷۸، ۸۱، ۸۵، ۱۰۶، ۱۱۸، ۱۲۸، ۱۳۷، ۱۴۳، ۱۴۹، ۲۱۲۔ البتہ مضمون نمبر ۱۷، اقبال اکادمی لاہور کی طرف سے الگ کتابچہ کی صورت میں شائع ہوا۔

جو مضامین کتابی صورت میں شائع ہوئے، ان کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ سرمایہ عمر ندوۃ المصنفین سمن آباد لاہور ۱۹۷۶ء

مضامین نمبر ۵۸، ۶۵، ۷۹، ۹۲، ۹۵، ۱۲۱، ۱۳۲، ۱۳۷، ۱۵۳، ۱۷۰، ۲۰۹، ۲۳۹، ۲۴۴

۲۔ تاریخی مقالات بک ٹاک کمپل روڈ لاہور ۱۹۹۱ء

مضامین نمبر: ۲، ۲۵، ۹۱، ۹۳، ۱۶۷، ۱۸۴، ۱۹۴، ۱۹۹، ۲۲۸

۳۔ ملفوظاتی ادب کی تاریخی اہمیت ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب، لاہور ۱۹۹۵ء

مضامین نمبر: ۲، ۱۷، ۵۷، ۸۱، ۸۵، ۸۹، ۹۰، ۹۳، ۹۹، ۱۱۸، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۴۹، ۱۶۸، ۲۰۶، ۲۰۸، ۲۱۱، ۲۲۰، ۲۲۳، ۲۳۰

۴۔ سفرنامہ ہند ریاض برادرز، اردو بازار لاہور ۱۹۹۵ء

بھارت کے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۶ء تک کے اسفار کے مضامین ایک مربوط شکل میں بعض ابواب کے اضافہ کے ساتھ۔

ماہنامہ ''سروش'' نیوکاسل، انگلینڈ

پروفیسر محمد اسلم صاحب ایم اے کرنے کے بعد انگلستان چلے گئے۔ یہاں نو برس مقیم رہے۔ اس عرصہ میں عربی زبان اور اسلامیات کی تحقیق کے لیے وہ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۰ء تک ڈرہم یونیورسٹی میں، ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۲ء تک حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی پر تحقیق کے سلسلے میں مانچسٹر یونیورسٹی میں اور بعد ازاں ۱۹۶۶ء تک کیمبرج یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہے جہاں

سے ایم لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ قیام لندن کے دوران انہوں نے نیوکاسل سے اردو کا پہلا ماہنامہ ''سروش'' جاری کیا۔ یہ رسالہ شمالی انگلستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ''جمعیۃ المسلمین'' کا ترجمان تھا اور جامع مسجد و ادارہ ثقافت اسلامیہ ۲۹۔ ایسٹ پریڈ، نیوکاسل برطانیہ کی طرف سے شائع ہوتا تھا۔ یہ رسالہ مخیر حضرات کے تعاون سے بلا قیمت تقسیم کیا جاتا تھا۔ پروفیسر اسلم صاحب جمعیۃ المسلمین کے زیر اہتمام مسجد کمیٹی کے صدر بھی تھے اور امامت کے فرائض بھی ادا کرتے تھے۔ راقم کو رسالہ ''سروش'' کے صرف تین شماروں کا علم ہو سکا۔ ان میں پروفیسر صاحب کی جو تحریریں اشاعت پذیر ہوئیں، ان کی فہرست درج ذیل ہے:

شمارہ نمبر ۱: (غالباً اپریل ۱۹۶۰ء)

۱۔ حرف اول (اداریہ)

۲۔ اوصاف مسلم (سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی تفسیر)

۳۔ آنحضرت ﷺ کی سیرت کا مطالعہ سب کے لیے ضروری ہے۔

۴۔ ہندو پاکستان میں تبلیغ اسلام

۵۔ خواجہ معین الدین حسن سجزی اجمیری

۶۔ روزمرہ کے ضروری مسائل

شمارہ نمبر ۲ اگست ۱۹۶۰

۷۔ سخنہائے گفتنی (اداریہ)

۸۔ درس قرآن (سورہ نمل کی ان آیات کی تفسیر جن کا تعلق حضرت سلیمان علیہ السلام کی ذات بابرکات سے ہے اور قرآن مجید میں جہاں بھی ان کا ذکر آیا ہے، اسے یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے)

۹۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی

شمارہ نمبر ۳ جنوری ۱۹۶۱ء

۱۰۔ اداریہ

۱۱۔ درس قرآن

کتابوں پر تبصرے:

۱۔ شعرائے امرتسر کی نعتیہ شاعری / پروفیسر محمد سلیم چوہدری — مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، دسمبر ۱۹۹۶ء

ماہنامہ تہذیب الاخلاق۔ لاہور جنوری ۱۹۹۷ء

۲۔ وسط ایشیا کے مغل حکمران / قاضی محمد اقبال چغتائی بایکرہ — چغتائی ادبی ادارہ گلبرگ لاہور، مئی ۱۹۹۷ء

۳۔ خفتگان خاک گجرات / ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ — سلیچ پبلی کیشنز لوران ضلع گجرات ۱۹۹۶ء

۴۔ مبدء و معاد / امام ربانی مجدد الف ثانی، اردو ترجمہ از پیرزادہ اقبال احمد فاروقی، مکتبہ نبویہ گنج بخش روڈ لاہور ۱۹۹۶ء

Research Papers

1. Early Missionaries of India	Muslim news international, London February, 1963	
2. Khawaja Muin-ud-Din Ajmeri		April, 1963
3. Sheikh Baha-ud-Din Zakariya		June, 1963
4. Ubaidullah Khan	Journal Asiatic Society of Pakistan, Decca June. 1964	
5. Jahangir & Shaikh AhmedSirhindi		June, 1965
6. Fadlullah Bin Ruzbihan		Dec. 1965
7. A New Light on Akbar's Religious Policy, The Monthly "Taj" Karachi		June, 1968
8. Quest for Identity	A paper presented at the First Congress on the History and Culture, held at Islamabad, April, 1973 and printed in the proceedings of the Congress.	
9.Mechanical Devices of Shah Fathullah Shirazi	A paper presented at National Conference on the History of Sciences held at Islamabad, Dec. 1974 and printed in the proceedings of the Conference.	
10. Learning and Literature during the Arab Rule in Sind	A paper presented at the International Seminar on "Sind Through the centuries" held at Karachi, February, 1975	
11. Advancement of Astronomy during the Reign of Humayun	A paper presented at the International Congress on Mathematical sciences, held at Karachi, July, 1975	
12. Tughluq Nameh	A paper presented at the Second Congress on the History and Culture,held at Hyderabab, March, 1976	
13. Political Background of Iqbal's Allahabad Address	A paper presented at a seminar on Allama Iqbal held at Multan University, Dec. 1976.	
14. Historical value of the Surur-us-Sudur	A paper presented at the 17th Pakistan History Conference held at Karachi, Feb. 1977.	
15. Abu Bakr Zakariya RaziThe Quarterly "Iqbal" Lahore, July, 1979.		
16. Music and Musicians at the Court of Augangzeb	A paper presented at the International Seminar held at Peshawar in March, 1981.	
17. Ibn Al Quff	A paper presented at Islamabad in the International Conference held in March, 1981 and published in the proceedings of the Conference.	
18. Two Silver Tankahs of	Journal, Deptt. of History, Punjab University, Lahore,	

ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور، جون ۱۹۹۷ء

۵۔ گجرات میں اردو شاعری / پروفیسر کلیم احسان بٹ — ناوک پبلشرز جلالپور جٹاں گجرات؟

۶۔ مکاتیب صوفی تبسم بڑا کٹر نثار احمد قریشی — مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور ۱۹۹۷ء

ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور، اگست ۱۹۹۷ء

اداریے:

ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور

۱۔ پہلی بات مشترک اداریہ از سید محمد حبیب اللہ اوج و پروفیسر محمد اسلم
مارچ ۱۹۹۷ء میں وفات یافتگان کے حالات اور سانحہ خاکسار تحریک — مارچ ۱۹۹۷ء

۲۔ پہلی بات (سرسید کی مساعی) — اکتوبر ۱۹۹۷ء

۳۔ پہلی بات (متعلق سرسید احمد خاں) — مارچ ۱۹۹۸ء

۴۔ پہلی بات (مانگا منڈی کا نام سرسید نگر رکھنے پر زور) — اپریل ۱۹۹۸ء

۵۔ پہلی بات (تحریک پاکستان) — جون ۱۹۹۸ء

۶۔ پہلی بات (قیام پاکستان کا پس منظر) — اگست ۱۹۹۸ء

پیش لفظ:

۱۔ قندیل تواریخ — محمد حسن خان میرانی نوشاہی — اردو اکیڈمی بہاول پور — ۱۹۹۱ء

تکملہ:

۱۔ فن خطاطی — اعجاز راہی — ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور — نومبر ۱۹۹۷ء

خطوط:

۱۔ بنام جناب محمد جنید اکرم مدیر رسالہ (دو خطوط) ۔ تماہی پنجابی ۔ لاہور (بابائے پنجابی نمبر) جولائی ۲۰۰۰ تا مارچ ۲۰۰۱

۲۔ بنام طاہر شادانی صاحب — روزنامہ خبریں لاہور — ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۸ء

۳۔ بنام میاں زبیر احمد ضیائی زیب سجادہ درگاہ عالیہ حضرت داتا گنج بخش

۱۔ ماہنامہ جہان رضا لاہور — دسمبر ۱۹۹۸ء

۲۔ فکر و نظر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی — ۱۹۹۸ء

۳۔ ماہنامہ قومی زبان، کراچی — جنوری ۱۹۹۹ء

ایم اے کے تحقیقی مقالات زیر نگرانی پروفیسر محمد اسلم:

۱۔	آثار و احوال خواجہ محمد معصوم سرہندی	ہدایت اللہ چوہدری	۱۹۷۰ء
۲۔	مہدوی تحریک میراں سید محمد مہدی جونپوری اور ان کی سیاسی تحریک	محمد زمرد	۱۹۷۲ء
۳۔	احوال و آثار شاہ غلام علی دہلوی	سیدہ انجم	۱۹۷۳ء
۴۔	بابر اور ہمایوں کے مذہبی رجحانات	طاہرہ شاہ	۱۹۷۳ء
۵۔	احوال و آثار میرزا مظہر جانجاناں	محمد اکرم	۱۹۷۴ء
۶۔	شاہ اسمٰعیل شہید بحیثیت سیاسی مفکر	محمد بشیر	۱۹۷۴ء
۷۔	احوال و آثار شاہ عبدالعزیز دہلوی	سعیدہ بانو	۱۹۷۴ء
۸۔	شاہجہان کی مذہبی پالیسی	زاہدہ پروین	۱۹۷۴ء
۹۔	جہانگیر کے مذہبی رجحانات	کنیز فاطمہ	۱۹۷۵ء
۱۰۔	حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کے احوال و آثار	رخشندہ مختار صدیقی	۱۹۷۶۔۷۷ء
۱۱۔	احوال و آثار مولانا محمد قاسم نانوتوی	محمد منیر	۱۹۷۶۔۷۸ء
۱۲۔	قاضی ابویعلیٰ کا نظریہ امامت	روبینہ ظفر	۱۹۷۶۔۷۸ء
۱۳۔	احوال و آثار مولانا شبیر احمد عثمانی	سید ناظم ہمدانی	۱۹۷۶۔۷۸ء
۱۴۔	شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات کی سیاسی اور مذہبی اہمیت	ثمینہ انوار	۱۹۷۶۔۷۸ء
۱۵۔	مولانا عبیداللہ سندھی کے سیاسی نظریات	نورین خان	۱۹۷۶۔۷۸ء
۱۶۔	حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے احوال و آثار	پروین اختر	۱۹۷۶۔۷۸ء
۱۷۔	شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی۔ احوال و آثار	سمیعہ وحید	۱۹۷۸ء
۱۸۔	اکبر الٰہ آبادی کا سیاسی شعور	روبینہ نذر	۱۹۷۸۔۷۹ء
۱۹۔	احوال و آثار مولانا رشید احمد گنگوہی	محمد نواز	۱۹۷۹ء
۲۰۔	احوال و آثار خواجہ باقی باللہ دہلویؒ	اعجاز احمد	۱۹۷۹ء
۲۱۔	سید محمد میاں بحیثیت مورخ	رفاقت یسین	۱۹۷۹۔۸۰ء
۲۲۔	مولانا محمد انور شاہ محدث کاشمیری	بشیر احمد	۱۹۷۹۔۸۰ء
۲۳۔	حزب الانصار	رانا محمد اجمل	۱۹۷۹۔۸۰ء
۲۴۔	پنجاب کی سیاست میں بندہ بیراگی کا کردار	محمد زمان جوئیہ	۱۹۷۹۔۸۰ء
۲۵۔	موجودہ صدی کے آغاز میں انڈونیشیا میں قومی بیداری	طاہر محمود اختر	۱۹۷۹۔۸۱ء

Ala-ud-Din Khilji	1984.
19. The role of the Arthodox Muslims in the accession of Auraganzeb	Journal of Research (Humanities) University of the Punjab, Vol:4, No:2, 1969.

20. First Expedition to Constanople during the caliphate of Amir Muawiyah
21. Mian Nur Muhammad Kalhora and his political and religious thoughts. (Seminar Kalhora Rule in Sind 15, 16 Sep, 1996)
22. Balkh, the Qubatul Islam
23. Role of Sheikh Abdul Haqq Muhaddith Dehlavi in the Arthodox Movement.
24. Changiz Khan and his immediate successor

RESEARCH PAPERS

Presented at Area Study Centre (CENTRAL ASIA) University of Peshawar

1. Kh. Ubaidullah Ahrar
2. Shaibani Khan Uzbek
3. Hazrat Khawand Mahmud Ishan Lahore
4. Ali Bin Ribben Tabari
5. The Shaibanids
6. Ubaidullah Khan Uzbek
7. The Chaghatais
8. Abul- Lyath Samarqandi
9. Sufi Orders of Central Asia
10. The Coinage of Central Asia
11. Water supply and Irrigation System in Central Asia in middle ages. June, 1988.
12. Important Trade Routes and Trade Centres in Central Asia. Summer, 1991.
13. Judiciary under the Shaibanids. No.28, Summer, 1991.
14. Textile Industry in Central Asia during the middle ages. Central Asia-Journal of Area Study Centre, No.32 Summer 1993.
15. The Weights and Measures in Central Asia.
16. The sabicans in Central Asia.
17. Trade Routs and Trade Centres of Central Asia. Central Asia-journal of Area Study Centre.

۲۶۔ اسلام میں احتساب کا مقام	منزہ شاہین	۱۹۷۹۔۸۱ء
۲۷۔ امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی اور ان کی سیاسی خدمات	عرفان حفیظ بٹ	۱۹۷۹۔۸۱ء
۲۸۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے سیاسی نظریات	نسیم محسن	۱۹۸۰ء
۲۹۔ حکیم نور الدین بھیروی (قادیانی)	محمد ادریس	۱۹۸۰ء
۳۰۔ دار العلوم دیوبند کے سو سال	شگفتہ خاں	۱۹۸۰ء
۳۱۔ مغلوں کے پرتگیزوں کے ساتھ تعلقات (۱۶۵۸۔۱۵۵۶ء)	رفیعہ بیگم	۱۹۸۱۔۸۲ء
۳۲۔ عہد مغلیہ میں شطاریوں کا کردار	سردار تاشفین فراز	۱۹۸۲۔۸۳ء
۳۳۔ نظریہ خلافت ۱۲۵۸ء تک	ثمرہ فراز	۱۹۸۲۔۸۳ء
۳۴۔ نواب شاہجہاں بیگم کی علمی و سیاسی خدمات	رضوانہ ترمذی	۱۹۸۴ء
۳۵۔ عہد سلطنت میں سہروردی سلسلہ کے بزرگوں کی سیاسی، دینی اور سماجی خدمات	خالدہ پروین	۱۹۸۴۔۸۵ء
۳۶۔ عہد سلطنت میں فرقہ فردوسیہ کے بزرگوں کی دینی، سماجی اور سیاسی خدمات	شاہد وسیم رانا	۱۹۸۵ء
۳۷۔ امام غزالی کے سیاسی نظریات	انجم افشاں	۱۹۸۵۔۸۶ء
۳۸۔ محمد بن عبدالوہاب اور ان کی سیاسی تحریک	طاہرہ پروین	۱۹۸۵۔۸۶ء
۳۹۔ مسلم سپین میں علمی ترقی	شمیم چودھری	۱۹۸۷۔۸۸ء
۴۰۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی بحیثیت مورخ	عذرا ناہید	۱۹۸۷۔۸۹ء
۴۱۔ خطاطی کے فروغ میں لاہور کا حصہ (۱۸۸۰۔۱۹۸۰ء) (مقالہ پی ایچ ڈی)	محمد اقبال بھٹہ (بہ اشتراک ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار)	۱۹۹۸ء
۴۲۔ ملتان سلاطین دہلی کے عہد میں	رفعت امین خان	

اردو تحقیقی کتب میں اشاریہ سازی

سیدہ مصباح رضوی

اشاریہ سازی کسی بھی تحقیقی مقالے کا اہم جزو ہے۔ اس کو انگریزی میں INDEX کہتے ہیں۔ اشاریہ ایک طرح سے تحقیقی مقالے کا آخری باب ہوتا ہے کہ جس کی موجودگی میں تحقیقی کتاب یا مقالے کی اہمیت اور افادیت بڑھ جاتی ہے جبکہ اشاریہ کے نہ ہونے کی صورت میں مقالہ نامکمل سا رہتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر گیان چند نے تحقیقی کتاب کے آخر میں اشاریے دینا لازمی قرار دیا ہے۔[۱]

جمیل احمد رضوی اپنے مضمون ''اشاریہ سازی'' میں اشاریہ کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> ''کسی کتاب یا کتب میں مذکورہ مضامین، اشخاص، مقامات یا ناموں وغیرہ کی مفصل الف بائی یا ابجدی فہرست مع حوالہ صفحات، جہاں انہیں استعمال کیا گیا ہو''[۲]

اشاریے کو مرتب کرنے کے دو طریقے ممکن ہیں۔ اول یہ کہ اشاریہ میں دی جانے والی معلومات کو لغت کے انداز میں الف بائی طریقے سے درج کیا جائے۔ یعنی معلومات کو عنوانات کے تحت درج کرنے کے بجائے گھلا ملا کر لکھ دیا جائے۔ یہ طریقہ کار مطلق اشاریہ سازی کی ذیل میں آئے گا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معلومات کو مختلف عنوانات اور زمروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ جیسے شخصیات، مقامات، کتب وغیرہ اور ان کی ذیل میں ان سے متعلقہ صفحات کی تفصیل کو درج کیا جائے۔ اگر مختلف شخصیات کے متعلق معلومات زیادہ نوعیت کی ہوں تو ان کے ذیلی عنوانات بنائے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر غالب کا نام آتا ہے تو غالب کے متعلق جس نوعیت کی معلومات مقالے میں میسر آئی ہوں ان کو ذیلی عنوانات کے تحت درج کیا جائے۔ جیسے غالب:۔ پیدائش، شادی، پنشن کا قضیہ، وفات وغیرہ وغیرہ۔ بالعموم اشاریہ میں صرف عنوان لکھ کر ان کے صفحہ نمبر درج کر دیے جاتے ہیں۔ ذیلی عنوانات یا تفصیلات وغیرہ درج نہیں کیے جاتے۔ اشاریہ مرتب کرنے کا یہ آخر الذکر دوسرا طریقہ زیادہ بہتر اور مفید ہے۔

اشاریہ سازی کی کیا اہمیت ہے؟ اور تحقیق میں اس کا رواج کب ہوا؟ یہ سوالات اہم اور جواب طلب ہیں۔ درحقیقت اشاریہ سازی کی ابتدا اور تاریخ مطبوعہ کتابوں کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے۔ اشاریے کا استعمال ہر زبان کی تحقیقی کتابوں میں ہوتا ہے اور اس کو اہم خیال کیا جاتا ہے۔ جمیل احمد رضوی John Rothman کی کتاب "Index, Indexer, Indaxing" کا اقتباس درج کرتے ہیں کہ:

> ''ابتدائی اشاریے شخصی یا ذاتی ناموں تک محدود تھے، موضوعی نہ تھے..... موضوعی اشاریے اٹھارویں صدی عیسوی کے ادب میں ملتے ہیں۔ ان میں اصطلاحات کا انتخاب اور اندراجات کی ترتیب ایک طویل عرصے تک غیر منظم رہی۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں جب لائبریری سائنس اور دستاویز سازی کے مختلف شعبوں میں ترقی ہوئی تو موضوعی اشاریے کا نہ صرف عام رواج ہوا بلکہ یہ زیادہ منظم صورت اختیار

کر گیا۔''[3]

اشاریے کی اہمیت میں روز بروز اضافہ ہوا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ منظم صورت میں تکمیل پذیر ہوتا جا رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود اردو میں ابھی تک اس کا رواج عام نہیں۔ حالانکہ ہر ''ایماندار فنکار''[4] اس کی ضرورت اور اہمیت جانتا اور مانتا ہے۔ اس کے باوجود مقالے کے اس اہم حصے کی طرف سے غفلت برتنے کو سوائے محقق کی تن آسانی اور سہل نگاری کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

اشاریے کے باب کی عدم موجودگی کی ایک بڑی اور اہم وجہ یہ ہے کہ اسے کتابت یا کمپوزنگ کے بعد تیار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اشاریہ میں دی جانے والی معلومات کو صفحہ نمبر کے ساتھ دیا جاتا ہے کہ فلاں شخص کا حوالہ کتاب کے فلاں فلاں صفحہ نمبر پر درج ہے۔ صفحے کا حوالہ اسی صورت میں دیا جا سکتا ہے جب کتابت یا کمپوزنگ مکمل ہو جائے۔ کتابت ہو جانے کے بعد بالعموم کتاب کو جلد مارکیٹ میں لانے کے لیے یا پھر اشاریہ سازی کی محنت سے بچنے کے لیے ناشر حضرات اس سے اجتناب برتتے ہیں۔ یا پھر ''کارِ زائد''[5] کہہ کر اس سے صرف نظر کرتے ہیں۔

بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ کتاب کے آخر میں درج ہونے والے اس باب کو شاگردوں، ناشر حضرات یا کسی اور عزیز دوست کی ذمہ داری پر تیار کراتے ہیں۔ اشاریہ سازی ایک تکنیکی فن ہے اور جو حضرات اس کی تکنیک سے کما حقہٗ واقف نہیں ہوتے وہ اشاریہ مرتب کرنے میں کئی اغلاط کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ جمیل احمد رضوی اس مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ناشرین و صارفین اس کیفیت کو شاذ ہی پرکھتے تھے۔ وہ یہ کام بھی کسی عام شخص سے کروا لیتے..... جن کی کوئی خاص تربیت ہوتی نہ ہی انہیں اس کام کی تکنیک سکھائی جاتی''۔[6]

خصوصی تکنیک سے ناواقفیت کی بنا پر غلطی کا امکان زیادہ رہتا ہے۔ لہٰذا اگر اشاریے جیسے اہم کام کو درست یا اغلاط سے پاک دیکھنا ہو تو مصنف کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کی ذمہ داری خود قبول کرے تاکہ اشاریہ کے اندراجات درست اور مصنف کی منشا کے مطابق ہوں۔ مگر یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب محقق ''اشاریہ'' کو بھی تحقیقی مقالے کے دوسرے اجزا کی طرح لازمی اور ناگزیر تصور کرے اور یہ جان لے کہ جس طرح مقالے کے دوسرے حصے اس کی ذاتی محنت اور کاوش کا ثبوت ہیں اسی طرح اشاریہ مرتب کرنا بھی اس کی تحقیقی ذمہ داریوں کا ایک جزو ہے جس سے عہدہ برآ ہونا اس کے فرائض میں شامل ہے۔ ان تمام باتوں کے لیے اشاریے کی ضرورت و اہمیت اور افادیت سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ اشاریے کو ہم مقالے یا کتاب کی ''کلید'' کہہ سکتے ہیں کہ جس کی مدد سے معلوم سے نامعلوم کی طرف رہنمائی کی جاتی ہے۔ اشاریہ قاری کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ جان سکے کہ اس کتاب میں اس کے کام کا کچھ مواد موجود ہے یا نہیں اور اگر موجود ہے تو وہ کتاب کے کن کن صفحات پر مل سکتا ہے۔ قاری فوراً مطلوبہ صفحات کو کھول کر اپنی پسند کے موضوع کے متعلق معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ اگر اشاریہ نہ ہو تو قاری کو مطلوبہ مواد کی تلاش میں تمام کتاب کی ورق گردانی کرنا پڑے گی۔ اور ہو سکتا ہے کہ بہت سی موٹی موٹی کتابوں کے ورق الٹتے الٹتے وہ تھک جائے اور وہی موضوع اس کی نظر میں نہ آ سکے کہ جس کی اس کو تلاش تھی۔ جس طرح تحقیقی مقالہ میں حوالہ اور کتابیات کی اہمیت ناگزیر ہے اور ان کی عدم موجودگی میں مقالہ معتبر نہیں کہلا سکتا کیونکہ مقالہ کو پرکھنے کے لیے حوالوں کی موجودگی ضروری ہے اسی طرح مقالہ سے فیض پانے کے لیے اور اس کا حوالہ دینے کے لیے ''اشاریہ'' کا باب کسی قاری یا محقق کے لیے بڑا فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنے مقالہ کی افادیت بڑھانے کے لیے اسکالر کو اشاریہ کی موجودگی کو یقینی بنانا ہوگا۔

عبدالرزاق قریشی لکھتے ہیں:

''کتابیات کی طرح اشاریہ بھی علمی و تحقیقی کتابوں میں لازمی طور پر ہونا چاہیے''۔[7]

ڈاکٹر اختر اس بارے میں بڑے قطعی انداز میں رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اس کے بغیر تھیسس مکمل ہوتی ہے اور نہ اس کا کوئی معیار نظر آتا ہے''[8]

مگر حیرت کی بات ہے کہ محققین نے اس قدر اہم شے کو کیوں نظر انداز کر رکھا ہے۔ حالانکہ اشاریہ کے مقاصد محققین و ناقدین پر منکشف ہیں۔ کیونکہ جو بھی کتابیں کسی قاعدے کو مدنظر رکھ کر لکھی جاتی ہیں۔ مصنف ان میں اشاریے کے لیے جگہ ضرور محفوظ رکھتا ہے۔

''اشاریہ کا مقصد اشخاص، مقامات وغیرہ کے نام گنوانا نہیں بلکہ ان سے متعلق کتاب میں کوئی اطلاع یا اطلاعات بہم پہنچائی گئی ہوں''[9]

تو اشاریہ اپنے مطلوبہ مقاصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ مختصر طور پر اشاریہ کے مقاصد کو اس طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے کہ:

۱۔ اشاریے سے اس بات کا علم فوراً ہو جاتا ہے کہ کتاب میں کیا کیا معلومات موجود ہیں۔

۲۔ اشاریے کی مدد سے فوراً قاری اپنے مطلوبہ صفحات کو تلاش کر کے مواد حاصل کر لیتا ہے کہ جس سے بہت سا قیمتی وقت بچ جاتا ہے۔

۳۔ اشاریہ کتاب کے تمام اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۴۔ کتاب کے بکھرے ہوئے مواد کو ترتیب دیتا ہے کہ کئی افراد کا ذکر مختلف صفحات پر ہوتا ہے ان تمام کو ایک ترتیب کے ساتھ ایک جگہ پیش کرنا اشاریے کا کام ہے۔

۵۔ اشاریہ تحقیقی پیش رفت میں سہولت کا باعث بنتا ہے۔

گیان چند کے خیال میں:

''غیر ضروری اور غیر اہم ناموں کو اشاریے میں نہ درج کیا جائے''[10]

مگر اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ بہت ممکن ہے کہ قاری یا محقق کسی غیر معروف ادیب، شاعر یا کتاب وغیرہ کے بارے میں معلومات جمع کر رہا ہے اور کتاب کے اشاریے میں غیر اہم سمجھ کر اس کے نام وغیرہ کا اندراج نہ کیا جائے تو محقق یہی سمجھے گا کہ اس کتاب میں اس کا مطلوبہ مواد میسر نہیں ہے۔ اس طرح تحقیق کے لیے یہ اشاریہ سودمند ثابت نہ ہوگا۔

اشاریہ مرتب کرنے سے قبل یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ اشاریہ کے لیے کتاب میں کس قسم کا مواد موجود ہے۔ پھر اس مواد کے مطابق ہی اشاریے کو مختلف عنوانات میں تقسیم کر دیا جائے۔ درحقیقت اشاریے کا انحصار کتاب کے موضوع یا مضمون پر ہوتا ہے۔ اگر کتاب کا موضوع باغبانی ہو یا کتاب جانوروں اور پرندوں کے متعلق ہو تو اشاریے کے عنوانات، پھول، جانور یا پرندوں کے متعلق ہی ہوں گے۔ ادبی مقالوں یا کتابوں میں بالعموم اشخاص، مقامات اور کتب کے نام کے اشاریے ترتیب پاتے ہیں۔ اشاریہ کتابیات اور فہرست کے علاوہ پوری کتاب کا ہونا چاہیے۔ تدوینی کتابوں میں بالخصوص مقدمہ کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے اشاریے میں مقدمہ کو بھی شامل کرنا ضروری ہے۔

اشاریے کے بارے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ کتاب کے آخر میں درج ہوتا ہے۔ کچھ محققین ہر باب کے آخر میں

اشاریہ کا باب بنا دیتے ہیں جو درست نہیں۔ بقول ش اختر یہ بات:

''طریقہ کار کے خلاف ہے..... اس لیے کہ جس شے کی جگہ ماہرین نے جہاں مقرر کر دی ہے۔ وہی رکھنی چاہیے''[11]

ویسے بھی ہر باب کے آخر میں اشاریہ درج کرنا کتابت یا کمپوزنگ کے اعتبار سے بھی مشکل ہے اور تحقیقی معاونت میں بھی آخری باب کے طور پر پوری کتاب کے اشاریے کی طرح فائدہ مند نہیں۔

اشاریہ مرتب کرتے ہوئے اشخاص، مقامات اور کتابوں کے نام کو الف بائی ترتیب سے متعلقہ عنوانات کی ذیل میں لکھا جائے۔ اشخاص کے نام، حوالہ و کتابیات کے طریقہ اندراج کے مطابق لکھنا ضروری ہے۔

گیان چند اشاریے کی طوالت سے بہت گھبراتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ طوالت کے خطرہ سے بچنے کے لیے غیر اہم افراد کا ذکر اشاریہ میں نہ کیا جائے اور اس سلسلہ میں محقق خود اپنی حدود متعین کرے لیکن یہ طریقہ کار درست نہیں۔ اگر ہم کسی تحقیقی کتاب میں کئی سو صفحات کے حقائق اور نتائج کو بیان کر سکتے ہیں تو چند صفحات پر محیط اشاریہ درج کرنے میں آخر طوالت کی اتنی فکر کیوں.....؟ اشاریہ اگر مکمل ہوگا تو وہ فائدہ مند ہو سکتا ہے بصورت دیگر غیر معروف اور غیر اہم کی تلاش میں قاری کو تمام کتاب کی ورق گردانی خود کرنا پڑے گی۔

آخر میں ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری ہوگا کہ اشاریہ نگاری کی کئی صورتیں یا اقسام ہیں۔ جیسے مختلف رسائل اور اخبارات کے اشاریے، بہلوگرافی کہ جس کو بالعموم شخصی اشاریے کے نام سے جانا جاتا ہے یا مختلف کتابوں کے اشاریے وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس مضمون کا دائرہ محض اس اشاریے پر محیط ہے جو کسی بھی تحقیقی کتاب کا آخری باب ہوتا ہے اور جس میں کتاب کے متعلق ہی معلومات جگہ پا سکتی ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنی کتاب ''تصحیح و تحقیق متن'' میں ''فہرست سازی'' کے تحت جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے وہ دراصل ''اشاریہ سازی'' ہی کی خصوصیات ہیں۔ اور اس کے لیے فہرست سازی کے بجائے ''اشاریہ سازی'' ہی کا لفظ استعمال کرنا مناسب اور موزوں ہے تا کہ غلط فہمی اور ابہام کی گنجائش نہ رہے۔

حوالہ جات

۱۔ گیان چند، ڈاکٹر۔ تحقیق کا فن، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۲ء، ص ۳۲۵
۲۔ جمیل احمد رضوی، ''اشاریہ سازی''۔ مرتبہ اردو میں فنی تدوین ڈاکٹر ایس۔ ایم ناز، اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی، ۱۹۹۱ء، ص ۳۰۵
۳۔ ایضاً
۴۔ ش اختر، تحقیق کے طریقہ کار، رانچی (بھارت) سینٹر فار سائنٹی فک اسٹڈیز اینڈ کلچر، س۔ن، ص ۱۸۷
۵۔ گیان چند، ڈاکٹر۔ تحقیق کا فن، ص ۳۲۶
۶۔ جمیل احمد رضوی، ''اشاریہ سازی'' ص ۳۲۶
۷۔ عبدالرزاق قریشی، مبادیات تحقیق، بمبئی، ادبی پبلشرز، ۱۹۶۸ء، ص ۷۵
۸۔ ش اختر، تحقیق کا طریقہ کار، ص ۱۷۸
۹۔ عبدالرزاق قریشی، مبادیات تحقیق، ص ۷۵
۱۰۔ گیان چند، ڈاکٹر۔ تحقیق کا فن، ص ۳۲۶
۱۱۔ ش اختر، تحقیق کا طریقہ کار، ص ۱۷۹

خطاطی اور مصوّرانہ خطاطی

(قدیم سے جدید روایت تک)

اسلم کمال

وار اینڈ پیس کا مصنف لیو ٹالسٹائی اور زخمیوں کی مسیحا فلورنس نائٹ انگیل نے جنگ کے جنونیوں سے بھری ہوئی اور مریضوں اور معذوروں سے اٹی ہوئی اس دنیا سے جب کوچ کیا تو یہ زمانہ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء کا ہے۔ روس کے دارالحکومت ماسکو میں ایک قابل ذکر مصور جس کا نام کاسی میر مالی وچ (Kasimir Malevich) ہے۔ اس نے اپنی ایک کیوبسٹک پینٹنگ بعنوان "An Englishman in Moscow" میں ایک چمچہ، ایک مچھلی، ایک خنجر، ایک شمع دان، ایک انگلستانی چہرہ اور پیچھے کلیسا دکھایا ہے۔ ان بے جوڑ اشیاء کے بظاہر بے مقصد اجتماع میں روسی زبان کے حروف و الفاظ بھی نظر آتے ہیں جو اس تصویر کی غیر واضح فضا کو اور زیادہ مبہم بناتے محسوس ہوتے ہیں۔

فرانس کے دارالحکومت پیرس میں کیوبسٹ پینٹر گینو سی وی رینی (Gino Severini) کے ایک کینوس پر فرانسیسی زبان کے حروف و الفاظ آپس میں ملتے بچھڑتے ہیں ایک دوسرے کے پس منظر اور پیش منظر میں ابھرتے، ڈوبتے ہیں اور اگرچہ کوئی باقاعدہ مفہوم و معانی کا ابلاغ نہیں کرتے تاہم ان کی ہیرو غلافک موجودگی نے جو ایک بیانیہ سی کیفیت پیدا کر دی ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔

پیرس ہی میں اور اسی زمانے میں جارج براق (Gerges Braque) نے اپنی ایک تصویر بعنوان "Fruit Dish and Ace of Club" میں تاش کے پتوں کا آپس میں میل جول اور باہم دگر عمل واثر دکھایا ہے۔ براق نے اس تصویر کی کیوبسٹک صورت حال میں ایک خوشۂ انگور کی حقیقت نگاری کے ساتھ کچھ حروف و الفاظ کی مداخلت سے اس تصویر کو تہ در تہ کیفیت کا حامل بنا دیا ہے۔

براق کے ہم عصر پابلو پکاسو (Pablo Picasso) نے ایک سٹل لائف بعنوان "Bowl with Fruit, Violin and Wine Glass" پینٹ کی ہے جس میں ایک میز کرسی ہے۔ میز کا میز پوش ایک اخبار دکھایا ہے جس پر ایک وائلن ہے۔ وائلن کے دائیں جانب اخبار کا ایک اور صفحہ ہے جس پر وائن گلاس کی ڈرائنگ ہے۔ جس کے دائیں ہاتھ لفظ "Apparition" کا ایک ٹکڑا ہے اور یہ عنوان ہے اس مضمون کا جس میں روحوں کو بلانے کا اور ان سے ہمکلام ہونے کا ذکر ہے۔ اس تصویر کے دامن میں "La Vie Sportive: یعنی The Sporting Life کے الفاظ کے پیدا کردہ ہیرو غلافک اور کیلی گرافک ماحول اور کیفیات میں پکاسو نے کاغذ کے ردی ٹکڑوں سے ابھرتی اشیاء اور روحوں کے خالی کردہ اجسام میں ایک عجیب و غریب مشابہت پیدا کر دی ہے۔ یوں لگتا ہے اشیاء کے ناطق ہو جانے کا شائبہ پیدا ہو گیا ہے اور حروف و الفاظ کے گونگے ہو جانے کا امکان بھی ظاہر ہوتا

ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ ابھی کچھ دیر بعد جو ہونے والا ہے اس کے سائے پہلے ہی منڈلانے لگے ہیں۔ چنانچہ الفاظ کا کبھی معنی کے ساتھ اور کبھی معنی کے بغیر مصوری کے تخلیقی عمل میں اثر وخلل تصویریت کو نطق آشنا کرنے والا ہے اور مستقبل قریب کی عالمی جنگوں میں انسانی جسموں کے پرزے اڑیں گے۔ یہ پیشین گوئیاں تصویریں کریں گی اور ہولناک بربادی کی خبریں بھی سنایا کریں گی۔

پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی۔ غسل کرتی، بدن خشک کرتی اور بال سکھاتی عورتیں پینٹ کرنے والا ڈیگا (Degas) پیرس کی ویران گلیوں میں دیواریں ٹٹول ٹٹول کر چلتا ہوا اس دنیا سے دور چلا گیا۔ دریائے سین میں نہانے والیاں پینٹ کرنے والے رینوئر (Renoir) کے ہاتھ سے برش گر گیا۔

پہلی جنگ عظیم کا دھواں ابھی چھٹا نہیں تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے اندھیروں نے دنیا تاریک کر دی۔ حروف والفاظ اور ہندسوں جیسے نقوش سے اپنے کینوس میں گویائی پیدا کرنے والا پال کلی اور پرکار اور پیمانے سے اشکال بنا کر ان پر ایک کشفی کیفیت طاری کرنے کا ماہر کنڈنسکائی آگے پیچھے دونوں مر گئے..... کینوس کو اس کے پہلوؤں کے متوازی خطوط سے چوکوروں اور مستطیلوں میں تقسیم کر کے حسن توازن پیدا کرنے والا پیٹ موندریان بھی ایک چار اضلاع کی قبر میں ہمیشہ کے لیے سو گیا..... دو عالمگیر جنگوں کی زخم خوردہ انسانیت ایک بہتر دنیا کی تلاش میں لندن پیرس میونخ ملبورن فلورنس اور روم میں جس مصور کے سٹوڈیو میں جھانکتی، وہاں اسے بارود کی بو میں اڑتی ہوئی راکھ کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی میں انسانیت کی موت پر ماتمی نوحوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا۔

یہ ۱۹۴۷ء ہے اور ایک عالمگیر تباہی کے منظرنامے میں ایک نیا ملک پاکستان نمودار ہوتا ہے۔ اس پر ایک نیا معاشرہ اپنے خدوخال کی تلاش میں ہے۔ جدید مغربی مصوری میں گزشتہ نصف صدی کے دوران کینوس پر جرمن فرانسیسی اور انگریزی زبانوں کے حروف والفاظ کے عمل دخل سے ایک نئے رجحان کا کچھ الجھا الجھا اور کچھ سلجھا سلجھا سمجھ میں آتا ہوا تصور لے کر شاکر علی یورپ سے آیا اور لاہور کی مال روڈ پر چلتے چلتے لاہور عجائب گھر سے گزر کر میو سکول آف آرٹ کے اندر چلا گیا۔

جدید مغربی مصوری میں رونما ہونے والا یہ رجحان فن خطاطی کی جس عظیم اور قدیم اسلامی روایت میں شامل ہو گیا وہ یوں بیان ہوئی ہے:

نوح جن لوگوں کو ہدایت دینے آیا تھا جب ان لوگوں نے اسے عاجز کر دیا تو اسے اس کے رب کا حکم ہوا ایک کشتی بنانے اور اس میں ہر ایک جاندار کا ایک ایک جوڑا سوار کر لینے کا اور جب تعمیل کر لی اس نے اس حکم کی تو کہا اس نے کشتی سے ''بسم اللہ'' اور کشتی تیرنے لگی پانیوں پر کسی خشک قطعہ زمین کی تلاش میں۔۔ سیلاب کے اس واقعہ کے طویل عرصہ بعد پڑھا ملکہ سبا نے اپنے نام خط جو شروع کیا تھا سلیمانؑ نے لکھ کر ''بسم اللہ الرحمن الرحیم''۔ یہ آغاز تھا بسم اللہ قلم سے لکھنے کا۔

دریائے نیل کے کنارے اگنے والے خودرو پودے پیپرس کی چھال کو مختلف مدارج سے گزار کر مصریوں نے ایک بے حد موزوں سطح حاصل کر لی۔ اس پودے کے ڈنٹھل کو کچل کر موقلم بنایا اور کلک کا ایک سرا ترچھا کاٹ کر قلم بنایا اور اس قلم سے خط لگانے کی ابتدا مصریوں کا ہی کارنامہ ہے۔

۳۳۱ قبل از مسیح میں یونانی مصر میں آئے۔ یونانی اور مصری زبان کے ملاپ سے پیدا شدہ نطقی زبان وتحریر کا دور شروع ہوا۔ پادریوں اور راہبوں نے خانقاہوں اور کلیساؤں میں عبادات کے طریقے، فیوض وبرکات کی دعائیں اور عیسیٰؑ کے ارشادات

لکھنے کے لیے مصری کاتبوں کی خدمات حاصل کرنے کا آغاز کیا۔ مصری ہیرغلیفی کے نابود ہو جانے کے باعث اب نطقی زبان میں اپنی جمالیاتی حس کی تسکین کا مصری کاتبوں کو موقعہ مل گیا۔ چنانچہ کتابت کا ہنر فن کی سطح کو چھونے لگا۔ یہ فن خطاطی کی ابتدا تھی۔

فن خطاطی چھ سو سال تک ایک چیونٹی کی بھی رفتار سے کہیں ست اپنی بقا کی تلاش میں سرگرداں رہنے کے بعد اچانک ظلمت سے نکل کر نور میں آنے کی سعادت اس کو تب ملی جب وہ مکہ کے مضافات میں جبل نور نامی پہاڑ کے غار حرا میں اس کے عالی مرتبت خلوت نشینؐ کے قدموں میں باریاب ہوا جہاں جبریلؑ نے نبی امیؐ کو پڑھایا ''اقرا باسم ربک الذی خلق'' اس نے جو پڑھا وہ لکھایا اپنے ان صحابہؓ کو جو قلم سے لکھنا جانتے تھے۔ اور انہوں نے لکھا خط حمیری میں جو خطِ انباری اور خطِ نطی بھی کہلاتا تھا اور بعد یہ خطِ حجازی خطِ مکی اور خطِ مدنی بھی کہلایا۔ کاتبانِ وحی میں ایک خوشگوار جذبہ مسابقت دراصل اسلامی خطاطی کی روایت کا آغاز تھا۔ اس روایت کو حضرت علیؓ نے باب العلم سے گزرنے کا پروانہ خطِ کوفی میں ایسا لکھ کر دیا کہ فن خطاطی کی یہ روایت جو کہ کم آب اور آہستہ خرام تھی، حضرت علیؓ کے نقشِ قلم پر خالد ابن ابی الہیاج قطبۃ المحرر، مالک بن دینار اور الاحول المحرر نے اس کو ایک دریائے تند وتیز میں بدل کر بے کراں تخلیقی طغیانیوں سے آشنا کر دیا۔

۲۷۲ ہجری میں بغداد میں پیدا ہونے والا ابوعلی محمد بن الحسن ابن مقلہ ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھا۔ اس نے قلم کے قط کو اساسی اکائی قرار دے کر فن خطاطی کو ایک سائنٹیفک بنیاد فراہم کی اور خطِ نسخ، خطِ ثلث، خطِ ریحان، خطِ رقاع، خطِ توقیع اور خط محقق ناموں سے چھ خط ایجاد کرنے کا بے مثال کارنامہ سرانجام دیا۔ ابن مقلہ کے نقشِ قلم پر ابن البواب اور یاقوت المستعصمی نے مشق فن کی اور کمال پیدا کیا۔ ان کے نقشِ قلم پر مصریوں نے خطِ تاج اور ترکوں نے خطِ طغریٰ اور خطِ دیوانی کے تحائف فن خطاطی کو پیش کیے۔ اہل اندلس نے خطِ مغربی (اندلسی) متعارف کروایا۔ خطِ نسخ اور خطِ تعلیق کے امتزاج سے میر علی تبریزی نے خطِ نستعلیق ایجاد کیا اور اس کے حسن وجمال کے چراغ عماد الحسینی نے مشہد واصفہان اور قندھار وہرات میں روشن کر کے خوش نویسی کے اجالے عام کر دیئے۔

غزنی کے ایک علاقے کا نام ہجویر ہے۔ علی عثمان ہجویری کا مزار لاہور میں مرجع خلائق ہے۔ ایک صبح کا سپیدہ ابھی پھوٹ رہا تھا۔ مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد مزار کے تعویذ پر اپنے قلم سے لکھے خطِ نستعلیق کی رعنائی سے اپنے دل کو منور کر کے منشی عبدالمجید پرویں رقم دربار سے باہر آیا۔ گورنمنٹ کالج اور کچہری کے پاس سے گزرتا ہوا لوئر مال سے مال روڈ پر مڑ گیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا جب وہ میو سکول آف آرٹ کے سامنے آیا تو شاکر علی نے باہر آ کر استقبال کیا۔ ایک خطاط اور ایک مصور آپس میں بغلگیر ہوئے۔ نصف صدی میں بنتی ہوئی ایک جدید روایت صدیوں پرانی روایت کے بڑے دھارے میں شامل ہو گئی۔ روشنائی کی دوات، کلرکس میں بدل گئی۔ کاغذ، کینوس میں تبدیل ہو گیا۔ نقش حرف میں اتر گیا اور حرف نقش میں ڈھل گیا۔ اس فکری لین دین اور اس تخلیقی تبادلہ کے زیر اثر ۱۹۵۰ء کی دہائی میں مصور انور جلال شمزہ کے کینوس پر مصوری نے جو نئی شکل اپنائی اس پر خطاطی کا شائبہ دکھائی دینے لگا۔ حنیف رامے کے کینوس پر مصوری اور خطاطی میں رشتہ ناطہ ہونے لگا، اپنے مکتبہ کی کتابوں اور رسالوں کے سرورق پر یہ رشتہ داری مستحکم ہوتے ہوتے ۱۹۶۰ء کی دہائی کے آغاز میں اچانک رک گئی۔ حنیف رامے نے مصوری اور خطاطی چھوڑ کر سیاست کی راہ اپنالی۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت نے پاکستان پر جارحیت کا ارتکاب کیا۔ صدر پاکستان نے کلمہ طیبہ پڑھ کر اعلان جنگ کیا۔ اس جنگ کے بارے میں ایک پروگرام بعنوان ''اپنی جان نذر کروں'' ۶ ستمبر ۲۰۰۲ء کو ٹیلی کاسٹ ہوا۔ یہ پروگرام ڈاکٹر شاہنواز

Sadeqain

زیدی صدر شعبہ فنون لطیفہ پنجاب یونیورسٹی کی تحقیق پر مبنی تھا۔ جس کے مطابق اس سترہ روزہ جنگ میں مصور اسلم کمال نے سترہ پینٹنگز بنائیں اور پہلی رات مصورانہ خطاطی کلمہ طیبہ کی پینٹ کی۔ جس سے پاکستان میں مزاحمتی مصوری کی ابتدا ہوئی۔ ان تصاویر اور مصورانہ خطاطی کی تصاویر کی جنگ کے فوراً بعد الحمرا آرٹس لاہور اور نیشنل سنٹر لاہور میں نمائشیں ہوئیں اور مشہور رسالہ نقوش نے اپنے ''جنگ نمبر'' میں شامل کیں۔

۱۹۶۸ء میں شاکر علی نے پنجاب پبلک لائبریری کے بیت القرآن میں مصورانہ خطاطی کا پہلا میورل (دیواری تصویر) پینٹ کیا۔ جو ایک اعلیٰ فن پارہ ہے۔ انہی دنوں اردو ڈائجسٹ کے سالنامہ کے سرورق پر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کی مصورانہ خطاطی اسلم کمال نے کی۔ ۱۹۶۹ء میں صادقین نے اشعار غالب کی مصوری کے ساتھ ان اشعار کی خطاطی بھی شروع کر دی۔ اسلم کمال نے مشہور رسالہ نقوش کے ''غالب نمبر'' کے سرورق پر غالب کا مصرع ''ھم اسد اللھم و ھم اسد اللھیم'' کی مصورانہ خطاطی کی۔ نقوش ہی کے بیاض غالب نمبر میں صادقین کی مصوری کے فن پارے شامل تھے اور اسلم کمال نے اسی شمارے میں صادقین کی اس مصوری پر ایک مختصر مضمون لکھا تھا۔ جو علمی ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔ صادقین نے بار بار مختلف موقعوں پر اظہار تشکر کیا۔ اسلم کمال شروع سے صادقین کا مداح تھا۔ اب دونوں میں قربت اور بڑھی اور اس کے باوصف معاصرانہ اور مصورانہ چشمک نے کبھی حد ادب سے تجاوز نہ کیا۔

۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں مصورانہ خطاطی نے اپنی تعارفی اور تشکیلی تگ و دو میں جس بے مثال تخلیقی وفور اور تحریکی توانائی کا ثبوت دیا اور اس کے نتیجے میں جو برق رفتار مقبولیت عام حاصل کی اس سے بلاوجہ خوف زدہ ہو کر جہاں مصوروں کے ایک گروہ نے فن خطاطی کو ایک فن صغیر (Minor Art) قرار دیتے ہوئے اس کی اس جہت نو (مصورانہ خطاطی) کے روز افزوں فروغ کو فن مصوری (Major Art) کے لیے ایک خطرہ شمار کیا۔ وہاں خطاطین کے ایک گروہ نے بھی مصورانہ خطاطی کو ایک بدعت گردانتے ہوئے اس کو حقیقی یا روایتی فن خطاطی کی حرمت کے خلاف ایک سازش تصور کیا اور دونوں گروہوں نے تہذیب و فن کے سرکاری اور غیر سرکاری اجتماعوں اور اخبارات و رسائل میں ہدف تنقید بنایا اور اس پر پابندی عائد کرنے کے مطالبہ سے بھی دریغ نہ کیا۔ لیکن مصورانہ خطاطی اس سرزمین کے تہذیبی باطن میں اپنی جڑوں کے وجود اور اس کے خارج میں اپنے تخلیقی فروغ کے فطری استحقاق کی بدولت دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسے دریائے تند و تیز میں تبدیل ہو گئی جو اپنی طغیانی میں مزاحمت کے ہر بند کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا۔ اس کے جلال و جمال کی جلوہ سامانی نے معاصر تخلیقی عمل کا رخ اس طرح موڑ کر رکھ دیا کہ وہ جو لوگ فنون لطیفہ سے بطور مبصر یا بحیثیت اہل نظر کے وابستہ تھے اور اب تک اس کو درخور اعتنا نہیں جانتے تھے۔ ان کے دلوں میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہونے لگا۔ اور جو حضرات فنون لطیفہ میں صاحبان فن کے طور پر اپنی پہچان رکھتے تھے لیکن انہیں اس صنف تازہ کا مستقبل مشکوک نظر آتا تھا، اب نہ صرف ان کو اس کا ایک پر یقین اور روشن مستقبل صاف دکھائی دینے لگا بلکہ اب وہ خود اپنا مستقبل بھی اس کے ساتھ وابستگی میں تلاش کرنے لگے۔ اہل نظر اور اہل فن کی قلب ماہیت کا یہ حیرت ناک کرشمہ دکھانے والی اس صنف تازہ نے اپنے بال و پر کی یہ دلکشی اور بلند پروازی کے لیے حقیقی توانائی جن شعبہ ہائے ہنر و فن سے حاصل کی ان کے بارے میں گفتگو مندرجہ ذیل ترتیب میں ایک تسلسل اختیار کرتی ہے۔

کوچۂ نقش گراں:

مصورانہ خطاطی نے میدان میں اترنے والا ایک گروہ کوچۂ نقش گراں سے ہے۔ نقش گری یا نقاشی ہمیشہ سے وہ پہلا زینہ

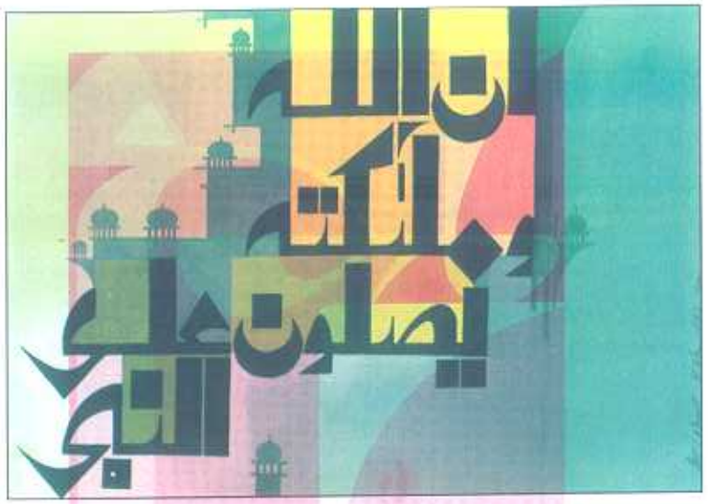

اسلم کمال

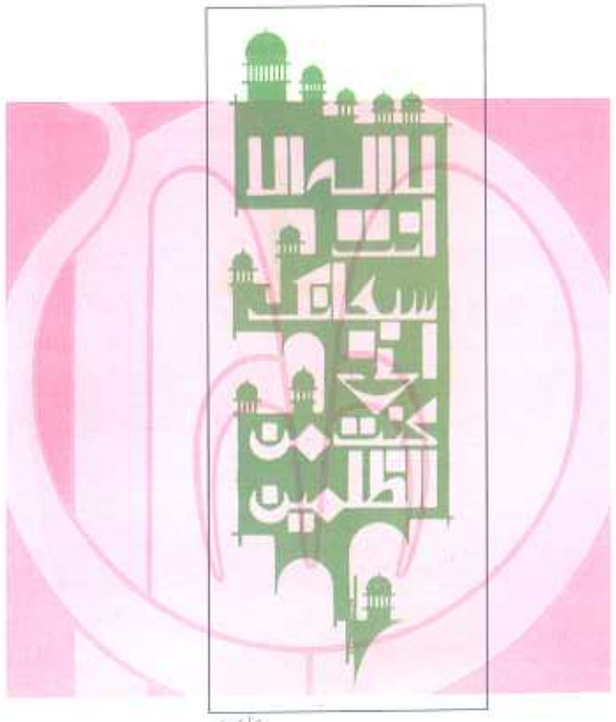

اسلم کمال

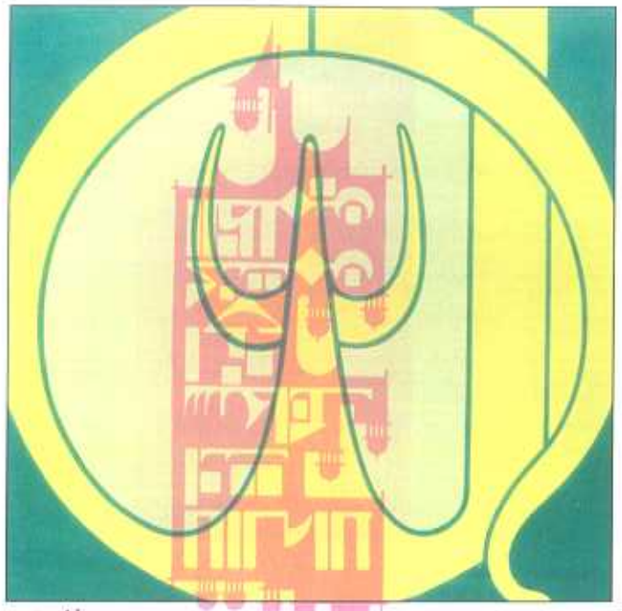

حنیف رامے

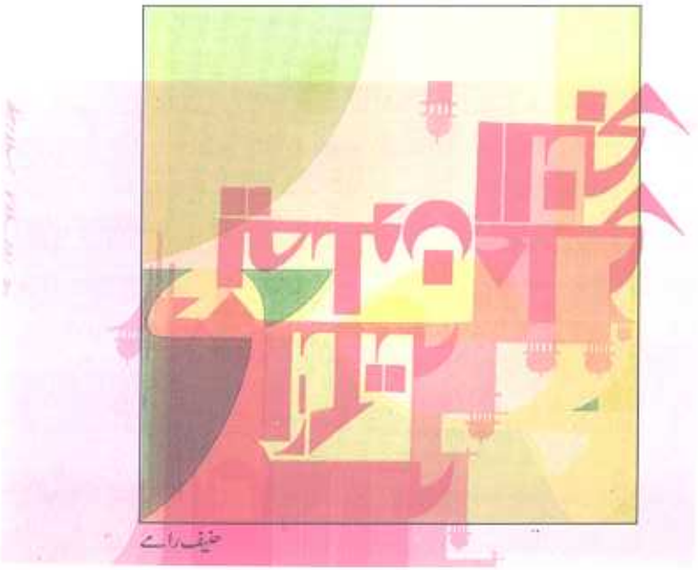

حنیف رامے

آیتِ قرآن حکیم　　خطاطی: محمد علی زاہد لاہور

Adious, Word　　Painting by Ed Rusha in 1967

یا پہلا پل رہی ہے جس پر سے گزر کر مصوری (Art of Painting) دوسرے فنون و ہنر مثلاً ظروف سازی، چوب کاری یا فن تعمیر وغیرہ کے علاقے میں قدم رکھتی ہے۔ ضروری نہیں کہ خطاطی کا نقاش ایک ماہر خطاط بھی ہو۔ لیکن وہ ایک ماہر خطاط ہو بھی سکتا ہے۔ خطاطی کے نقش گر کا اصل منصب حروف والفاظ کے نشست وقیام اور طرز خرام کی فعلیت سے ہم آہنگ نقش تلاش کر کے لفظ، جملہ اور عبارت کو قائم کرنا، سنوارنا اور جلا دینا ہے۔ چنانچہ ایک ماہر نقاش لفظ پر توجہ مرکوز کر کے اس کی پیکریت کا مطالعہ کرتا ہے۔ پھر اس پیکر کو ایک پہلو سے اس کے سائے کی گنجائش اور دوسرے پہلو سے اس کے عکس کی رعایت سے منقش کرتا ہے۔ نقاش اپنی آئندہ نسل کو نقش گری کا علم منتقل کرنے کی بجائے اپنی ہنرمندی کو وراثت کے طور پر سونپ دیتا ہے۔ میراث کا یہ رویہ ایک حرف کو ایک فرد، ایک لفظ کو ایک گھرانہ ایک پیرا کو ایک خاندان، ایک باب کو ایک قبیلہ اور کتاب کو ایک قوم کے طور پر آراستہ اور پیراستہ کرتا ہے۔ ایک نقاش کی سائیکی کے غیب میں جو تحریکی سرچشمے ہوتے ہیں ان میں غلاف خانہ کعبہ پر زریں کشیدہ کاری، قرآن پاک کی تزئین کاری، منبر و محراب کے چوب و سنگ کی نقاشی، منقش کتب اور فن تعمیر سے وابستہ زیب و زینت کے کارہائے نمایاں شامل ہیں۔

کوچۂ خطاطین:

مصورانہ خطاطی کے میدان میں اترنے والا ایک نمائندہ گروہ کوچۂ خطاطین سے ہے۔ اس کوچہ کے افراد عام طور پر واجبی تعلیم رکھتے ہیں اور پیشہ کتابت سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اکثریت اپنے آپ کو اپنے روزگار تک ہی محدود رکھتی ہے۔ بلاشبہ ہر ایک دور میں ان میں ایسے نابغۂ روزگار خطاط بھی موجود چلے آتے ہیں جو تعلیمی لحاظ سے قابل قدر اور فن خطاطی کے اعلیٰ تخلیقی ذوق وشوق سے بہرہ مند اور ابن مقلہ کے ایجاد کردہ خطِ نسخ خطِ ثلث خطِ ریحان خطِ توقیع خطِ رقاع اور خطِ محقق کے اسرار و رموز سے کماحقہ آگاہ اور ان پر ماہرانہ دسترس بھی رکھتے ہیں۔ مصر، ترکی، عراق، ایران اور دیگر ممالک میں صورت پذیر ہونے اور فروغ پانے والے ابن مقلہ کے نقش قلم پر نسخ، ثلث، دیوانی، اندلسی، تعلیق، نستعلیق، سنبلی، مغربی، ملیح، طومار، شکستہ، طغرا، تاج اور خطِ بہار کا شعور کامل رکھنے کے ساتھ ساتھ برصغیر پاک و ہند کے مقامی اثرات کے تحت ثلث، نستعلیق اور نسخ کے جملہ دبستانوں پر عالمانہ نظر بھی رکھتے ہیں۔ ان کی برکت سے استاد اور شاگرد کا رشتہ پورے تقدس کے ساتھ قائم اور سرچشمۂ فیض ہے۔ تلامذہ اپنے اساتذہ کا ادب واحترام ایک مرشد کی طرح کرتے ہیں۔ اسی حد ادب کے باوصف خطاطین نے اختراع یا اجتہاد کے سلسلے میں بیرونی اثرات کے رد وقبول میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ روشنائی کی دوات کے ساتھ کلک بکس اور کاغذ کے ساتھ کینوس کا وجود تو قبول کر لیا لیکن ماضی میں موجود آرائشی اور زیبائشی رسم الخطوں سے ہی استفادے تک زیادہ تر اپنے قرطاس وقلم کو محدود رکھا ہے۔ ان کی سائیکی کے غیب میں تحریکی سرچشموں میں غلاف کعبہ پر خطاطی، روضہ رسولؐ پر خطاطی، قرآن کی خطاطی، مساجد، مقابر اور اہم عمارات پر خطاطی کے لازوال کارنامے ہیں۔ جن کے لاشعوری تناظر میں مائل بہ مصوری خطاطین کا خطِ ماہی، خطِ اسد، خطِ طاؤس، خطِ گلزار، خطِ غبار، خطِ قوام، خطِ ناخن اور خطِ طغرا و تاج میں داد فن دینا بلاشبہ جمالیاتی اثاثوں میں اضافہ کرتا ہے۔ ان خطوں کو بے شک کچھ اہل نظر نے باقاعدہ خط بھی شمار کیا ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ ایک ماہر خطاط جو ڈرائینگ میں بھی مہارت رکھتا ہے وہ ایک ماہی یا مرغ اور پھول یا پھل کا خاکہ (Out Line) بنا کر اس سے متعلق کسی قول یا شعر کی خطِ نسخ یا خطِ ثلث میں خطاطی سے اس خاکے کو معمور کر دیتا ہے۔ یہ کارکردگی اس خطاط کے اندر مصورانہ اپج کا اظہار ہے اور یہ اظہار کی شکل ایک فن پارے کا مرتبہ بھی پا سکتی ہے۔ لیکن ایک علیحدہ خط ہونے کی اس میں کوئی منطق نہیں ہے۔ یہ خط نہیں کہلا سکتا۔ ''خط'' تو ایک سسٹم یا نظام پر

استوار ہوکر اپنی انفرادیت قائم کرنے کے بعد ہی اپنی شناخت کے مراحل میں داخل ہوتا ہے۔ چنانچہ جو رسم الخط اس خاکے کو معمور کرنے کے کام آتا ہے اس کے کسی ذیلی نام سے اسے پکارا جا سکتا ہے۔ مثلاً ثلث سے خاکہ معمور کیا گیا ہے تو اسے ''ثلث تصویری'' یا نسخ سے استفادہ کرنے کی صورت میں ''نسخ تصویری'' کا نام دیا جانا چاہیے جیسے ثلث، نسخ، دیوانی اور مغربی کے ساتھ جلی اور خفی کے لاحقے لگائے جاتے ہیں۔ وگرنہ شمار مشکل ہو جائے گا اور علم الاشیاء کے برابر خطوں کی تعداد ہو جائے گی۔ اس نکتہ نظر کی مزید تفہیم کے لیے ایک مثال عرض ہے۔ مشہور ترک خطاط ولید الاعظمی نے تشہد کی حالت میں نمازی کا خاکہ بنا کر اس کو کلمہ شہادت کی خطِ نسخ میں خطاطی سے بھرپور کر دیا ہے۔ یہ ایک خوبصورت فن پارہ ہے اور اس کے عکس راقم نے تمام قابل ذکر خطاطی کے مرقعوں اور فنون کے عجائب گھروں میں دیکھے ہیں۔ لیکن اس فن پارے کو خطِ صلوٰۃ یا خطِ تشہد سے کسی نے کہیں بھی موسوم نہیں کیا۔ اسی طرح خطاطی سے بھرپور ہاتھی، اونٹ یا چراغ یا سفینہ والی شکلوں کو خطِ فیل، خطِ جمل، خطِ چراغ یا سراج یا خطِ زورق یا خطِ سفینہ کا نام دینا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ البتہ جہاں تک ان کی تزئینی اہمیت اور زیبائشی کردار کا تعلق ہے۔ اس بارے میں دوسری کوئی اور رائے نہ پہلے تھی اور نہ اب ہو سکتی ہے۔

خطِ غبار میں بھی حروف و الفاظ کا خاکہ یا اوٹ لائن بنا کر اس کے باطن یا خارج میں نوک قلم سے نقاط یا عبارتیں لگا کر غبار کی کیفیت پیدا کی جاتی ہے۔ انیسویں صدی کے فرانسیسی مصور جارج سورت کی متعارف کردہ ٹیکنیک پوائنٹلزم (Pointilism) یا ڈویژنزم (Divisionism) بہت مشہور ہے۔ جس نے طباعت میں ایک نیا رجحان فراہم کیا تھا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک ہمارے ہاں افسانوی ادب کی تشریحی مصوری (Illustration) کے لیے رسالوں اور کتابوں میں ڈرائنگ پن کے نقاط سے خاص طور پر کرداروں کی تصویروں میں شیڈ پیدا کرنے کا استعمال عام تھا۔ طباعت کی جدید ٹیکنالوجی کی آمد سے یہ متروک ہو گیا ہے اور اس کی جگہ متوازی افقی عمودی اور ترچھی لکیروں کی کراس ہیچنگ (Cross hatching) سے السٹریشن خاص طور پر ڈائجسٹ رسالوں میں عام ہو گئی ہے۔ چنانچہ خطِ غبار کوئی خط نہیں اور اسی طرح خطِ گلزار اگر کسی حرف و لفظ کو بیل بوٹوں سے سجانے کا نام ہے تو اس کا مسئلہ تو کمپیوٹر کی آمد سے کہیں زیادہ آسان بلکہ اتنا آسان کہ یہ اب یقیناً کسی خطاط کا مرہونِ منت ہی نہیں رہا۔ اس خط کی پیدائش ایک خطاط کی بجائے ایک مصور یا ڈیزائنر بلکہ ان دونوں سے بھی کہیں بڑھ کر کمپیوٹر کے ایک ماہر کے ہاتھوں سے زیادہ بہتر ہو سکتی ہے۔ رہ گئے خطِ قوام اور خطِ ناخن تو یہ دونوں سراسر مہارت سے عبارت ہیں اور دست کاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جس طرح خطِ ماہی اور خطِ غبار کو خط کہنا مخل نظر ہے۔ اسی طرح اس کے برعکس خطِ طغرا اور خطِ تاج باقاعدہ رسم الخط ہیں۔ اس بحث کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک جملہ ہے ''بلبل ایک پرندہ ہے''۔ دوسرا جملہ ہے ''شیر ایک درندہ ہے''۔ ان دونوں جملوں کی خطاطی بلبل اور شیر کی شکلوں میں مطلوب ہے۔ چنانچہ بلبل اور شیر کے خاکے الگ الگ بنا کر بلبل کے خاکے کو بلبل والے جملہ اور شیر کے خاکے کو شیر والے جملہ کی خطاطی سے معمور کر دیں گے۔ کرنے کو بلبل کے خاکے کو شیر والے جملے سے اور شیر والے جملے سے بلبل والے خاکے کو معمور کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی خاکہ اپنی ہیت کے اعتبار سے اپنے اندر کی جانے والی خطاطی کے رسم الخط، متن اور مفہوم و معانی کے ساتھ مطابقت کا عملی طور پر نہ پابند ہے اور نہ اس سے مشروط ہے۔ یہ تو قلمکار کی قلم پر ماہرانہ گرفت ہے کہ وہ خط میں کتنی لچک آمادگی اور سپردگی پیدا کر کے خرد کا نام جنوں اور جنوں کا خرد رکھنے کا کرتب دکھا سکتا ہے۔ وگرنہ شیر کا خاکہ اپنے اندر بلبل والے

جملے کی خطاطی پر معترض اور نہ بلبل کا خاکہ بعضد ہو سکتا ہے کہ اس کے اندر صرف اسی سے متعلقہ جملے کی خطاطی کی اجازت ہے۔ جب بلبل اور شیر دونوں بے اختیار ہیں تو ان کے ناموں کے ساتھ ''خط'' لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ تاہم اگر کسی نوعی تفریق و تخصیص کے پیش نظر نام رکھنا ناگزیر ہو تو پرندوں کے لیے ''خطِ پرند'' اور درندوں کے لیے ''خطِ درند'' سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ یہ پرندوں اور چرندوں کی ہیت میں فن خطاطی کا مظاہرہ بس ایک انداز ہے۔ جس کو طرز بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ طرز ایک ابتدا ہے۔ ریاضت اور مہارت کا ایک لمبا فاصلہ طے کر کے جس کی انتہا ''خط'' کہلاتی ہے۔ آغاز اور انجام ہم مرتبہ نہیں ہوتے۔ ہر ایک کاتب کو ہفت قلم نہیں کہا جا سکتا۔ مقصد یہ احساس دلانا ہے کہ لفظ ''خط'' کا بے دریغ استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے خط کا وقار متاثر ہوتا ہے۔

آیئے اب ان دونوں متذکرہ بالا جملوں کی خطاطی سے بلبل اور شیر کی تصویریں بنانے کے بجائے ان دونوں جملوں کو خطِ طغرا میں لکھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان کے دو الگ الگ طغرے وجود میں آ جاتے ہیں۔ جن کی آپس میں مشابہت تو ہے آپس میں سو فیصد مماثلت نہیں ہے۔ یہ اس قدر اتفاق اور کسی قدر اختلاف ہی ''طغرا'' کے ایک خط ہونے کی دلیل ہے۔ یہی معاملہ ''خطِ تاج'' کا ہے۔ جس میں ایک حرف تاج کی شکل اختیار کرتا ہے یا ایک لفظ کے جملہ حروف ایک تاج کی شکل بناتے ہیں۔ ہر حرف کی شکل چونکہ دوسرے حروف سے جدا ہوتی ہے اس بنا پر تاج کی بننے والی سب شکلیں جدا جدا ہوں گی لیکن تاج کی ہی کوئی شکل ہونے کے ناطے سے سب باہم مماثل بھی ہوں گی۔ یہی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ''خطِ تاج'' کے ایک علیحدہ خط ہونے کی۔ البتہ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کہ خطِ طغرا اور خطِ تاج عبارت آرائی کے لیے نہیں ہیں۔ یہ سراسر تزئینی اور زیبائشی خط ہیں۔ ان کا مصرف اور افادیت خاص طور پر عنوانات، فہرست، ابواب، ابتدا، تکمیل اور تحریر کے دیگر امتیازات کی دلکشی اور متعلقہ حفظِ مراتب کو نظر نواز بنانے تک محدود ہے۔

تزئین و آرائش اور زیب و زینت کی فراہمی صرف تزئین و آرائش کے لیے مخصوص خطوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ ہر ایک رسم الخط کا اپنا ایک جمالیاتی تانا بانا اس کے اندر موجود ہوتا ہے جو آس پاس کے ساتھ جمالیاتی تعاون و اشتراک میں سہولت پیدا کرتا ہے اور عبارت کے پورے ماحول میں خوشگواریت کا باعث بنتا ہے۔ خطِ نستعلیق اپنے حسن و جمال میں بے مثال ہے۔ اس کا قیام اور اس کا خرام لاجواب ہے۔ اس کا توازن و تناسب بے نظیر اور اس کے حروف و الفاظ کا آپس میں تال میل غنائیت کی انتہاؤں کو چھوتا ہے۔ عبارت آرائی میں صدیوں سے اس کا کوئی مثیل نہیں ہے۔ اسی طرح خطِ ثلث اور خطِ نسخ اپنی مثال آپ ہیں۔ دونوں عبارت آرائی کے لیے از حد موزوں ہونے کے ساتھ ساتھ تزئینی محاسن سے آراستہ اور آرائشی گنجائشوں کے حوالے سے چشمہ ہائے حیواں ہیں۔ ثلث اور نسخ کے بارے میں یہی کہہ دینا زیب دیتا ہے کہ جس خطاط کو ترکیب اور ضابطہ کی معرفت حاصل ہو، جو کرسی اور نسبت کے محاسن کا شناسا ہو۔ جسے معلوم ہو کہ خطاطی میں ضعف اور قوت کے کیا معنی ہیں، جو اصول اور حقیقت کو پہچانتا ہو۔ جو صعود اور نزول کی نزاکتوں کا راز داں ہو اور جو اس برگزیدہ فن کے حسن و جمال میں صفا اور شان کی بصیرت رکھتا ہو بس ایک وہ ایسا شائستہ آداب فن ہے جس کو خطِ ثلث اور خطِ نسخ میں دادِ فن دینا زیب دیتا ہے۔ اور جو اپنی زندگی کے بیشتر ماہ و سال ریاضت فن میں صرف کر کے ولایت فن کے مرتبے پر فائز ہو اور اپنے قلم سے موقلم کے سے کرشمات کا مظاہرہ کرنے کی قدرت حاصل کر چکا ہو۔ بس ایک وہ خوش بخت اور عالی مقام ہے جو ''خطِ دیوانی'' میں معجز نگاری کر سکتا ہے۔

خطِ ثلث، خطِ نسخ کے حسن و جمال اور دلکشی و رعنائی کے بارے میں دوسری رائے ہو ہی نہیں سکتی۔ البتہ جن اہل علم کی

رائے میں خطِ کوفی کی اہمیت، موزونیت اور افادیت خطِ نسخ اور خطِ ثلث کی آمد کی وجہ سے متاثر ہوئی ہے۔ وہ اہل علم کم نظری کا شکار ہیں۔ بلاشبہ خطِ نسخ نے خطِ کوفی سے قرآن پاک کی کتابت کا منصب لے لیا ہے اور گزشتہ ہزار برس سے الکتاب (قرآن کریم) کی کتابت اور کسی خط میں نسخ سے زیادہ موزوں مناسب اور معتبر نہیں لگتی۔ بلکہ یوں لگتا ہے کہ خطِ نسخ پیدا ہی اس منصب اعلیٰ کے لیے ہوا ہے۔ لیکن خطِ نسخ اور خطِ کوفی میں رقابت اک خام خیالی ہے۔ خطِ نسخ تو پیدا ہی خطِ کوفی کے بطن سے ہوا ہے۔ خطِ کوفی تو ماں ہے۔ اولاد کی اس سعادت مندی سے ماں کی اہمیت و مقبولیت کیسے کم ہو سکتی ہے۔ چنانچہ خطِ کوفی اپنی ہندسی اشکال کے تنوع اور نظم وضبط کی وجہ سے قرطاس وقلم کو مزین، سقف و درو دیوار کو منقش اور منبر و محراب کو منور اور کتب کے اوراق سادہ کو مصور و معمور کرنے کے غیر مختتم خزانوں کا کلید بردار آج بھی ہے۔

ڈیزائنرز سٹریٹ:

مصورانہ خطاطی کے سلسلے میں کوچۂ مصوراں میں قدم رکھنے سے پہلے اس جہت نو کے خدوخال تراشنے اور اس کے ساختیاتی ڈھانچے کو موزوں اور مناسب بنانے میں اہم ترین خدمت سرانجام دینے والا ایک ذیلی گروہ کوچۂ مصوراں کی ایک ذیلی گلی ڈیزائنرز سٹریٹ (Designers Street) میں مقیم ہے جس نے مصورانہ خطاطی کو پاکستان میں متعارف کروانے اور اسے مقبول عام بنانے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

ہر ایک پینٹر (مصور) کی ذات میں ایک ڈیزائنر بھی ساتھ ساتھ پرورش پاتا، تربیت حاصل کرتا اور تخلیقی عمل میں مسلسل رفاقت فراہم کرتا ہے۔ ڈیزائن کسی بھی آرٹ ورک کا ایک اہم عنصر ہے۔ جو پینٹنگ کی پراگریس کے ساتھ ساتھ اس کے اندرونی جنگلے کو آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ ایک فن پارے کے سامنے کھڑے ہونے سے اشتعال انگیز، اطمینان بخش اور پریشان کن صورتوں میں سے کسی ایک کا سامنا ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک باقاعدہ تربیت کے بعد کسی بھی فن پارے میں اس کے مرکزی خیال، احساسات اور تاریخی سیاق وسباق تک بتدریج رسائی ممکن ہو جاتی ہے اور ان سب کو ایک اکائی میں ڈھالنے والی بنیادی بصیرت یا مہارت جسے ڈیزائن کہتے ہیں۔ اس سے بھی بقدر ضرورت آگاہی ہو جاتی ہے۔ ڈیزائن عبارت ہے مواد، لائن، شیپ اور فارم، سپیس، ٹیکسچر ویلیو (اجالے۔ اندھیرے) کلر اور ٹائم (بتدریج) سے اور یہ عناصر آرٹ ورک میں قابل مشاہدہ ہوتے ہیں۔ یہی عناصر دراصل فنکار کے ہاتھ میں وہ اوزار ہوتے ہیں جن سے وہ جمالیات کے مظاہر تراشتا ہے۔

ڈیزائن میں موٹف اور پیٹرن کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اسلام کی تخلیقی جمالیات کے زیر اثر اپنی قلب ماہیت کے مراحل سے گزرنے والے ان تمام فنون میں فطری انداز میں سما جانے کی اہلیت ایسے موٹف اور پیٹرن زیادہ رکھتے ہیں جو دو ابعادی، متناسب، مجرد، قابل توسیع اور قابل اعادہ ہوتے ہیں۔

فنون لطیفہ کی تربیت و تدریس کے اداروں کی کمی اور آرٹ گیلریوں کی قلت کے باعث یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ پاکستان میں آرٹ آف پینٹنگ کے علمی یا اعلیٰ تصور سے آگاہی رسالوں اور کتابوں میں آرٹ کے مضامین اور نمونوں سے ہوئی اور اسی وجہ سے آرٹ کی کوئی روایت مستحکم نہ ہو سکی۔ آرٹ کے عمومی ذوق کی پرورش رسالوں اور کتابوں کے سرورق اور اندرونی تشریحی مصوری کی مرہون احسان چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ ۲۰۰۰ء تک کتابوں اور رسالوں کے سرورق کی ڈیزائننگ اور اندرونی تشریحی مصوری میں نمایاں نام یہ ہیں۔ عبدالرحمٰن چغتائی، احمد پرویز، انور جلال شمزہ، آذر زوبی، حنیف رامے، جالی، حفیظ سرور، اے

کریم، یوسف، ایس ڈین، موجد، اسلم کمال، سعید اختر، احمد خان، جمیل نقش، صادقین، آفتاب ظفر، اقبال مہدی، ارشد کمال، حمید ساغر، انیس یعقوب، سعید بودلہ، فاروق اور ریاظ۔ رسالے اور کتاب کے نام کے ساتھ ساتھ ایڈیٹر یا مصنف اور بعض اوقات پبلشر کا نام بھی سرورق پر لازمی ہوتا ہے۔ کچھ سرورق کے ڈیزائنر سرورق پر لکھائی یا خطاطی کسی کاتب سے کرواتے آئے ہیں۔ اور کچھ فنکار یہ لکھائی خود ڈیزائن کرتے تو آئے ہیں لیکن انہوں نے حروف والفاظ کی ڈیزائن کردہ شکلوں میں ایک تسلسل میں دلچسپی نہیں لی۔ چنانچہ وہ اپنا کوئی اسلوب پیدا نہ کر سکے۔ لیکن بلاشبہ ان سب فن کاروں نے مصوری اور خطاطی کے مابین اشتراک کی فضا پیدا کرنے سے لے کر عصر رواں میں بتدریج رونما ہوتی ہوئی ایک انقلابی جہت (مصورانہ خطاطی) کے خیر مقدم کے لیے ذہنوں کو آمادہ اور ذوق کو ہموار کرنے میں قابلِ قدر کردار ادا کیا ہے۔ ۲۰۰۰ء تک تین فن کار ایسے سامنے آئے ہیں جنھوں نے حروف والفاظ کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈیزائن کیا اور ڈیزائن کردہ اشکال کی جزوی اور کلی مماثلت میں تسلسل کو مدنظر رکھا۔ یہ تین فن کار حنیف رامے، اسلم کمال اور صادقین ہیں۔ لیکن حنیف رامے کے حروف والفاظ کی تراشیدہ شکلیں ابھی تشکیلی مرحلے میں تھیں کہ وہ سیاست میں قدم رکھ کر سیاسی مصروفیات میں سے حرف ورنگ کے لیے ۱۹۶۳ء سے ۱۹۸۶ء تک کوئی وقت نہ نکال سکے اور جب کوچہ مصوراں میں واپس لوٹے تو انہوں نے اپنے چھوڑے ہوئے تشنہ اسلوب کو آگے بڑھانے کی بجائے عظیم سرمایہ فن خطاطی سے استفادہ کو ترجیح دی۔ اسلم کمال نے روایتی رسم الخطوط کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد دائرے کم کرکے، زاویے بڑھا کر حروف والفاظ کی ایسی ہندسی اشکال تراشنے میں خاص طور پر توجہ مرکوز کی جو روایت سے تعلق برقرار رکھتے ہوئے جدت پذیر ہوں، جن میں رنگ اور دیگر تصویری قدریں زیادہ سے زیادہ گنجائش عمل پا سکیں اور مصوری اور خطاطی کا ملاپ زیادہ فطری انداز اختیار کر سکے۔ صادقین نے حروف والفاظ کی مختلف رسم الخطوط میں اشکال کو اپنے انداز میں ترتیب دے کر عمودی خطوں کو کئی گنا بڑھا کر اور دائروں کو دائرہ در دائرہ متحرک کر کے حروف والفاظ کو ان کے گرداوٹ لائن سے نمایاں کر کے اپنا ایک منفرد اسلوب پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ چنانچہ صادقین اور اسلم کمال کے اسالیب کو خطِ صادقین اور خطِ کمال کے ناموں سے اسلامی خطاطی میں جدید ترین اضافوں کے طور پر ہر سطح پر تسلیم کیا گیا ہے۔

کوچۂ مصوراں:

مصورانہ خطاطی کو رنگ ونور اور برگ وبار سے ہم کنار کرنے والے نمائندہ گروہ کا تعلق کوچۂ مصوراں سے ہے۔ جس کے وہ لوگ جو ابھی میدان مصوری میں نو وارد تھے وہ تو کسی تکلف کے بغیر بلاتردد مصورانہ خطاطی کی تحریک کا حصہ بن گئے لیکن ایسے مصور حضرات جن کی شناخت خاص طور پر ملکی سطح پر مستند تھی، وہ کافی عرصہ تک محوِ تماشائے لب بام رہے۔ تب جا کے کہیں مائل ہوئے تو پھر اس طرح قائل ہو گئے کہ فنِ خطاطی کے بارے میں فن صغیر (Minor Art) کے اپنے نظریے سے دست بردار ہو کر اب اپنے آپ کو مصور کے علاوہ خطاط بھی کہلانے پر راضی ہو گئے۔ ان میں کچھ لوگ سرریلسٹ پینٹر پال کلی کے اس مشہور زمانہ اسلوب کے گرویدہ تھے جس میں ہندسوں، لفظوں اور ان کے اعراب سے مشابہ تصویری عناصر نمایاں ہیں۔ اور کبھی فارم کے اندر شیڈ کر کے کبھی رنگ کا لہجہ بدل کر کبھی ٹیکسچر میں کمی بیشی سے اجتماعی ماحول میں تحریری کیفیت پیدا کی گئی ہے۔ اس گروہ مصوراں کچھ وہ مصور تھے جو جرمن سرریلسٹ پینٹر ویسلے کینڈنسکائی کی کشفی اشکال کے حامل اسلوب کے پیروکار تھے۔ پال کلی اور کینڈنسکائی اتفاق سے دونوں بیسویں صدی کے اوائل میں جرمنی میں تشکیل پانے والے ایک حلقۂ مصوراں بنام (Blue Reiter) جس کا

کی ہراول دستہ ہے کے بانی تھے۔ جس نے یورپی مصوری پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ تیسرے نمبر پر وہ مصور تھے جو ڈچ پینٹر پیٹ موندریاں کی مضبوط سیاہ افقی اور عمودی لکیروں کے باہمی تقاطع سے پیدا ہونے والے مربعوں اور مستطیلوں کے جنگلے میں تین بنیادی رنگوں کے ہمراہ سیاہ سفید اور گرے رنگ کے حامل بظاہر سادہ بباطن پرکار اسلوب کے علمبردار تھے۔

پچاس سالہ امریکن پینٹر ایگنس مارٹن عین اسی زمانے میں یعنی ۱۹۵۸ء (جب اسلامی فنِ خطاطی اور یورپی مصوری باہم آمیز ہونے کے قرینے پاکستان میں تلاش کر رہی تھیں) میں اپنا پہلا ون مین شو کرتی ہے جس میں شامل اس کی ساری پینٹنگز یک رنگی سطح پر پیمانے کی مدد سے پنسل کی لکیروں سے بنائے آدھے، پونے اور پورے گراف یا جنگلے (Grid) کی حامل تھیں۔ اس اختراع کا بہت شہرہ ہوا۔ ذرائع ابلاغ پر زمین اور آسمان کے قلابے ملائے گئے۔ آرٹ اور آرٹسٹوں کی تمام ڈکشنریوں اور ڈائریکٹریوں میں ایگنس مارٹن کے نام اور کام کا تذکرہ موجود ہے۔ راقم نے ''پیس گیلری نیویارک'' میں ایگنس مارٹن کی ایک اور تصویر دیکھی ہے جو بغیر عنوان کے (Untitled) ہے۔ یہ تصویر بڑے سائز کے مربع کینوس پر ہے۔ فریم کے علاوہ اس تصویر کا کل سرمایہ فن آدھ آدھ انچ کے وقفے پر پیمانے کے مطابق پنسل کی متوازی افقی لائنوں سے عبارت ہے۔ یہ لکیری تصویر (Linear Painting) ۱۹۸۲ء میں پینٹ کی گئی ہے۔

بات کو آگے بڑھانے کے لیے اور امریکی ناقدین کی ہمنوائی میں اس تصویر کی تحسین میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فن پارہ متوازی سیدھی لکیروں کی حسن آفرینی کا ایک استعارہ ہے۔ آرٹ آف پینٹنگ کے اعلیٰ مغربی ناقدین کی اکثریت کے بقول خطاطی عمدہ نویسی کا آرٹ ہے۔ جو تاریخ کے ہر دور میں مسلم معاشروں کے علاوہ چین اور جاپان میں انتہائی ترقی یافتہ فن ہے۔ اور اعلیٰ فن خطاطی کے نمونے دو ابعادی (Two Dimentional Paintings) پینٹنگز پہلے ہیں اور پڑھے جانے والے الفاظ بعد میں ہیں۔ کیونکہ جو لوگ ان الفاظ کو پڑھ نہیں سکتے ان کے ذہنوں میں ان کے معانی کے لیے سوالات بھی پیدا نہیں ہوتے۔ لہٰذا یہ لکیریں خالصتاً تجریدی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ ناظر کی روحانیت میں مدوجزر پیدا کرنے کی تاثیر رکھتی ہیں۔ اس حوالے سے آرٹ آف پینٹنگ کے مغربی اہل نظر اپنی آراء یوں سمیٹتے ہیں کہ ڈچ پینٹر موندریاں کی مضبوط سیدھی کالی لکیروں سے عبارت پینٹنگز اگر ''لکیروں کا سازینہ'' ہیں تو یہ مصری ترکی عراقی ایرانی خطاطی کے فن پارے ''لکیروں کا گیت'' (Melody of Lines) ہیں۔

اس تناظر میں جدید یورپی مصوری کے جدید تر رجحانات یا نو بہ نو میلانات کی یلغار کے زیرِ اثر نوزائیدہ پاکستان کے مصوروں کا تہذیبی میلان خاطر اسلامی خطاطی کی قدیم اور عظیم روایت میں اپنی شناخت کے لیے موزوں ترین خدوخال کا متلاشی تھا۔ یا پھر بدلتے ہوئے عالمی تہذیبی تناظر میں خود اسلامی فن خطاطی اپنی نشاۃ ثانیہ کے لیے عصری بصیرت کی روشنی میں کسی تعبیر نو کی تلاش میں جس سمت رواں تھا ادھر آگے سے عالمی منظر نامے میں نو بہ نو حالات کا ریلا اپنے دامن میں جو تخلیقی امکانات اور تہذیبی اثرات بھر کر لا رہا تھا اس میں یورپ کے پہلے جدید مصور ایڈورڈ مانے کی رسمی مصوری کے خلاف بغاوت۔۔ جارج سورت کا پوائنٹیلزم۔۔ لوسین پسارو کی درجہ وار رنگ کاری۔۔ آگسٹ رینوئر کے رنگوں کی عبوری روشنی، سایہ، دھوپ اور چھاؤں۔ تاؤلیوس لیوترک کا رنگوں میں ڈرامہ۔۔ گستاو کلمٹ کے نقرئی اور طلائی زیوراتی نقش و نگار۔۔ جارج براق کا اشیاء کے گرد سفید اوٹ لائن سے ان کو نمایاں اور تنہا کرنے کی تکنیک۔۔ ویسلے کینڈنسکائی کی کشتی اشکال۔۔ پال کلی کا حرفوں اور ہندسوں کا ہیروغلیفی اسلوب۔۔ پال گوگین کی علامتی رنگوں کی سطحیں۔۔ وین گاگ کا متحرک اور مضطرب کینوس۔۔ پابلو پکاسو کی فنکارانہ بے راہ روی۔ ضدین کا

آمنا سامنا اور ہمزاد سے ہمکلامی۔۔ پیٹ موندریاں کی سادگی و پرکاری۔۔ رابرٹ ڈیلانے کا تجرید اور پیکر کے مابین ''رنگوں کا اورکسٹرا'' شامل تھا۔ لیکن چونکہ یورپ میں "Word Painting" اور "Language Painting" کے ناموں سے ایک رجحان تو چلا آ رہا ہے مگر ابھی تک یہ رجحان روایت نہیں بن سکا۔ اس لیے یورپی مصوری کا یہ قافلہ اپنے ''رنگوں کا اورکسٹرا'' لے کر جس کی تلاش میں تھا وہ ''لکیروں کا گیت'' اس کو مشرق میں اسلامی خطاطی کی روایت نے فراہم کر دیا۔ اور اتصال و وصال کے نتیجے میں تشکیل پانے والا پیرایہ مصورانہ خطاطی کہلاتا ہے۔

اس پیرایۂ اظہار میں قدم رکھنے والے فن کار کو عمل تخلیق کے ہر مرحلۂ شوق میں تزکیۂ نفس کی ایک باطنی مسافت کا نادر تجربہ درپیش ہوتا ہے۔ ہمت ساتھ دے تو اک وادی غیر ذی ذرع میں کوہ صفا سے کالے سفید اور سرمئی رنگ نوکیلے تیز دھار پتھروں پر پابرہنہ چل کر ظلمت سے نور کی طرف اسے کوہ صفا تک جاتا ہے۔ (۱) نصیب یاور ہو تو کوہ صفا سے واپس کوہ مروا تک انہی سنگ و خار پر بچھے ہوئے صراط مستقیم پر چلتے ہوئے وہ خطِ مستقیم کھینچنے کا ہنر سیکھتا ہے۔ (۲) کوہ مروا سے اترتا ہے اور راہ کے دشوار گزار فیکچر پر عمودی، افقی، ترچھے اور تنگ زاویہ نوکدار خط کی مشق کرتا کوہ صفا پر چڑھتا ہے۔ (۳) کوہ صفا سے پلٹ کر کوہ مروا کی جانب اس پتھریلے موزیک پر خط کو بامعنی حسن پرور، خیال انگیز اور ناطق بنانے کی سعی کرتا چلتا ہے۔ (۴) کوہ مروا سے اتر کر کوہ صفا تک سوا نیزے پر سورج کے تلے اشیاء کی حقیقت، ہیت اور حجم اور رنگ، رنگ کی شدت رنگ کے درجات، رنگ کی قدر کی معرفت کے لیے مناجات کرتا ہے۔ (۵) کوہ صفا سے صحرا کی صرصر و سموم کے سیل بلا میں واپس کوہ مروا تک وہ حسن توازن حسن تسلسل اور حسن تخیل کی توفیق مانگتا چلتا ہے۔ (۶) کوہ مروا سے وہ آبلہ پا کوہ صفا تک التجا کرتا چلتا ہے۔۔۔ تعریف سب تیری اے کن سے کائناتیں پیدا کرنے والے! مجھے تخیل کی جولانی دے، خط تخلیق میں روانی عطا فرما، مجھے رنگوں کی فراوانی دے۔ فراوانی میں مجھے شعور شکر ہنر میں ارزانی فرما۔ (۷) کوہ صفا سے بائیں جانب نشیب میں اتر کر آب زم زم سے اپنی کشت فن سیراب کرتا ہے۔ وہ مطاف میں قدم رکھ کر اندر کی جانب قوس بناتی لکیر پر چلتا ہوا پہلے شوط میں کہتا ہے۔۔۔ اے زمین اور آسمانوں کے نور! میں تیرے گھر میں اپنی عاجزی اوڑھ کر چلا آیا ہوں:۔

(۱) میرے پاس قلم مو قلم رنگ روشنی ہنر مہارت علم شعور کچھ بھی نہیں۔ یہ میں سب کچھ تیرے خزانوں سے لینے آیا ہوں۔ (۲) مجھے آوازوں کو رنگوں میں دیکھنے کی بصارت اور رنگوں کو لفظوں کی طرح پڑھنے کی بصیرت بخش دے۔ (۳) مجھے دلوں میں گزرنے اور روحوں اترنے کی سہولت عطا کر۔ (۴) میرے حواس میں اپنے دیدار کا یقین روشن کر دے۔ (۵) لبیک اللّٰھم لبیک، لبیک لاشریک لک لبیک۔ (۶) لبیک اللّٰھم لبیک۔ (۷) تب سارے لفظ حجر اسود پر ایک بوسے میں بدل جاتے ہیں اور ساری صدائیں نگاہ بن کر کعبہ کی مکعبیت پر پھیل جاتی ہیں۔ تب سارے رنگوں کو ایک خط میں سمیٹ لینے کی اہلیت اور خط کھینچے بغیر خط کا احساس پیدا کر دینے کی صلاحیت بخش دی جاتی ہے۔ تب فن کار اپنے ارضی شعور کے کینوس پر سجدہ ریز رہ جاتا ہے اور آگے یہاں سے اس کا کائناتی شعور بڑھتا ہے اور کعبہ کے مکعب کی فارم میں ترفع پذیر ہو کر خلاؤں میں صعاد کرتا ہوا آنسوئے افلاک میں کسی عرفات پر ایک ایسے ''آباد گھر'' کا دروازہ اس پر کھلتا ہے جس کے در و دیوار پر خورشید فلک غیب اپنی شعاعوں سے عرش بریں، لوح محفوظ اور کتاب مسطور کے ظلال و عکوس تحریر کرتا ہے۔ جن کی رویت اور جلوہ سے معمور ہو کر کائناتی شعور سفر مراجعت میں خلاؤں سے کعبہ کے مکعب پر نزول کرتا ہے اور اس خاکداں پر سجدہ ریز کے ارضی شعور کو اپنے زر سلوک سے منور کر دیتا ہے۔ فنکار دائرہ در دائرہ مطاف سے نکل کر کوہ صفا سے کوہ مروا کی جانب خطِ مستقیم پر چلتا ہوا اپنے خارج میں نکل آتا ہے۔ ایزل پر کینوس چڑھاتا ہے اور کینوس کائناتی ہو جاتا ہے۔

گم شدہ اسلم کمال

مبصر: ڈاکٹر خورشید رضوی

ایک گم شدہ کتاب کی تلاش میں خاصا وقت صرف ہوا۔ یہ کتاب مجھے خود مصنف نے کچھ عرصہ پہلے دی تھی اور میں نے اسے پڑھنا بھی شروع کر دیا تھا اور یہ مجھے پسند بھی آ رہی تھی لیکن ہم جس زمانے میں رہتے ہیں اس میں اور سب کچھ ہے ارتکاز نہیں۔ مختلف مصروفیات نے مجھے درمیان سے اچک لیا اور پھر یہ کتاب میری نگاہ سے اوجھل ہو گئی اور میرا دل اس میں اٹکا رہ گیا۔ غالباً کالیداس نے شکنتلا میں ایسے موقعوں کے لیے اس جھنڈے کی تشبیہ استعمال کی ہے جسے لے جانے والا ایک سمت میں لے جا رہا ہے مگر اس کا پھریرا باد مخالف سے مخالف سمت میں اڑ رہا ہے۔ پھر دل پر ریزہ ریزہ کاموں کے اور ریلوں نے دباؤ ڈالا اور رفتہ رفتہ یہ کتاب، ناتمامی کی اس خلش سمیت، اس ہجوم میں دب کر بظاہر فراموش ہو گئی۔ اتنے عرصے کے بعد اب جو اس کا خیال آیا تو یہ محسوس کر کے تعجب ہوا کہ میرا دل ہنوز اس میں اٹکا ہوا ہے اور اس ناتمام کہانی کو تمام کرنے کی خواہش ہنوز اس کی دامن گیر ہے۔ تب میں نے کتابوں کے جا بجا پھیلے ہوئے انبار میں سے اسے ڈھونڈ نکالنے کا عزم کیا۔ شاید یہ عزم بہت پختہ اور سچا تھا کہ گھاس کے ڈھیر میں سوئی مجھے مل ہی گئی۔

صاحبو! کتاب کا نام ہے ''گمشدہ'' اور یہ لفظ مصنف کے اپنے قلم سے اس کے سرورق پر ثبت ہے جس کے نیچے مصنف نے بقلم خود اپنا نام بھی لکھ دیا ہے ''اسلم کمال''۔ بظاہر سادہ سے یہ تین لفظ بڑے پُرکار ثابت ہوئے کیونکہ کتاب پڑھنے کے بعد جب دوبارہ ان پر نظر ڈالی تو ایک نئے عمق کا احساس ہوا۔ وہ یہ کہ ''گمشدہ اسلم کمال'' پورے کا پورا کتاب کا نام ہے اور مصنف کے طور پر کوئی نام درج نہیں۔ یوں ''اسلم کمال'' جس نے پہلی قراءت میں اپنے وجود کا اثبات کیا تھا، اب گم ہو چکا تھا۔ اس کے برعکس عنوان کے نیچے جو تصویر ثبت ہے وہ آغاز میں بلا عنوان سامنے آئی تھی لیکن کتاب ختم کرتے کرتے از خود یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس کا عنوان ''ملاقات'' ہے جس کا اطالوی مصور جے کوپو پونٹورمو کتاب کے اختتامی رؤیا میں ہدہد بن کر اڑتا اور لوقا کی انجیل سے وہ آیات تلاوت کرتا ہے جن میں الیشبع اور مریم کی ملاقات ہوتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے بطن میں مضمر برکتوں کا احساس کرتی ہیں۔ ''الیشبع'' انجیل میں ''زکریاہ'' کی بیوی کا نام ہے! جو ہارون کی اولاد سے تھی اور بانجھ تھی اور پھر بشارت خداوندی سے آبستہ ہوئی اور ماں بنی۔ قرآن مجید میں بھی اس واقعے کی تصدیق ملتی ہے جس کی طرف کتاب کے آخری صفحات میں، بلا حوالہ، اشارہ کیا گیا ہے۔ کتاب کا انتساب ''اس کائنات میں الارض کے نام'' بھی اتنا ہی تہ دار ہے۔ ''الارض'' گویا ''الیشبع'' کی ہم زاد ہے اور بانجھ ہو چکی ہے اور بشارت کی منتظر ہے۔ جس میں اس کی کوکھ ہری ہو جانے کا امکان ہے اور یہی امکان اور اس کی

تلاش اس کتاب کا حقیقی موضوع ہے۔

ہر نئی روایت میں ایک نیا عمق دکھانے والی اس پراسرار کتاب سے مجھے ہیبت محسوس ہوئی جو اپنے خارج میں اوسلو سے لندن کا چند روزہ سفرنامہ ہے لیکن جو اپنے بطون میں وقت اور اس کے لامتناہی اسرار اور پھر وقت سے ماورا امکانات کا ایک ایسا منظرنامہ لیے ہوئے ہے جو ازل اور ابد کی قوسین میں آنے سے ابا کرتا ہے۔ ظاہر و باطن کے اس متوازی سفرنامے میں واقعات کی بافت میں جا بجا خوابوں کی کترنیں لگائی گئی ہیں جو رفتہ رفتہ یوں غالب آتی چلی جاتی ہیں کہ بالآخر ''واقعات'' محض وہ کھونٹیاں رہ جاتے ہیں جن پر یہ خواب لٹکائے جا سکیں۔ خواب اور حقیقت، منظر اور پس منظر ایک دوسرے میں گھل مل کر ایک ایسی اکائی میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں جس کا ہنوز کوئی نام نہیں۔

نفی اسباب کی علامت اور گھٹا ٹوپ ناامیدی میں امید کی رمز، الیشبع، ''گمشدہ'' میں بار بار نمود کرتی ہے اور دنیائے اسباب کی شیشے دار کھڑکی پر اپنی نوک انگشت سے دستک دیتی ہے۔ اس دستک کے جواب میں کھڑکی کھولنا غیر ضروری بھی ہے اور ناکافی بھی۔ اس کے جواب میں دروازۂ دل وا کرنا ہوگا۔ الیشبع کے پاس ایک خاص پیغام اور ایک بھاری امانت ہے، خداوند کے نام ایک خط۔ اس کا پرتحکم تقاضا ہے کہ ''جاؤ اپنے آپ سے جدا ہو کر کے جلدی سے آ جاؤ'':

حجاب راہ توئی حافظ از میاں بر خیز
خوشا کسے کہ دریں راہ بے حجاب رود

وہ عصر رواں کے سوا کسی اور زمانے کی طرف لے جانے کے لیے بھیجی گئی ہے جہاں وقت کے ہند سے کسی نامعلوم علم حساب کے ہیں۔ الیشبع، وجود الٰہی کی سرتاپا گواہ، امید و امکان کی نمائندہ، مجذوب فرنگی کی بڑ پر آتش غیظ سے بھڑک اٹھتی ہے مگر اس کی نفی کے بدن پر اثبات کی کھال کو خوب پہچانتی ہے۔

کتاب کی بیرونی تہ عصر رواں کے متحرک پیکروں سے بنی ہے۔ لذائذ جسم میں ڈوبی ہوئی ثقافت کے رواں دواں پیکر، گرل فرینڈز، نیوڈ ماڈلز، دعوت بارنگا ہیں اور ادائیں لیے سیاہ و سفید نسوانی پیکر، غول بیابانی کی طرح بوسونگھتی طوائفیں، پب، کڑوی، رقص تن اور مختلف خطوں، تہذیبوں اور مذہبوں کے نمائندہ عام سے مرد و زن، یہ سارا مسالہ اسلم کمال، کمال چابکدستی سے ''گمشدہ'' کے چاک پر چڑھا کر اسے اپنے قلم سے یوں گردش دیتا ہے کہ پہلے یہ سب گتھ کر ایک تودے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور پھر ان کثافتوں سے ان لطافتوں کے خدوخال ابھرنا شروع ہوتے ہیں جو ان کے اندرون میں گندھی ہوئی تھیں۔ آرٹ اور اس کی مبہوت کرنے والی تاریخ، وقت اور اس کی طاقت، شخصیتیں اور ان کا سحر، مثلاً ایک سو بیس سالہ کلاڈیا ڈورس کی شخصیت جو Ancient mariner کی طرح مسحور کر لینے کا عمل جانتی ہے، ہائیڈیارک کے حواس باختگاں کی اداس کر دینے والی دانش.....

''گمشدہ'' ایک جغرافیائی سفرنامہ نہیں زمانوں کے آر پار ایک سفرنامہ ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے مجھے Axel Munthe کی عجیب و غریب کتاب The Story of San Mickele یاد آئی جس کے بارے میں یہی فیصلہ نہ ہو سکا کہ وہ کیا

ہے، آپ بیتی یا افسانہ یا فنتازیہ یا کچھ اور یا سب کچھ۔ اسلم کمال نے بھی آپ بیتی اور افسانے اور فنتازیے کو ملتھا ہے اور بار بار اس میں سے اس رؤیا یا وژن کا جوہر نکالا ہے جس کی بشارتیں اسے الیشیع سے ملتی ہیں۔ یہ رؤیا اسے فائل سے نکل جانے اور غول سے جدا ہو جانے پر آمادہ کرتا ہے، اس کے پسندیدہ سیگل جوناتھن کی طرح اور اسی کے زیر اثر وہ بالآخر اوسلو واپس جانے والے غول سے بچھڑ جاتا ہے اور ایک خوابناک دھند میں ایک متوازی سفر اختیار کرتا ہے جو بظاہر اضغاث احلام کی طرح بے سروپا مگر باطن میں گہرے حوالوں سے مربوط ہے۔ اس رؤیا میں گم ہو جانے والے اسلم کمال سے ایک ہسپانوی حسینہ جو سن سکتی ہے مگر بول نہیں سکتی۔ (کیا وہ مسلم ہسپانیہ کی گنگ عظمت رفتہ سے کنایہ ہے) لکھ کر پوچھتی ہے:

''کہاں گم ہو گئے ہو، کہاں کھوئے ہو، کسے ڈھونڈ رہے ہو'' اور وہ جواب دیتا ہے:

''میں ایک ایسے کردار کو دیکھ رہا ہوں یا اس کو ادھر ادھر ڈھونڈ رہا ہوں جو بیک وقت فرضی بھی ہے اور حقیقی بھی ہے۔ وہ کردار حالات کی ناسازگاری کو دیکھ دیکھ کر اپنی حوصلہ شکنی کرنے کی بجائے حالات کو بدل دینے پر یقین رکھتا ہے۔ وہ کردار راہ کے پہاڑ کے جم کی ہیبت کو اپنے اوپر طاری کرنے کے بجائے پتھر پر اپنا تیشہ مار کر اپنے لیے حوصلہ افزائی کی آواز خود پیدا کر لیتا ہے''۔

یہاں اسلم کمال کے مرشد اقبال کی روح اس کی زبان پر بول رہی ہے جبکہ اقبال کی زبان پر اس کے مرشد رومی کی روح بول رہی تھی۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمریان ست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

اسلم کمال کو طلب ہے اس کردار کے دیکھنے کی جو نظر کم آتا ہے، اسے بغور ڈھونڈنا پڑتا ہے وہ جس کا ذکر اقبال نے یوں کیا ہے:

در مغز ہیاں بودم پُر جستم و کم دیدم
مردے کہ حقایاتش ناید بحساب اندر

''گمشدہ کی تہ دار عبارتوں میں گندھے ہوئے وسیع مطالعے کو اگر یوں کھود کھود کر برآمد کرنے لگیں تو قرآن اور بائبل سے لے کر مشرق و مغرب کے سینکڑوں قدیم و جدید شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کے شاہکار اقوال و اشعار تک، جگمگاتی دانائیوں کے انبار لگ جائیں جنہیں اسلم کمال نے ایک باکمال مصور کی حیثیت سے گویا پیش کر کے اپنے رنگوں میں ملا لیا ہے۔ اسلم کمال کی جزئیات نگاری دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا مصورانہ حافظہ مادام کلاڈیا ڈورس کی لمبی پھول دار میکسی، ہلکے نیلے سویٹر، شانوں پر آسمانی شال، پاؤں میں لمبی موٹی جرابوں اور بند جوتے، سر پر سفید زمین پر ہلکے نیلے پھولوں والے سکارف، کانوں میں چھوٹے چھوٹے آویزوں اور گلے میں موتیوں کے ہار وغیرہ وغیرہ کا وہ باریک نقشہ کھینچتا ہے جیسے وہ قلم سے نہیں موقلم سے لکھ دیا ہے۔ اسلم کمال کو آرتھر کونسلر کی اس دانائی کا گہرا شعور حاصل ہے کہ:

Statistics do not bleed; it is the details that count

چنانچہ محض یہ کہہ دینا کہ مادام ڈورس ایک سو بیس برس کی تھی وہ اثر پیدا نہیں کر سکتا جو اسلم کمال نے تقریباً دو صفحوں پر پھیلی ہوئی تفصیلات کے موازنے سے پیدا کیا ہے۔ مادام کے زمانہ شباب کے مجسمے کو ناطق کر کے اسلم کمال نے اس کی زبانی کہلوایا ہے:

''میں حقیقتیں شمار کرتی ہوں اور تم یقین کرتے چلے جاؤ..... روس کے چرنوبل نیوکلیائی پلانٹ کے پھٹنے سے پھیلنے والی تابکاری کے پیدا کردہ خوف و ہراس کے اس ماحول میں آج میں کلاڈیا ڈورس ایک سو بیس برس کی ہو چکی ہوں۔ اس خاکداں سے روانہ ہو کر جب انسان نے چاند کی سطح پر قدم رکھا تھا، میں اس وقت ایک سو تین برس کی تھی..... جدید نفسیات کے امام سگمنڈ فرائڈ کی موت کے چار سال بعد جس دن ریڈیو پر یہ خبر نشر ہوئی کہ مارکونی فوت ہو گیا اس دن میری عمر اکہتر برس کی تھی..... آئن سٹائن کو نوبل انعام ملنے سے چار سال پہلے اور مصوری میں ڈاڈاازم کی پیدائش کے ایک سال بعد جب روس میں کمیونسٹ انقلاب آیا، اس دن میں اکیاون برس کی تھی..... زخمیوں کی مسیحا فلورنس نائٹ انگیل نے جنگ کے جنونیوں سے اٹی ہوئی مریضوں اور معذوروں سے بھری ہوئی اس دنیا سے جس سال کوچ کیا تھا میں اس سال چوالیس برس کی تھی..... نوبل انعام کا بانی اور ڈائنامائیٹ کا موجد الفریڈ نوبل جس سال فوت ہوا تھا میری عمر اس وقت تیس برس کی تھی اور میں ایسی ہی تھی جیسی اس مجسمے میں ہوں''.....

گہرے اسلوب میں، مضبوط قلم سے لکھی ہوئی ''گمشدہ'' ایک مصور کی بنائی ہوئی ایسی تصویر ہے جس میں نو بہ نو رموز و علائم کی ایک دنیا آباد ہے۔ اس کی بافت میں ہزاروں نقش چھپا دیے گئے ہیں۔ ہر نظر میں اچانک کوئی ایسا گوشہ منور ہو جاتا ہے جو پہلی بار نظر میں نہیں آ سکا تھا۔ ایسی کتاب کا تقاضا یہی ہے کہ اس پر اپنے تاثر کو ناتمام سمجھا جائے اور ناتمام چھوڑا جائے۔

حاشیہ

۱ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اسم ''الیشیع'' موجودہ اسم ''ایلزبتھ'' ہی کی ایک قدیم صورت ہے۔ اس کتاب کی لوکیل لندن میں خاص طور پر گرین پارک ہے جو شاہی محل ''بوکنگھم پیلس'' سے متصل ہے۔ اس تناظر میں قدیم ''الیشیع'' اور معاصر معروف حکمران ایلزبتھ کے وجدانی کردار اسلم کمال کے تخلیقی تصرف میں ایک ایسا استعارہ بن جاتے ہیں جو قاری پر ایک اور ہی جہان معانی کے دروازے کھول دیتا ہے۔

شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی کی چند مطبوعات کا جائزہ

مبصر: رضا احمد

قومیں زبانوں کے قالب میں اپنی سماجی، تاریخی، ادبی اور مذہبی شناخت کو زندہ رکھتی ہیں۔ اسی زندگی کے تحفظ کی ایک خوبصورت کاوش جامعہ کراچی میں ۱۹۵۷ء میں شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کے قیام سے نمو پذیر ہوئی، جس کا بنیادی مقصد بحیثیت قومی زبان ''اردو'' کے نفاذ، ترویج اور تحفظ کو یقینی بنانا تھا۔ صرف چھ سال کے قلیل عرصے میں اس ادارے نے اپنے مقاصد کو اس جاندار انداز میں آگے بڑھایا کہ ۱۹۶۳ء میں جامعہ کراچی اور اس سے منسلک دوسرے اداروں میں اردو کو انگریزی کے متبادل کے ذریعہ اظہار کے طور پر تسلیم کرلیا گیا۔ بعد میں یہ پالیسی وسیع ہوکر پورے ملک کی جامعات میں تسلیم کرلی گئی۔ اس جدوجہد میں میجر آفتاب حسن مرحوم نے کلیدی کردار ادا کیا جو شعبہ تصنیف وتالیف ترجمہ کے سربراہ تھے۔ اس شعبے نے اگرچہ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۷۶ء کے ۱۹ طویل برسوں میں صرف ۵۲ کتب شائع کیں جو اس تیز رفتار دور میں بہت کم لگتی ہیں لیکن وسائل کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو یہ تعداد کسی کارنامے سے کم نہیں لگتی۔

۱۹۶۳ء میں ہی ''شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ'' نے ''جریدہ'' کا آغاز کیا۔ آغاز سے ۱۹۸۵ء تک اس کے ۱۷ شمارے شائع ہوئے۔ ۲۰۰۱ء میں ڈاکٹر ظفر سعید سیفی کے شیخ الجامعہ مقرر ہونے کے بعد انہوں نے ڈاکٹر معین الدین عقیل کو اس شعبے کا سربراہ مقرر کیا جنہوں نے ۱۷ سال بعد نہ صرف ''جریدہ'' کا دوبارہ اجرا کیا بلکہ کتب کی اشاعت کا سلسلہ بھی شدومد سے جاری کیا۔

اس وقت ہمارے پیش نظر شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ جامعہ کراچی کی درج ذیل مطبوعات کا تذکرہ وتبصرہ مقصود ہے۔

۱۔ جریدہ۔ شمارہ ۱۸ تا ۲۱، جون ۲۰۰۲ تا جون ۲۰۰۳ء (۴ شمارے) کراچی: شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ جامعہ کراچی، قیمت ۱۰۰ روپے فی شمارہ

۲۔ مخزن ادب۔ مرتبہ شعبہ اردو۔ کراچی: شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ جامعہ کراچی، ۲۰۰۳ء، قیمت ۱۰۰ روپے

۳۔ یاد ہے سب ذرا ذرا (عبید الرحمن۔ کراچی: شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ جامعہ کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۳۲۹، قیمت ۳۰۰ روپے

۴۔ بلاگم وکاست۔ خودنوشت سوانح (مہدی علی صدیقی۔ کراچی: شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی ۲۰۰۲ء، ص ۳۷۲، قیمت ۳۵۰ روپے

۵۔ افکار وحوادث جلد سوم (عبدالمجید سالک مرتبہ محمد حمزہ فاروقی۔ کراچی: شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ جامعہ کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۲۹۰

۶۔ افکار وحوادث جلد چہارم (عبدالمجید سالک مرتبہ محمد حمزہ فاروقی۔ کراچی: شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ جامعہ کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۳۷۱، قیمت ۲۰۰ روپے

''جریدہ'' کے ۱۸ ویں شمارے میں ''پیش لفظ'' کے عنوان کے تحت ڈاکٹر ظفر سعید سیفی شیخ الجامعہ کراچی نے ''شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ'' کے قیام، غرض وغایت اور تاریخی ارتقا پر بڑے جامع انداز میں روشنی میں ڈالی ہے۔ ''معروضات'' کے عنوان کے تحت صدر شعبہ ڈاکٹر معین الدین عقیل نے تکنیکی حوالے سے اس شعبے کے مقاصد کو مختلف اجزا میں تقسیم کر کے پیش کیا ہے۔ خاص طور پر ادارے کی مستقبل میں سرگرمیوں کا مربوط خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ ماضی میں یہ ادارہ اپنے مقاصد سے پوری طرح انصاف نہیں کر پایا۔ کام کی رفتار ہمیشہ سست رہی ہے لیکن امید ہے کہ اب صدر شعبہ ادارے کو فعالیت عطا کریں گے۔

''جریدہ'' کا یہ شمارہ ''ابلاغ عامہ، صحافت اور برقیاتی رابطہ عامہ'' سے متعلقہ اصطلاحات پر مشتمل ہے۔ آخری صفحے پر شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ جامعہ کراچی کی فرہنگوں کی فہرست ہے، جس میں ۱۲ مطبوعہ اور ۳ زیر طبع فرہنگیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مطبوعات کے حصول کے لیے پتہ، ای میل، فیکس اور فون نمبر بھی دیے گئے ہیں۔

خوش قسمتی کی بات ہے کہ ''جریدہ'' تجاویز کی لمبی چوڑی بحث میں پڑنے کی بجائے عملی طور پر اردو کو رائج کرنے کے اقدامات کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف انگریزی الفاظ کے متبادل اردو الفاظ اصطلاحات کی صورت میں دیے جاتے ہیں۔ جریدہ شمارہ نمبر ۱۹ ''اصطلاحات، جمالیات وفنون لطیفہ اور انٹرنیٹ کی مفید عام اصطلاحات'' کے ذیلی عنوان کے تحت پیش کیا گیا ہے۔

حرف آغاز معروضات کی شکل میں ڈاکٹر معین الدین عقیل نے لکھا ہے جس میں دور جدید میں انٹرنیٹ کے استعمال کی وسعت اور اس حوالے سے اردو اصطلاحات کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ فرہنگ میں ''اصطلاحات جمالیات وفنون لطیفہ'' جناب اکبر وفا فانی اور ادارے کی مشترکہ کاوش ہیں۔ جبکہ ضمیمہ ''انٹرنیٹ کی مفید عام اصطلاحات'' کے نام سے صدف حسن نے پیش کیا ہے۔

سبھی اصطلاحات کو زبان کے اعتبار سے الگ شناختی حروف کے ساتھ واضح کیا گیا ہے مثلاً انگریزی سے متعلقہ اصطلاحات کے ساتھ (E) فرانسیسی کے ساتھ (F) یونانی کے ساتھ (GK) جرمن (G) جاپانی (J) ہسپانوی (SP) سنسکرت (SR) وغیرہ کے حروف بھی لکھے گئے ہیں۔

حروف خوانی میں اکرم شریف، عمر حمید ہاشمی اور سیدہ نسرین کاظمی نے بڑی احتیاط سے اپنا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پروف کی غلطی شاید ہی ملے۔ سبھی اصطلاحات انگریزی کے حروف تہجی کے عنوانات کے تحت ترتیب دی گئی ہیں۔ جس سے نہ صرف ظاہری خوبصورتی اور توازن پیدا ہوا ہے بلکہ مختلف الفاظ کی اصطلاحات کی تلاش کا عمل بھی سہل ہوگیا ہے۔ معروضات کے عنوان سے ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اس ارادے کا اظہار بھی کیا ہے کہ:

> ''ہمارا ارادہ ہے کہ ''جریدہ'' کے اگلے شماروں میں اصطلاحات کے ساتھ ساتھ ایسے بلند معیار مختصر تحقیقی مقالات بھی اردو میں شائع کیے جائیں جو انکشاف یا دریافت کی حیثیت رکھتے ہیں''۔

مجموعی حوالے سے یہ شمارہ پیشکش کے اعتبار سے متوازن اور خوبصورت ہے۔

''جریدہ'' کا بیسواں شمارہ ''فرہنگ اصطلاحات ماحولیات'' پر مشتمل ہے۔ معروضات کے زیر عنوان ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ شمارہ جناب عظمت علی خاں کی تن تنہا کاوش ہے۔ عظمت علی خاں سائنسی تراجم کے ساتھ

مجلّہ ''جدید سائنس'' کے مدیر بھی ہیں۔ فرہنگ کے بارے میں تکنیکی معاونت عمیر حمید ہاشمی صاحب نے فراہم کی ہے۔ معروضات میں ہی ڈاکٹر معین الدین عقیل کی اپیل بھی شامل ہے جو ایسے حضرات کا ضمیر جنجھوڑتی ہے جو نایاب کتب اپنی ملکیت میں رکھنے کی بری عادت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ایسی کتابیں اپنے پاس دبائے رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ امتدادِ زمانہ سے یہ قیمتی ورثہ ضائع ہو جاتا ہے یا کسی حادثے کی نذر ہو کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے صاحب علم اور صاحب دانش افراد سے درخواست کی ہے کہ اگر کسی علم دوست انسان کے پاس ایسی کتاب یا کتب موجود ہوں تو ادارہ اس کی اشاعت کا بندوبست کرنے کے علاوہ اس کو عکسی شکل میں محفوظ کرنے کا کام سرانجام دینے کو تیار ہے۔

''حرف آغاز'' کے عنوان سے عظمت علی خان نے ماحولیات، اس کے انسانی زندگی پر اثرات اور ماحولیات سے منسلکہ اصطلاحات کی فکری فنی تفہیم بیان کرنے کی کاوش کی ہے۔ مواد کے اعتبار سے مصنف نے ماحول کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کرتے ہوئے اصطلاحات وضع کی ہیں۔

جریدہ شمارہ ۱۹ میں ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اس امر کا اظہار کیا تھا کہ ''جریدہ'' میں اصطلاحات کے ساتھ اہم موضوعات پر تحقیقی مضامین بھی شائع کیے جائیں گے۔ ''جریدہ'' شمارہ ۲۱ میں لسانیات سے متعلقہ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ فہرست مندرجات کے مطابق ''حرف آغاز'' ڈاکٹر ظفر سعید سیفی کا تحریر کردہ ہے جبکہ:

معروضات:	ڈاکٹر معین الدین عقیل
اردو کا آغاز اور مولد:	خالد حسن قادری
بروشسکی زبان:	شہناز سلیم ہونزائی
بروشسکی: تاریخ و تحقیق کی میزان میں:	سید خالد جامی / عمر حمید ہاشمی
بروشسکی کا علاقہ، ہونزا: وجہ تسمیہ	
شمول بوق: بروشسکی زبان کی قواعد:	ڈاکٹر نصیر الدین نصیر ہونزائی۔

اپنے مضمون ''اردو کا آغاز اور مولد'' میں خالد حسن قادری نے اردو زبان کی پیدائش میں علاقائی محرکات کے ساتھ سنسکرت اور اردو کے باہمی تال میل اور اس سلسلے میں بعض مروج روایات اور تحقیقی عناصر کو رد کیا ہے۔ یہ مضمون دراصل انگریزی میں ہے جس کا ترجمہ عمر حمید ہاشمی نے کیا ہے۔ خالد حسن نے اس نظریے کا اظہار کیا ہے کہ اردو سنسکرت سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ اپنی قدامت میں اس کے ڈھانچے منڈا دور کی زبان سے جڑتے ہیں۔ دوسری طرف اردو کا ڈھانچہ سنسکرت سے مختلف ہے۔ قواعد میں بنیادی اختلافات ہیں۔ فاضل مصنف کا یہ بھی خیال ہے کہ ہندو ضمیات سے متعلق دو مشہور شہر متھرا اور بنارس، پشاور کے نواح میں موجود ہیں۔ مضمون نگار نے گویا اردو کا ایک نیا مرکز دریافت کیا ہے لیکن اس نظریے میں ابھی بہت سے حقائق تحقیق طلب ہیں۔ قواعد کے ایک دو اصولوں کے سوا ابھی یہ نظریہ خام حالت میں ہے اور قواعد کے یہ اصول بھی بنظر غائر کوئی بہت بڑا ثبوت نظر نہیں آتے۔ اس کے باوجود خالد حسن قادری کا یہ مضمون محققین کے لیے ایک نئی فکر کی راہیں کھولتا ہے۔

شہناز سلیم ہونزائی کا مضمون ''بروشسکی زبان'' اپنے ابتدائی فقرے سے ہی متنازعہ ہو جاتا ہے۔ مصنفہ رقم طراز ہیں:۔

''بروشسکی زبان دنیا کی عجیب و غریب اور انتہائی قدیم زبان تصور کی جاتی ہے''۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بروشسکی اس خوبصورت وطن کی ایک نہایت خوبصورت بولی ہے۔ بولی اس لیے کہ زبان اور بولی کے جغرافیائی اصولوں اور حدود کے مطابق موجودہ شکل میں بروشسکی کا دائرہ عمل بولی کے معیار پر ہی پورا اترتا ہے۔ دوسرا اس زبان کے قدیم ترین ہونے کا ابھی تک ثبوت فراہم نہیں ہو سکا۔ اگر یہ قیمتی کارنامہ پورا ہو جائے تو یقیناً بروشسکی ہی نہیں پاکستان کے لیے بھی اعزاز کی بات ہوگی۔ فاضل مصنفہ بروشسکی پر جاری جرمن اور امریکی تحقیق کا بھی حوالہ دیتی ہیں۔

سید خالد اور عمر حمید ہاشمی نے ''بروشسکی: تاریخ و تحقیق کی میزان میں'' کے نام سے بروشسکی پر قواعد، تحقیق اور تاریخ کے اعتبار سے اہم نکات کی وضاحت کی ہے۔ بروشسکی پر اب تک آٹھ کتب شائع ہو چکی ہیں۔ عربی رسم الخط میں پہلی کتاب ۱۹۷۰ء میں لکھی گئی لیکن مقام افسوس ہے کہ اس زبان پر اتنا کام نہیں ہوا جس کی یہ مستحق ہے۔ پہلے یہ زبان صرف بولی جاتی تھی لیکن اب لکھی بھی جا رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ پاکستان میں یہ عربی جبکہ مغرب میں رومن رسم الخط میں لکھی جا رہی ہے۔ اس وقت اس زبان کو بولنے والے ۳۰ سے ۴۰ ہزار افراد ہیں۔ بروشسکی اس اعتبار سے منفرد ہے کہ یہ اپنے گرد و نواح میں بولی جانے والی دوسری بولیوں سے مختلف ہے بلکہ اس کے ڈانڈے ہنگری زبان سے ملتے ہیں جو اس کی قدامت اور وسعت کی دلیل ہے۔ اگلا مضمون ''برشسکی کا علاقہ، ہونزا: وجہ تسمیہ'' ہے۔ جس میں اس علاقے کو ہونزہ کی جگہ ہونزا ثابت کیا گیا ہے۔ ''منقول بوق: بروشسکی زبان کی اولین قواعد'' ڈاکٹر علامہ نصیر الدین نصیر ہونزائی کی قابل قدر کوشش ہے لیکن ایک بات نہایت تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے کہ یہاں پر جنوبی ایشیا کا لسانی نقشہ شائع کیا گیا ہے جس میں بظاہر کشمیر اور اس سے ملحقہ علاقوں کو ہندوستان کا حصہ دکھایا گیا ہے۔ (پاکستان میں شائع ہونے والے جریدے میں اس طرح کی غفلت قابل افسوس ہے۔ مدیر) اسی جگہ پر صفحہ نمبر اڑتالیس کے بعد صفحات دوبارہ ایک، دو سے شروع کر دیے گئے ہیں جو ۱۶۸ تک جاتے ہیں، گویا اس کتاب کے صفحات ۴۸ + ۱۶۸ = ۲۱۶ ہیں۔ قواعد کا بیان بروشسکی بولنے سمجھنے والے کے لیے تو آسان ہے لیکن دوسری زبان بولنے والوں کے لیے یہ قواعد کچھ واضح نہیں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قواعد کے خانوں کے اوپر وضاحت کی جاتی کہ نیچے دیے گئے حروف کس نوعیت کے ہیں۔

﴿۲﴾

''مخزن ادب'' اردو لازمی کا جدید نصاب ہے جو بی۔ اے، بی ایس سی، بی کام، کمپیوٹر سائنس اور ہوم اکنامکس کے طلبا کے لیے شعبہ اردو، جامعہ کراچی نے مرتب کیا ہے۔ حرف آغاز پروفیسر ڈاکٹر ظفر سعید سیفی کا ہے جس میں اس کتاب کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔ ''معروضات'' کے عنوان کے تحت ڈاکٹر معین الدین عقیل نے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کے حوالے سے اردو کی اہمیت کے پس منظر میں اس کتاب کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی ہے۔ ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۸۴ء میں تیار ہونے والی نصابی کتاب کا حوالہ دیا ہے جو تیاری کے بعد بڑے پراسرار انداز میں غائب کر دی گئی، لیکن اس کے بعد بازار میں یہی کتاب شائع ہو کر بکتی رہی۔ مقام افسوس ہے کہ ایسا گھناؤنا جرم کرنے والوں کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔

کتاب کا پہلا مختصر لیکن نہایت اہم مضمون ''املا کے اصول'' کے تحت پیش کیا گیا ہے جس کی ہمارے آج کے طالب علم کو اشد ضرورت ہے۔ فہرست مضامین میں اس صفحے کا ذکر موجود نہیں ہے۔ حصہ نثر میں اردو کے ایسے مضامین شامل کیے گئے ہیں جو زمانی اعتبار سے اردو کی ترقی کی داستان سناتے ہیں۔ پہلا مضمون میر امن دہلوی کی مشہور داستان ''باغ و بہار'' کا ایک حصہ

''سیر دوسرے درویش کی'' کے عنوان سے شامل کیا ہے۔ کتاب کا ایک بلکہ سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ہر مضمون سے پہلے اس کے مصنف کی مختصر تاریخ، فکری وفنی سفر اور متعلقہ مضمون کے اصول ماخذ اور مزاج پر جامع انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ صورت حال نثر ہی نہیں بلکہ حصہ نظم کا بھی احاطہ کرتی ہے اور شعرا حضرات کے اسلوب اور ذات کا ابتدائی خاکہ، کلام سے پہلے طالب علم کے سامنے رکھتی ہے۔

حصہ نثر میں میر امن، رجب علی بیگ سرور، غالب، سرسید، محمد حسین آزاد، محسن الملک، مولوی نذیر احمد، حالی، شبلی، فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق، یلدرم، پریم چند، عصمت چغتائی، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، پطرس بخاری، مشتاق احمد یوسفی اور مختار مسعود جیسے اہم نثر نگاروں کو شامل کیا گیا ہے۔

حصہ نظم میں خواجہ میر درد، میری تقی سے لے کر اقبال اور فیض احمد فیض کا کلام شامل نصاب ہے جبکہ سودا اور ذوق کے قصائد، میر حسن اور دیا شنکر نسیم کی مثنویات کے اجزا بھی شامل ہیں۔ حالی اور اس کی رباعیات، اکبر، شبلی اور اقبال کی نظمیں اور احسان دانش اور ن م راشد جیسے شعرا کی تخلیقات بھی موجود ہیں جن کے موضوعات کے تنوع کے ساتھ اردو شاعری کی فکری وفنی داستان کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

﴿۳﴾

آئینہ اور خودنوشت شاید ہی بدصورت ہوں۔ دونوں عموماً خوبصورت ہی نظر آتے ہیں۔ زیادہ تر خودنوشت میں انسان ایسا نظر آتا ہے جیسا وہ خود کو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ عبیدالرحمٰن کی خودنوشت ''یاد ہے سب ذرا ذرا'' بھی اس اصول سے مبرا نہیں ہے۔ وہ ایک وکیل ہیں۔ چنانچہ تحریر میں بھی پختگی اور دلائل کی روانی نظر آتی ہے۔ کتاب کا انتساب مصنف نے اپنی اہلیہ کے نام کیا ہے۔ حرف آغاز پروفیسر ڈاکٹر ظفر سعید سیفی اور معروضات ڈاکٹر معین الدین عقیل نے تحریر کی ہیں۔ جن میں اس خودنوشت اور مصنف کے بارے میں تاثرات اختصار سے پیش کیے ہیں۔ پیش لفظ مصنف نے تحریر کیا ہے۔

خودنوشت کا پہلا فقرہ ہے ''مجھے نہیں معلوم کہ میرا سلسلہ نسب کیا ہے'' جبکہ صرف دو صفحات چھوڑ کر لکھتے ہیں ''ہمارے بزرگ ..... مغل دور میں قاضی مقرر ہوئے اور نسبی سلسلہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے''۔ اس صورت حال سے قطع نظر عبدالرحمٰن کا سارا گھرانا پڑھا لکھا تھا لیکن بدقسمتی سے کم عمری میں والدین کا انتقال ہو گیا اس کے باوجود انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ اس کٹھن وقت میں ان کی بہنوں نے ان کا بہت ساتھ دیا۔ جس وقت انہوں نے کچھ ہوش سنبھالا تو ہندوستان سیاست کے بحرانی دور میں داخل ہو چکا تھا اور انہوں نے چاپلوسی، خوشامد اور سفارش کے زور پر بہت سے خاں صاحب اور خان بہادر بنتے دیکھے۔ برطانوی تجارت کو فروغ دینے کے لیے مفت چائے اور گھی بنٹتا دیکھا۔ عبیدالرحمٰن صاحب کی یادداشت نہایت جاندار ہے، لیکن جب وہ ۱۹۴۱ء کے حالات جبکہ ان کی عمر اس وقت دس سال تھی، جس باریک بینی سے ہندوستان کی سیاست کا نقشہ کھینچتے ہیں وہ یقیناً دس سالہ بچے کی ذہانت سے میل نہیں کھاتا۔

مصنف شروع ہی سے سیاسی ماحول میں دلچسپی لیتے رہے۔ یہاں تک کہ تیرہ سال کی عمر میں کالج میں طلبا یونین کے شریک معتمد منتخب ہوئے۔ یہ واقعہ ۱۹۴۶ء کا ہے جبکہ ۱۹۴۷ء میں انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ وہ شروع میں مسلم لیگ

میں شامل ہوئے اور پھر مسلم لیگ میں شامل رہے۔ مصنف کی ایک خوبی یہ نظر آتی ہے کہ وہ جس شخص کا بھی ذکر کرتے ہیں چاہے وہ ان کا مخالف یا ہم نوا ہو اس کی خوبیوں کو زیادہ ابھارتے ہیں جبکہ خامیوں کو بڑے سلجھے ہوئے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ بسا اوقات وہ ایسے اشخاص کے نام بھی لکھ جاتے ہیں جن کی وضاحت نہیں ہو پاتی۔ عبدالرحمٰن کی تحریر میں پاکستان بننے کی تاریخ فلم کی طرح ہمارے سامنے چلتی جاتی ہے۔ یہاں مسلم علما بھی ہیں، نیشنلسٹ بھی ہیں، مسلم لیگی اور کانگریسی بھی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ مخالفت اور موافقت کا قافلہ ہے جس میں آخر کار قائداعظم کے آہنی ارادے کو فتح حاصل ہوتی ہے۔

سوانح کا دوسرا حصہ قیام پاکستان کے بعد مصنف کی یہاں آمد سے شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ مصنف خود مختلف سیاسی پارٹیوں میں شامل رہے اور فعال کردار بھی ادا کیا۔ اس لیے پاکستان میں شروع ہونے والے پہلے دن سے وہ گھناؤنا کھیل بھی نظر آنے لگتا ہے جو صرف قائداعظم کی فراست ہی روک سکتی تھی۔ ان کی بے وقت وفات سے یہ پنڈورا بکس کھل گیا اور پھر سبھی نے اس بہتی گنگا میں غوطے کھائے۔ لیاقت علی خان نے اس پر بند باندھنے کی کوشش کی تو انہیں بھرے جلسے میں گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا۔ مصنف کا یہ تجزیہ نہایت جاندار ہے کہ بددیانت سیاسی قیادت کے باوجود عام آدمی نے پوری لگن سے پاکستان کے لیے کام کیا۔ ایک طرف تو عوام کا یہ رویہ تھا اور دوسری طرف سیاست دان اخلاقیات کا جنازہ نکال رہے تھے۔

پنجاب، سندھ کے وڈیرے، سندھی جاگیردار، بلوچستان کے قبائلی سردار اور سرحد کے خوانین میں بہت سے چہروں کا وہ رخ ہمارے سامنے آتا ہے جسے خوبصورت نہیں کہا جا سکتا اور جس کا مشاہدہ مصنف نے خود کیا۔ سیاسی وفاداریوں کی خرید وفروخت کے بڑے دردناک نمونے یہاں ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک اور دلچسپ صورت حال یہ بھی ہے کہ عبیدالرحمٰن مسلم لیگ، اصغر خان کی تحریک استقلال اور پھر صدر ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ میں شامل رہے۔ وہ ہر تحریک اور جماعت سے دوسری جماعت میں ورود کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور دیتے ہیں جبکہ دوسری طرف یہ بھی سچ ہے کہ ہر سیاستدان ایک سے دوسری جماعت میں چھلانگ لگانے کے لیے اپنے پاس ضرور ایسے دلائل رکھتا ہے جو اس کے مطابق اس تبدیلی کی بنیادی وجہ بنے۔ اس کے علاوہ تبدیلی کا یہ عنصر بذات خود انسانی جبلت میں بھی شامل ہے۔

مصنف چونکہ وکیل ہیں۔ ہر محرک کے پس پردہ حقائق پر ان کی گہری نظر ہے اس لیے وہ ہر حکمران کے آنے کی وجوہات، اس کی خوبیاں بیان کرتے ہیں اور جو اقدامات اس حکمران کی غیر مقبولیت کا باعث بنے ان کا بھی بڑی دیانتداری سے موازنہ کرتے ہیں۔

کتاب میں کہیں کہیں پروف ریڈنگ کی غلطیاں بھی ہیں جیسے صفحہ ۵۵، ۵۹، ۶۲، ۶۹، ۷۱، ۸۱، ۱۰۴، ۱۱۵، ۱۱۶۔ کتاب میں اہم مواقع کی تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ جس سے مجموعی تاثر مزید خوبصورت ہو گیا ہے۔

﴿۴﴾

مہدی علی صدیقی پیشے کے اعتبار سے جج ہیں۔ آج کل امریکہ میں اپنی بیٹی کے پاس ریٹائرمنٹ کے دن سکون سے گزار رہے ہیں۔ (حال ہی میں ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ مدیر) ''بلاکم وکاست'' ان کی زندگی کی کہانی ہے۔ کتاب اعلیٰ معیار کے خوبصورت کاغذ پر شائع کی گئی ہے لیکن لفظوں کا سائز (پوائنٹ) عمومی کتب کے سائز سے قدرے چھوٹا ہے۔ جس سے پڑھنے

میں کچھ دشواری ہوتی ہے۔ کتاب کا انتساب، مصنف نے اپنی مرحومہ بیوی عزیز بانو کے نام کیا ہے۔ ''ایک شخص، ایک عہد، ایک تاریخ'' کے زیرعنوان ڈاکٹر معین الدین عقیل نے مصنف کی ذات کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ اسی جگہ ڈاکٹر صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ سوانح ان کی گزارش پر لکھی گئی:۔

''مجھے خوشی ہے کہ فاضل مصنف نے میری گزارش کو قبولیت بخشتے ہوئے اس خودنوشت کی تصنیف کے لیے خود کو آمادہ کرلیا'' (ج)

جبکہ مصنف ''عرض داشت'' کے عنوان کے تحت صفحہ (ھ) پر رقمطراز ہیں:

''اس تحریر کی تحریک میرے محترم معالج ڈاکٹر سید اسلم نے کی تھی اور کئی بار یاددہانی فرمائی تھی''۔

''عرض داشت'' کے زیرعنوان مصنف نے اس کتاب کی تصنیف کے محرکات کو مختصراً پیش کیا ہے۔ ''تمہید'' بھی مصنف کی تحریر ہے جس میں مہدی علی صدیقی واضح طور پر اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کا تعلق متوسط طبقے سے ہے اور یہ تحریر ان کی ذاتی آرا اور تجربات پر مبنی ہے جو صحیح یا غلط ہوسکتے ہیں۔

کتاب کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ اول میں ۱۵ ابواب ہیں جو پیدائش سے لے کر پاکستان ہجرت تک کے واقعات کا احاطہ کرتے ہیں جبکہ حصہ دوم باب ۱۶ سے ۳۵ تک پھیلا ہوا ہے جس میں پاکستان آنے کے بعد واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ آخر میں ضمیمے ہیں جن کا آخری حصہ مصنف کے کلام کے نمونے پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

بلاکم وکاست پڑھتے ہوئے بار بار احساس ابھرتا ہے کہ یہ ایک انسان کی آپ بیتی ہے۔ مصنف پیشے کے اعتبار سے جج تھے اور اس حوالے سے ان کو بہت سی چیزوں کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جیسے علی گڑھ میں سیاسی سرگرمیاں۔ کتاب کا اہم حصہ وہ ہے جہاں مصنف نے حیدرآباد میں ملازمت اور پھر قیام پاکستان کے بعد ان محرکات کو بے نقاب کیا ہے جو ہندوستان کے حیدرآباد دکن جیسی پرامن اور خوشحال ریاست پر قبضے کا باعث ہوئے۔ اسی جگہ مصنف کا یہ انکشاف بڑا چشم کشا ہے کہ حیدرآباد میں ہندو اکثریت تھی لیکن حکمران مسلمان تھا۔ ہندوستان کبھی ایسی ریاست کو اپنے اندر برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ اس حقیقت کے باوجود کہ ریاست کے ہندو خود بھی ہندوستان کے حملے کا کوئی جواز نہیں پاتے تھے پھر ہندوستان نے حیدرآباد پر قبضہ کرلیا۔

''مجھے تو ہندو اور مسلمان دونوں ہی عام طور پر پریشان نظر آئے'' صفحہ ۱۲۲۔

کتاب پڑھتے ہوئے بار بار مصنف کی یہ رائے سامنے آتی ہے جہاں وہ مختلف واقعات کے حوالے سے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ایک ذمہ دار عہدے پر کام کرتے ہوئے وہ حالات سے اتنی لاتعلقی کیوں اختیار کرتے رہے، لیکن جب ہم مصنف کے پیشے پر غور کرتے ہیں تو ان کی یہی عادت ان کی خوبی نظر آتی ہے۔ مثلاً سعادت حسن منٹو سے متعلق مقدمے میں وہ بغیر ضرورت مقررہ وقت سے پہلے منٹو کا متنازعہ افسانہ نہیں پڑھتے تاکہ وہ ذہنی طور پر پہلے ہی کوئی فیصلہ فریقین کے دلائل سننے سے پہلے بنالیں۔ یہ خیال اس وقت مزید تقویت پکڑتا ہے جب وہ سیاسی حالات پر واضح اظہار خیال کرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو مصنف کی یادداشت کمزور ہے اور نہ وہ لاعلم ہیں۔

سیاسی حالات خاص طور پر جن کا تعلق عدالتی امور سے تھا، مصنف نے ان کے کئی دلچسپ گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ کئی جگہوں پر نئے آنے والوں کو بھی اچھا نہیں سمجھا جارہا تھا جیسے پنجاب میں از راہ تمسخر مہاجروں کو تلیر اور سندھ میں ''ماکڑ'' کہتے تھے

اس کے باوجود عام لوگوں کا رویہ مہاجروں کے ساتھ نہایت فراخدلانہ تھا۔ قیام پاکستان کے وقت پشاور میں چیف سیکرٹری تک سائیکل پر دفتر جایا کرتے۔ تحریک پاکستان میں شہنشاہ ایران کے ہتھیار فراہم کرنے کا بھی عوامی خیال مصنف نے پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ مصنف سیاسی حالات کا سیدھا سادہ تجزیہ بھی پیش کرتے ہیں کیونکہ یہ احوال آپ بیتی کے تجربات میں شامل ہیں اس لیے بیان کی سادگی میں بھی گہرائی اور گیرائی موجود ہے۔ مثلاً مصنف ترقی پسندوں کے اس رویے کو بیان کرتے ہیں کہ کسانوں، مزدوروں کی حمایت میں صفحات کالے کیے۔ وہی ترقی پسند قیام پاکستان کے وقت کچھ تو اچھی نوکریوں کی طرف پلٹ گئے لیکن بہت سے ایسے تھے جو تحریک پاکستان میں عملی طور پر شامل ہوگئے اور جمہوریت کے خلاف سیاست دانوں کے رویے کو طنز کا نشانہ بناتے رہے۔ مہدی علی صدیقی جہاں قیام پاکستان کے بعد سیاستدانوں کی حرکتوں کو ملکی مفاد کے پس منظر میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں وہاں مرحوم بھٹو صاحب کو کافی قریب سے سمجھتے ہوئے وہ بھٹو صاحب کے بارے میں بغیر لگی لپٹی کے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ ایوب خان کے سیاست میں ورود کے بارے میں تو مصنف کو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن ایوب خان کی اچھی پالیسیوں کو بھی وہ سادگی سے بیان کرتے جاتے ہیں۔ اسی طرح سہروردی، سکندر مرزا، محمد علی بوگرہ اور پنڈت نہرو کے کردار بھی ہمارے سامنے آتے اور اپنا ایک مخصوص تاثر چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان کرداروں سے وابستہ کئی دلچسپ واقعات جو اپنے وقت کی صحافت یا مصنف کی یادداشت میں محفوظ رہ گئے ہیں وہ بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہاں امریکہ کا وہ روایتی کردار بھی سامنے آتا ہے جس کے تحت وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کی ڈرامہ بازی کرتا آیا ہے۔ ایسی ہی کچھ سیاسی قلابازیاں مصنف نے سیاستدانوں کے حوالے سے بھی بیان کی ہیں۔ یہاں مصنف عدالتی اصول ضوابط کے مطابق بھٹو صاحب کی پھانسی کو بھی کوئی غیر معمولی یا بددیانتی کا اقدام قرار نہیں دیتے۔

جنرل ضیا کے بھی روشن اور تاریک پہلو مصنف نے اسی بے لاگ انداز میں پیش کیے ہیں جس انداز میں بھٹو صاحب کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔

یہ کتاب پڑھتے ہوئے بار بار جو احساس قاری کو چھو لیتا ہے وہ یہ کہ یہ ایک عام انسان کی داستان ہے۔ لیکن یہ داستان اس وقت ایک بڑے انسان کی کہانی بن جاتی ہے جہاں عموماً آپ بیتی کے مزاج سے ہٹ کر مصنف اپنی خوبیوں کا تو ذکر بڑھا چڑھا کر نہیں کرتے لیکن اہم بات یہ ہے کہ اپنی بشری کمزوریوں کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً ہمارے یہاں ہندو تہذیب کے زیر اثر یہ رواج ہے کہ باپ بیٹی کے گھر سے پانی پینے سے کتراتا ہے۔ لیکن مہدی حسن صدیقی کئی بار یہ واقعہ سناتے ہیں کہ کمزور معاشی حالات میں ان کی بیٹی اور داماد نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا۔ بلکہ اب امریکہ میں بھی ان کی بیٹی اور داماد ہی ان کے کفیل ہیں۔ یقیناً ایک بڑے اور سچے دل وحوصلے والا انسان ہی یہ بات بیان کرسکتا ہے۔

کتاب میں تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ زبان رواں اور سادہ ہے۔ جبکہ کچھ صفحات جیسے صفحہ ۶، ۷، ۱۸، ۳۶، ۳۹، ۴۳، ۱۰۸، ۱۱۶، ۱۵۸، ۳۱۴ پر پروف کی غلطیاں ہیں۔

﴿۵﴾

صحافت اپنے وقت کا آئینہ ہوتی ہے۔ لمحہ موجود کی تاریکی روشنی سبھی اخباری صفحات میں جمع ہوجاتے ہیں۔ تحریک

پاکستان میں جہاں اور بہت سے عناصر وعوامل نے اپنا کردار ادا کیا وہاں صحافت بھی اس تحریک کا ایک فعال اور زندہ کردار ہے۔ ہندوستان میں ''بکی گزٹ'' سے شروع ہونے والی صحافت وقت کے بدلتے تیور کی جاندار کہانی ہے جس کا ایک اہم اور ہنگامی موڑ تحریک پاکستان ہے۔ صحافتی حوالے سے دیکھیں تو اس وقت تین صحافتی دھارے نظر آتے ہیں۔ ہندوؤں کے حمایتی اخبارات، حکومت کے زیر اثر صحافت اور مسلمانوں کے نظریہ پاکستان کی حمایت کرنے والے اخبارات۔ اگرچہ اس کی مزید کئی شاخیں ہو جاتی ہیں لیکن مرکزی مزاج یہی تھا۔ ایک طرف جہاں پربھات اور پرتاب جیسے اخبارات ہندوؤں کی معاونت کر رہے تھے تو دوسری طرف زمیندار، انقلاب اور نوائے وقت مسلمانوں کے مدد ومعاون تھے۔

(افکار وحوادث کے انتخابات کی جلد اول اور دوم چند برس ہوئے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور سے شائع ہوئی تھیں۔ تیسری اور چوتھی جلد اب جامعہ کراچی نے شائع کی ہے۔ مدیر)

افکار وحوادث جلد سوم روز نامہ انقلاب کے اپریل ۱۹۲۷ء سے دسمبر ۱۹۳۱ء تک کے کالموں کا انتخاب ہے۔ یہ کالم عبدالمجید سالک کے قلم کا شاہکار ہیں۔ ان کی تحریر طنز، مزاح اور مسکراتی ہوئی سنجیدگی کا خوبصورت امتزاج ہے۔ حرف آغاز ڈاکٹر ظفر سعید سیفی کا ہے جس میں سالک صاحب کے کالموں اور شخصیت پر اجمالی انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ کالموں کو مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے جس کی بدولت مختلف موضوعات پر اس وقت عوام، اخبار اور سیاست دانوں کا ردعمل تلاش کرنے میں نہایت آسانی پیدا ہوگئی ہے۔ کالموں کو عنوانات کے تحت تقسیم کرنے کا کام ان کالموں کے مرتب محمد حمزہ فاروقی کی کاوش ہے۔ کتاب کا مقدمہ محمد حمزہ فاروقی نے لکھا ہے جس میں مرتب نے زیادہ وضاحت سے مختلف تحاریک اور شخصیات کے حوالے سے سالک اور انقلاب کا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزوں کے مظالم کا دن رات ڈھنڈورا پیٹنے والی کانگریس اور گاندھی اس وقت کشمیریوں پر ڈوگرا راج کے مظالم کے خلاف ایک لفظ نہیں بولتے دونوں پر عجیب سی بے حسی چھائی رہتی ہے۔

سالک کے کالم مسلمانوں کے مفاد کی جنگ لڑتے ہیں اور کانگریس کو طشت از بام کرنے سے نہیں چوکتے۔ اس سلسلے میں سالک کا قلم زیادہ رواں اور تلخ ہو جاتا ہے۔ وہ کانگریس سے وابستہ مسلمانوں کو بار بار طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ ڈاکٹر عالم، مولانا آزاد اس حوالے سے خاص کردار ہیں۔

انہیں کالموں میں ہمیں پنڈت جواہر لال نہرو اور روسی حکومت کے گہرے تعلقات کا پتہ چلتا ہے جو ہندوستان کے قیام کے ساتھ ہی مزید مضبوط ہو گئے شاید اسی لیے لیاقت علی خان نے روس کی بجائے امریکہ سے تعلقات کو اولیت دی تھی۔ یہاں ہمیں نہرو خاندان کا دوغلا پن بھی نظر آتا ہے جو ہندوستان میں کھدر پوشی کو مذہب کا سا رنگ دے دیتے ہیں لیکن برطانیہ جاتے ہیں تو اعلیٰ قسم کے انگریزی سوٹ پہنے پھرتے ہیں۔ یہی لوگ ساری زندگی گئو رکھشا کے لیے لمبے لمبے بھاشن دینے والے الہ آباد کی ''آر۔ ایم گزدار اینڈ کو'' کمپنی کے مالک ہیں جو خنزیر، گائے کے گوشت اور شراب کی تجارت کرتی ہے۔

یہاں مسز ''اینی بیسنٹ'' کا کردار بھی سامنے آتا ہے جو وفاداری اور بیان بدلنے میں گرگٹ کو بھی پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔ سکھوں کے بارے میں سالک کا کہنا ہے ''وہ سکھ ہی نہیں جو سوچ سکے'' (صفحہ ۶۹) کئی جگہ سالک، قائداعظم سے اختلاف بھی

کرتے ہیں لیکن جہاں ہندوؤں اور قائداعظم کا کوئی تنازعہ کھڑا ہوتا ہے تو سالک کی ساری ہمدردیاں قائداعظم کے ساتھ ہوتی ہیں۔ بدیشی مال کے بائیکاٹ کے پس منظر میں سالک ایک نہایت اہم پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ بدیشی مال خاص طور پر بدیشی کپڑے کو جلانے اور نہ پہننے کا جو اعلان گاندھی جی نے کیا ہے اس کے پیچھے ہندو صنعت کاروں کے کپڑے کی ملوں کو چلوانے کا خواب کام کر رہا ہے۔ اسی طرح سالک ان لیڈروں کے چہرے بھی بے نقاب کرتے ہیں جو بدیشی لباس پہن کر بدیشی کپڑے کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ کتاب میں زیادہ تر بلکہ اگر کہا جائے کہ سالک کے کالموں کا مرکز یہی مطالبہ ہے کہ ہندو جب تک مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق عطا نہیں کرتے اس وقت تک ہندوستان میں ہندو مسلم تنازعہ حل نہیں ہو سکتا۔ اس تناظر میں سالک بار بار ہندوؤں کی اس دوغلی پالیسی کو سامنے لاتے ہیں کہ اگر کانگریس اور ہندو اپنے حقوق کی بات کریں تو یہ عین حریت پسندی ہے اور اگر مسلمان اس قصور کے سزاوار ہوں تو ٹوڈی کہلاتے ہیں۔ کالموں میں بعض چوٹی کے مسلمان لیڈروں جیسے مولانا ظفر علی خاں کی بعض سیاسی قلابازیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ نام اور عجیب وغریب نام رکھنے میں سالک مہارت رکھتے تھے۔ مثلاً گاندھی کو صدر الشریعت۔ موتی لال نہرو کو حجۃ الاسلام، پٹیل کو شیخ الطریقت اور جمنا لال بجاج کو قاضی القضاۃ کے برجستہ خطاب سے پکارا گیا۔

کتاب کا سب سے خوبصورت حصہ انقلاب افغانستان کے زیر عنوان امیر حبیب اللہ خاں المشہور ''بچہ سقہ'' سے متعلق ہے۔ بچہ سقہ کو بار بار نہایت مضحکہ خیز خطابات سے نوازا گیا ہے۔ مثلاً اعلیٰ حضرت مشک الدولہ ذول الملک بہادر''۔ ''شور بازار'' وغیرہ۔ انہیں کالموں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خبروں کے ذرائع زیادہ معتبر نہیں تھے اور دوسرے ممالک کی خبروں میں اکثر دروغ گوئی شامل ہو جاتی۔ اس میں کچھ تو ذرائع ابلاغ کا مسئلہ ہے لیکن ساتھ ہی صحافیوں کی ذاتی پسند اور پرخاش کارفرما رہتی تھی۔

کتاب میں صفحہ ۲۲، ۳۰، ۳۱، ۳۴، ۳۹، ۴۹، ۵۰، ۶۷، ۱۰۴، ۱۱۲، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۹ پر املا کی اغلاط حروف خوانی کے عمل میں رہ گئی ہیں۔ ہر باب کے آخر میں حواشی وتعلیقات سے کتاب زیادہ مستند بن گئی ہے۔

(۲)

افکار وحوادث کی چوتھی جلد، جلد سوم کے دورانیے یعنی اپریل ۱۹۲۷ء سے دسمبر ۱۹۳۱ء تک کے کالموں پر ہی مشتمل ہے۔ انتساب مجتبیٰ فاروقی کے نام ہے۔ حرف آغاز ڈاکٹر ظفر سعید سیفی نے لکھا ہے۔ دیباچہ محمد حمزہ فاروقی نے تحریر کیا ہے۔ کالموں کی یہ جلد ۱۱۷ ابواب پر مشتمل ہے۔ اٹھارواں باب تعلیقات وحواشی پر مشتمل ہے۔ جلد نمبر تین میں ہر باب کے آخر میں حواشی وتعلیقات تھے لیکن اس جلد میں یہ آخری باب کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں۔

کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ سالک کے کالموں میں مختلف شخصیات کو جس انداز میں پیش کیا ان کو الگ کر دیا گیا ہے۔ اب ہر باب کسی شخصیت کے نام پر ہے اور اسی شخصیت کے حوالے سے کالم اس باب میں شامل ہیں۔ ابواب بندی میں کوئی اصول نہیں بلکہ مرتب نے اپنی پسند کے اعتبار سے شخصیات کی ابواب بندی کی ہے۔ کالموں میں بھی سالک کی پسند وناپسند کا اظہار ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات وہ صحافتی دیانتداری سے کام لیتے دکھائی نہیں دیتے مثلاً راجہ صاحب محمود آباد کو اس لیے طنز کا نشانہ بناتے ہیں کیونکہ وہ انگریزی حکومت سے تعاون کے مجرم ہیں۔ لیکن اگر یہی کام پنجاب کے یونینسٹ کرتے ہیں تو سالک پر عجیب خاموشی

طاری ہوجاتی ہے۔ کالموں میں بار بار بڑے برمحل ہندی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن سے تحریر کی تاثیر بڑھ گئی ہے۔ مولانا محمد علی جب تک کانگریس کے زیر اثر رہے سالک کے نشتر قلم کا نشانہ بنتے رہے لیکن جب ان کے خیالات مسلم لیگی نظریات کے مطابق ہوئے سالک ان کی تعریف بھی خوب کرتے ہیں۔ ان کالموں میں سالک نے گاندھی کی دوغلی حکمت عملی کو خوب تمسخر کا نشانہ بنایا ہے۔ گاندھی کے مذہبی ادارے ''ستیا گرہ آشرم'' کی شرمناک کہانیوں کے بعد اس کا نام ''انڈسٹریل ہوم'' رکھنے کی داستان بھی گاندھی کے کردار کی ایک جھلک دکھاتی ہے۔ گاندھی اپنی اندرونی آواز کو آتما کا فیصلہ سمجھ کر اسی کے مطابق فیصلے صادر کرتے رہے لیکن جونہی ہندو مسلم تنازعے کا معاملہ سامنے آتا یہ آتما یا تو گونگی ہوجاتی یا سوئی رہتی۔ اسی طرح جب کسی جلسے یا بلوے میں مسلمان قتل ہوتا یہ تو گاندھی چپ شاہ کا گڑ کھاتے ہیں اور اگر مرنے والا ہندو ہوتو نہ صرف اخبارات میں اس کے بارے میں لمبے چوڑے تعریفی مضامین لکھتے بلکہ مقتول کے گھر بھی پرسا دینے جاتے ہیں۔ گاندھی کے بارے میں سالک کا یہ فقرہ گاندھی کے کردار کی بہترین تصویر ہے۔

''گاندھی اور چارلی (چیپلن) دونوں مسخرے ہیں۔ دونوں ایکٹر ہیں'' صفحہ ۱۳۷

کتاب کا پورا باب ''بچہ سقہ'' کے بارے میں ہے۔ یہاں بھی سالک کا قلم خوب جولانیاں دکھاتا ہے۔ بچہ سقہ کا تعارف یہ ہے۔

''آپ کا سن شریف تیس سال ..... چہرے پر چیچک کے داغ ..... آپ پشاور کے چائے فروش، پارا چنار کے قلی، فوج کے بھگوڑے سپاہی اور راہ چلتے مسافروں کے قاتل رہ چکے ہیں''۔ صفحہ ۹۶

بچہ سقہ کے نام بھی بھرپور معنویت لیے ہوئے ہیں۔ مثلاً ''اعلیٰ'' حضرت مشک الدولہ ڈول الملک بہادر یعنی ہز میجسٹی بچہ سقہ ''اعلیٰ حضرت بچہ سقہ'' حضرت چور بازار ''اعلیٰ حضرت پکھال الملت والدین''، ''نواب مشکیزہ نواز جنگ بہادر''، ہز واٹر ورکس میجسٹی''۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا آزاد، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، قائداعظم، مولوی یعقوب، چودھری افضل حق، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، پنڈت مدن موہن مالویہ وغیرہ جیسی شخصیت پر کالم کتاب میں شامل ہیں۔ جہاں یہ ساری شخصیات اپنی خوبیوں خامیوں کے ساتھ چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔

تاریخی اعتبار سے یہ کالم اپنے مخصوص دور ایے میں اس سیاسی منظر نامے کو سمجھنے کا جاندار ذریعہ ہیں جس میں تحریک پاکستان ہندو مسلم اتحاد سے پرے ہوکر قیام پاکستان کے تصور کی طرف بڑھ رہی تھی۔

جلد کے آخر میں پروفیسر ڈاکٹر سعید سیفی کی کالموں اور کتاب کے بارے میں رائے درج ہے۔ یہی رائے ''حرف آغاز'' کے عنوان سے کتاب کی ابتدا میں بھی موجود ہے۔

سرورق دیدہ زیب ہے جو عاطف زیب کی محنت کا نتیجہ ہے۔ کتاب میں کہیں کہیں پروف ریڈنگ کی غلطیاں ہیں جیسے صفحہ ۱۶، ۳۲، ۳۳، ۷۹، ۹۶، ۱۲۰۔

مقبول اکیڈمی لاہور کی چند کتابیں

مبصر: ڈاکٹر وحید قریشی

مقبول اکیڈمی ایک کمرشل طباعتی ادارہ ہے جو ۱۹۵۲ میں قائم ہوا۔ ملک مقبول احمد کی شبانہ روز محنت سے آج یہ ایک اہم پبلشنگ ہاؤس بن چکا ہے۔ اس کا ایک ذیلی ادارہ ''مقبول بکس'' بھی کتابوں کی طباعت کے لیے مشہور ہے۔ اردو بازار کے قریب سرکلر روڈ پر قائم ہونے والا یہ ادارہ اب ترقی کر کے کئی دکانوں تک پھیل چکا ہے۔ چنانچہ مال روڈ پر اس کا شوروم کتابوں کا ایک اہم ذخیرہ پیش کرتا ہے جس میں اپنی مطبوعات کے علاوہ دوسرے اداروں کی کتب بھی موجود ہیں۔

ذیل میں مقبول اکیڈمی کی چند نئی کتابوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے:۔

عمر خیام کے دیس میں:

بلقیس ریاض کی شہرت ایک ناول نگار اور سفرنامہ نگار کی ہے۔ انہوں نے کئی ملکوں کی سیر کی اور ژرف نگاہی سے مختلف ممالک کے باطن میں چھپی ہوئی کیفیات کو اجاگر کیا ہے۔ وہ پی آئی اے کی مشہد کے لیے پہلی پرواز میں بطور مہمان ایران روانہ ہوئیں۔ مختصر سے سفر میں کسی ملک کے باطن میں جھانک کر اس کے تشخص کی پہچان ممکن نہیں، لیکن سرسری سفر میں زیرک سیاح کی طرح انہوں نے گردوپیش کا مشاہدہ ضرور کیا اور ایرانی خواتین کی نفسی کیفیات کو ہنرمندی سے بیان کر دیا ہے۔ طبقہ امرا کی خواتین کے دلوں میں احساس محرومی کے بعض پہلو انہیں اہم دکھائی دیے۔ 'حجاب' کے حوالے سے انہوں نے اس طبقے کے تاثرات کو بیان کر دیا ہے۔ ایرانیوں کی خوش خوری اور چلو کباب، ٹھنڈے نان اور تربوز کا بکثرت استعمال بھی انہیں اہم دکھائی دیے۔ اسی طرح تعلیم کے حوالے سے ایران اور پاکستان کا تقابل ان کی تحریر کا ضروری حصہ ہے۔

اس خوبصورت سفرنامے میں ایک کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔ تحریر کی نوک پلک تو دور کی بات ہے، انہوں نے تو اس پر نظر ثانی کو بھی ضروری خیال نہیں کیا۔ بعض جگہ عبارت کی بے ربطی پریشان کر دیتی ہے۔ بعض الفاظ اور جملوں کی تکرار بھی کتاب کو کہیں کہیں داغ دار کر گئی ہے۔

محترمہ یہ بات فراموش کر گئی ہیں کہ اگر کسی واقعے پر حیرت کا اظہار بالواسطہ کی بجائے براہ راست کیا جائے تو قاری تحیر اور حیرت کی بجائے اسے بالکل فراموش کر دیتا ہے۔ مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:۔

<u>حیران:</u>

میں حیران رہ گئی۔ ص ۷

میں اسے اندر آتے دیکھ کر حیران سی رہ گئی، ص ۷۱

میں حیران سی ان کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ص ۱۱۴

حیرت:

ہماری حیرت میں تو تب اضافہ ہوا۔ص ۲۴

بات حیرت کی یہ تھی۔ص ۹۱

ریاض نے حیرت سے پوچھا۔ص ۱۰۵

حیرانگی (حیرانی؟):

میں حیرانگی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ص ۱۶

ایرانی عورت نے حیرانگی سے پوچھا۔ص ۲۴

اس نے میرے چہرے کی جانب حیرانگی سے دیکھا۔ص ۲۷

اس پر لگے فانوس دیکھ کر حیرانگی ہو رہی تھی۔ص ۳۰

میں نے حیرانگی سے پوچھا۔ص ۳۳، ص ۴۰

سب نے حیرانگی سے میری جانب دیکھا۔ص ۴۱

ایرانی عورت نے حیرانگی سے بچی کو دیکھا اور مجھ سے پوچھا۔ص ۴۲

میں نے حیرانگی سے پوچھا۔ص ۵۴

میری حیرانگی میں اضافہ ہو گیا۔ص ۵۶

پھر وہ حیرانگی سے پوچھنے لگی۔ص ۷۴

اس کی بات سن کر حیرانگی ہو رہی تھی۔ص ۸۴

میری بات سے وہ حیرانگی سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ص ۸۴

فرح تو ایک طرف حیرانگی کی بات یہ ہے کہ ص ۹۷

میاں نے حیرانگی سے پوچھا۔ص ۱۰۵

میں حیرانگی سے اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔ص ۱۰۵

میں حیرانگی سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ص ۱۰۶

حیرانگی کی بھی کوئی بات نہیں۔ص ۱۱۷

ایمی گریشن والوں نے میری بچی طلب کی میں حیرانگی سے ان کا منہ دیکھ رہی تھی۔ص ۱۱۸

عجائبات فرنگ (سفر نامہ)

یہ کمبل پوش کا سفر نامۂ مغرب نہیں بلکہ علی سفیان آفاقی کا سفر نامۂ کینیڈا ہے۔انہوں نے اپنے قیام امریکہ کے زمانے میں فلم سازی کے ارادے سے کینیڈا کا سفر کیا۔ جس کی روداد عجائبات فرنگ ہی کے نام سے شائع کر دی ہے۔نام کی یہ تکرار کوئی اچھا شگون نہیں جس کثرت سے پچھلے چند برس میں سفر نامے لکھے گئے ہیں اس سے ناموں کا قحط پڑ گیا ہے۔ کثیر الاولاد افراد کو ہر بچے کی پیدائش پر نام کا مشکل مرحلہ پیش آتا ہے اسی طرح بکثرت سفر کرنے والے سیاحوں کو تمام سفر ناموں کے نئے نام رکھنے میں

مشکلات پیش آ رہی ہیں۔

علی سفیان آفاقی ایک صاحب طرز ادیب اور عمدہ سفر نامہ نگار ہیں۔صحافت کے علاوہ فلمی دنیا میں بھی انہوں نے اپنی شناخت بنالی ہے۔ شاید اس لیے ادب کی دنیا نے انہیں وہ پذیرائی نہیں دی جس کے وہ مستحق ہیں۔ مجھے ہمیشہ یہ الجھن رہی ہے کہ علی سفیان کو وہ مرتبہ کیوں نہیں ملا جس کے وہ بجا طور پر حق دار ہیں۔ یہ سفر نامہ بھی ان کے شگفتہ قلم کا ایک اہم نقش ہے۔عموماً سفر ناموں کو تاریخ ہی کی شاخ سمجھا گیا ہے اور سفر نامہ نگار اپنے سفر کی روداد کے علاوہ وہاں کے آثار قدیمہ کی گزشتہ تاریخ رقم کرتا چلا جاتا ہے، لیکن آفاقی نے یہ روگ نہیں پالا۔ وہ اپنے زمانے میں رہتے ہیں۔ پُر لطف روداد نگاری میں وہ واقعات کے دلچسپ پہلوؤں اور افراد سے گفتگو میں لطائف وظرائف کو بقدر ضرورت شامل کرتے ہیں اور ان کی مدد سے ان افراد کے سائیکی کو گرفت میں لیتے ہیں۔ امریکہ اور کینیڈا کے باشندوں کے مزاج میں جو نازک سا فرق ہے انہوں نے بڑی چابکدستی سے ان انفرادی خصوصیات کا سراغ لگایا ہے۔

کینیڈا کی فرانسیسی آبادی اور انگریزی آبادی کے مابین جو جذباتی چپقلش ہے اسے بھی بڑے سلیقے سے اجاگر کیا گیا ہے۔ دونوں ملکوں کے مزاج میں کمرشل اور زرعی ممالک ہونے کے ناطے باہمی فاصلہ ہے وہ آفاقی صاحب کی دسترس سے نہیں بچ سکا۔ فلمی دنیا سے متعلق ہیں اس لیے کینیڈا کی Under World میں جو لہریں کارفرما دکھائی دیں انہوں نے بڑی خوبصورتی سے بیان کی ہیں۔

اس سفر نامے کی خاص خوبی یہ ہے کہ یہ صرف واقعات کی ''کھتونی'' نہیں بلکہ کردار نگاری کا کمال بھی ہے۔کردار سازی کا عمل اسے دوسرے سفر ناموں سے ممتاز کرتا ہے۔ مس کڈنی کا کردار پورے سفر نامے میں چھایا ہوا ہے۔ اسی طرح نواب عبدالخالق بھی ایک Typical کردار ہے جس کے خط وخال سفر نامے کے تار و پود میں جا بجا جھلکتے ہیں۔ میگ اور چندر شیکھر، جمیل مراد، مسٹر ہف کے کردار افسانے سے نکل کر سفر نامے میں براجمان ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ یہ حقیقی کردار ہیں اور سفر نامے کو افسانے کا رنگ عطا کر کے اسے دلچسپ اور خوبصورت بناتے ہیں۔

شرح بال جبریل:

قاضی ذوالفقار احمد نے شرحوں کا اہتمام کیا ہے۔اب تک شرح دیوان غالب کے علاوہ علامہ اقبال کی مندرجہ ذیل کتب کی شرحیں شائع کر چکے ہیں:۔

شرح بانگ درا

شرح ضرب کلیم

شرح بال جبریل

اس وقت ہمارے پیش نظر ان کی شرح بال جبریل ہے۔اس سے قبل بال جبریل کی آٹھ شرحیں شائع ہو چکی ہیں۔اس سال بال جبریل کی مزید دو شرحیں شائع ہوئی ہیں۔ ایک قاضی ذوالفقار احمد کی اور دوسری ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی۔خواجہ صاحب کی شرح پر ہم الگ تبصرہ کریں گے۔قاضی صاحب کی شرح کئی شرحوں کے بعد لکھی گئی ہے۔ پہلے شائع ہونے والی شروح سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ شرح کسی حد تک قابل توجہ ہے۔ تاہم اسے اس موضوع پر حرف آخر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اشاعت حاضر میں بعض جگہ پروف خوانی کی اغلاط در آئی ہیں جس سے پڑھنے والا پریشان ہو جاتا ہے۔ کہیں کہیں خود شارح کے قلم نے لغزش کھائی ہے۔ اس لیے ہماری رائے میں اس شرح پر نظر ثانی لازم ہے۔ خصوصاً ہر شعر کے آغاز میں الفاظ کے معانی درج کرنے میں بے احتیاطیاں بہت نظر آتی ہیں جن میں کاتب نے بھی اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے اور فاضل شرح نگار نے بھی احتیاط نظر سے کام نہیں لیا۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

ص ۱۰ دوسری غزل۔ لامکاں: عالم قدس ہو کی غزل (عالم قدس کی منزل؟ یعنی چہ)

ص ۱۳ چوتھی غزل۔ غریب الدیار: موافق ہوا، فرابہ (خرابہ؟) جنت جو آدم کے بغیر آباد ہے

ص ۱۸ آٹھویں غزل۔ بیشہ: جنگل

ص ۲۱ بیسویں غزل۔ دلیر پیوندی (دیر پیوندی معنی ندارد) شاطگی (مشاطگی؟)

ص ۲۹ سولھویں غزل۔ صفا کیش: صاف گو (؟)۔ ابلۂ مسجد: مسجد کا ملا

ص ۳۱۔ ماز (ماز) خواجہ نذیر الدین عطار (فرید الدین)

ص ۳۲۔ زخمہ ور ستار نواز (؟)۔ ص ۳۷۔ کن فیکون: ہو جا کی آواز (؟) چیموں (جیہوں؟)

ص ۴۳۔ دلنوازی: دل کو اچھا لگنے والا (؟)۔ خاکبازی: مٹھی (مٹی؟) سے کھیلنا۔ لغت ہائے حجازی: مراد ذخیرۂ الفاظ۔ شیشہ سازی: راحت و آرام

ص ۴۷۔ پردۂ اسرار۔ بھید (بھیدوں؟) کا پردہ

ص ۴۸۔ لطیفہ ازلی: ابتدا سے ملا ہوا روحانی لطف۔

ص ۴۹۔ داروتی (فاروقی؟)

ص ۲۴۴۔ فقیہوں: مفتی (؟) دین کے قوانین جاننے والے (فقیہ اور مفتی ایک کیسے ہوئے)

بعض مقامات پر اشعار کی شرح بھی نظر ثانی کی محتاج ہے۔ مثلاً:

ص ۵۲۔ غزل ۱۷

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

کی شرح یہ درج کی ہے:۔

''اگر کاروبار کی باگ ڈور مزدور کے ہاتھ میں دے دی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ پہاڑ کھودنے کے لیے (یعنی مزدور کی محنت کا صلہ حاصل کرنے کے لیے) یہ خسرو پرویز جیسے طریقے ہیں۔ (خسرو پرویز نے فرہاد سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ کوہ بے ستون سے نہر کاٹ لائے تو اسے شیریں سے ملا دیا جائے گا۔ دراصل یہ اس کافر ہاد کو ٹالنے اور پہاڑ سے نہر کھدوانے کا ایک طریقہ تھا۔ روسی انقلاب نعرہ تو مزدور کی حکومت کا لگاتا تھا لیکن دراصل وہاں بھی ایک حکمران طبقہ تھا جو مزدوروں کے حوالے سے اپنی سیاست چکا رہا تھا۔ اقبال اس شعر سے اس نظام کی تذلیل کرتے ہیں)''۔

شعر کا پس منظر یہ ہے کہ انگلستان میں الیکشن ہوئے اور لیبر پارٹی برسر اقتدار آ گئی۔ عام خیال یہ تھا کہ مزدوروں کی حکومت آ گئی ہے تو ہندوستان کو آزادی مل جائے گی۔ اقبال شعر میں اس خیال کی تردید کر رہے ہیں۔ روس سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس شرح پر اگر پبلشر نظر ثانی کرا لیتے تو اچھا تھا۔

ارمغان مشرق:

(اردو ترجمہ فارسی رباعیات اقبال)

عبدالعلیم صدیقی نے علامہ اقبال کے فارسی کلام کا منظوم اردو ترجمہ شروع کر رکھا ہے۔ اب تک ان کی مندرجہ ذیل کتب شائع ہو چکی ہیں:۔

عرفان بے خودی (منظوم اردو ترجمہ رموز بے خودی)

جہات خودی (منظوم اردو ترجمہ اسرار خودی)

سیر افلاک (جاوید نامہ کا منظوم اردو ترجمہ)

نعرہ مشرق (پیام مشرق کا منظوم اردو ترجمہ)

نغمہ سروش (زبور عجم کا منظوم اردو ترجمہ)

کیا رنگ ہے تدبیر کا (پس چہ باید کرد کا منظوم اردو ترجمہ)

ارمغان مشرق (پیام مشرق اور ارمغان حجاز کی رباعیات کا منظوم اردو ترجمہ)

ارمغان مشرق کے مترجم فارسی زبان پر عالمانہ قدرت رکھتے ہیں اور اردو کے بہت پختہ گو شاعر ہیں۔ کلام اقبال کو اردو میں منتقل کرنا آسان نہ تھا لیکن انہوں نے یہ بھی کر دکھایا ہے۔ ترجمے کی زبان علامہ کے اردو کلام کے عام اسلوب کے مطابق ہے۔ اس پابندی سے لب و لہجے میں اقبال کی گونج موجود ہے، ان کے ترجمے کو اور بھی زیادہ دلنشین بنا دیا ہے۔ جاوید نامہ میں ان کی کور ذرا دبتی ہے کہ وہاں رفیق خاور ان سے بازی لے گئے ہیں۔ لیکن باقی کتب میں عبدالعلیم صدیقی نے اپنے کمال فن کی دھاک بٹھا دی ہے۔ جو لوگ فارسی نہیں جانتے ان کے لیے تفہیم اقبال آسان ہو گئی ہے۔ ان تراجم کا مقصد بھی یہی تھا۔

دلاور فگاریاں:

دلاور فگار اردو کی مزاحیہ شاعری کا اہم نام ہے۔ ان کے انتقال پر ہدیہ عقیدت کے طور پر ڈاکٹر انور سدید نے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ اس میں ان کے اہم شعروں کا ایک خوب صورت گلدستہ تیار کیا گیا ہے۔ مرتب نے دلاور فگار کے حالات زندگی اور شعری رجحانات کو ان منظومات کے ساتھ مربوط کر کے ایک ایسا مجموعہ تیار کیا ہے جس سے عام قاری بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اظہار عقیدت کا یہ انداز بالکل اچھوتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اگر سید محمد جعفری اور ضمیر جعفری کے بھی اس طرح کے کیپ سول تیار کر دیں تو اردو ادب کی بڑی خدمت ہو گی۔

مختصر تبصرے

لغاتِ روزمرہ

مبصر: محیطا اسمٰعیل

مرتب: شمس الرحمٰن فاروقی   ناشر: انجمن ترقی اردو ہند (بھارت)   صفحات: ۳۰۰   قیمت: ۲۰۰ روپے

شمس الرحمٰن فاروقی اردو ادب میں معروف و مانوس نام ہے۔ ان کی بڑی خدمات ہیں (الٰہ آباد سے ادبی جریدہ ''شب خون'' انھی کی ادارت میں باقاعدگی سے شائع ہوتا اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں پڑھا جاتا ہے۔ اس میں کلام نہیں فاروقی صاحب نے لغات روزمرہ مرتب کرنے میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔ ایک ایک روزمرہ پر مؤلف کے پاس جس قدر روشنی اور روشنائی تھی صرف کردی گئی ہے۔ صحتِ تلفظ نیز تذکیر و تانیث کی صراحت کے لیے جگہ جگہ اساتذہ کے اشعار بطور سند دیے گئے ہیں جبکہ اکثر شعراء وزن پورا کرنے یا باصرارِ ہم قافیہ بنانے کی غرض سے لفظوں کو توڑ مروڑ بھی دیتے ہیں اور یہ رواج یا روایت پہلے سے ہے۔ درجنوں روزمرہ کی بابت فاضل مؤلف فرماتے ہیں کہ یہ نامناسب ہیں اسے ترک ہو جانا چاہیے۔ بیسیوں روزمرہ کے ضمن میں عوام میں رواج کو ترجیح دی جارہی ہے۔ کیا یہ روش تضاد نہیں؟

روزمرہ بولنے کے علاوہ لکھنے میں آئے گا تو صحتِ املا بھی دیکھنا ہوگی۔ درجنوں الفاظ کی املا نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی روح کو تڑپا کر رکھ دیا ہے۔ بڑے بڑے ناموں کے ساتھ مل کر بابائے اردو نے بہت سے اختلافی الفاظ کی املا کے درست اور نادرست ہونے کو حتمی شکل دی تھی۔ مثلاً لئے / لیے، دئے / دیے، کئے / کیے، پئے / پیے، کہئے / کہیے وغیرہ کی بابت یہ اصول بتایا گیا کہ اس صوتی قبیل کے جتنے بھی الفاظ ہوں اس میں یہ دیکھ لیا جائے کہ حرف ماقبل مکسور ہے (یعنی آخر سے پہلے والا حرف بولنے میں زیر کی آواز دے) تو ہمزہ نہیں ی شامل کی جائے...... اسی طرح حرف ماقبل مفتوح (یعنی زبر سے) ہو تو ہمزہ دینا درست ہے۔ اور یہ اصول ہماری سمجھ میں آتا بھی ہے۔ بیسیوں الفاظ کی اختلافی املا کو بابائے اردو نے اسی طرح نبٹایا ہے۔

فاروقی صاحب نے لغاتِ روزمرہ کا انتساب بابائے اردو کے نام کرکے ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں زیادہ تر بحث ان ناپسندیدہ الفاظ، فقروں، اور لسانی اختراعات سے ہے جو غیر ضروری طور پر، یا لکھنے بولنے والوں کے غیر ذمہ دارانہ رویے کے باعث ہماری زبان میں در انداز ہو رہے ہیں۔ علاوہ بریں، بہت سے لغات کے مختلف فیہ تلفظ، یا جنس کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ کچھ اندراجات ایسے ہیں جن کا براہ راست تعلق جدید روزمرہ سے شاید نہ ہو، لیکن جو

لسانی یا تاریخی حیثیت سے دلچسپی کے حامل ہیں اور زبان کے طالب علم، یا اس کے سنجیدہ استعمال کرنے والے کے لیے سودمند ثابت ہو سکتے ہیں۔ زبان ہی ایسی شے ہے جو بیک وقت ماضی اور حال میں موجود رہتی ہے اور اپنی دونوں حیثیتوں میں ہم پر اثر انداز ہوتی ہے۔

کتاب کی اشاعت تعجیل کے بارے میں ادارے کے معتمد کے کارنامے کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے فاروقی صاحب فرماتے ہیں: ''جناب خلیق انجم ہتھیلی پر سرسوں جمانے میں کمال رکھتے ہیں، اس کتاب کی اشاعت کا انتظام و انصرام انھوں نے اس تعجیل سے کیا کہ علاء الدین کے جادوئی چراغ کا موکل بھی انگشت بدنداں رہ گیا ہوگا۔''

کتاب کے متن میں حوالے کے طور پر دیے جانے والے صفحات کے نمبر الٹ کر دیے گئے ہیں اور صفحہ انتساب کے عقب میں بتا دیا گیا ہے کہ تمام نمبروں کو دائیں سے بائیں طرف پڑھا جائے مثلاً ۷۰ کو ۰۷، ۰۰۵ کو ۵۰۰، ۰۰۶ کو ۶۰۰، ۰۸۵۱ کو ۱۵۸۰، ۵۸۵۱ کو ۱۵۸۵ علیٰ ہذا القیاس اگر اسی کو کہتے ہیں ہتھیلی پر سرسوں جمانا تو معتمد انجمن کا قرار واقعی کمال ہے۔ ایسی کتاب شاید ہی کسی کی نظر سے گزری ہو جس میں ساری سنین الٹی رکھی گئی ہوں۔ انجمن ترقی اُردو اپنی مطبوعات کے لیے مشینی کتابت کا شوق رکھتا ہے تو اسے چاہیے ایسا کمپوزر بھی پیدا کرے جو ۲۰۰۳ کو ۳۰۰۲ نہ کرے۔

شبری: (افسانے)

مبصر: عرفان احمد خان

افسانہ نگار: افتخار نسیم   سال اشاعت: ۲۰۰۳ء ناشر: ٹی اینڈ ٹی پبلشرز، لاہور   قیمت: ۱۵۰ روپے   صفحات: ۱۹۲

میرا ''شبری'' کے خالق افتخار نسیم کے بارے میں یہ خیال ہے کہ ''خدا نے اس کے دماغ میں عقل اور خلوص دونوں ہی بھر رکھے ہیں''۔ افتخار نسیم نے ادبی تخلیقات سے ہٹ کر ادب اور آرٹ سے تعلق رکھنے والی نامور شخصیات کی میزبانی کی صورت میں جو درخشاں روایات قائم کی ہیں وہ انہیں اعزازی سفیر پاکستان کا عہدہ دلانے کے لیے کافی ہیں، مگر ایسے لوگ ملنے کی تمنا ہی کب رکھتے ہیں؟ میں خالق سے تخلیق کی جانب آتا ہوں۔ ''شبری'' کے افسانے، افسانے کے لوازم کا پورا اہتمام کیے ہوئے ہیں، یعنی نیاپن اور چونکانے کی صلاحیت۔ تخلیق اپنا اسلوب خود لے کر آتی ہے اور افتخار نسیم سیدھے سبھاؤ اپنی بات قاری تک پہنچانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ ورنہ آج کل افسانہ نگاروں کی اکثریت (خصوصاً انڈیا میں) بیانیہ انداز میں لکھنے کی عادی ہو چکی ہے۔ افسانے اور تقریر میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے؟

''شبری'' میں شامل بیشتر افسانے ایسے ہیں جو ملک کے بڑے ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ انہیں ایک رو میں پڑھنے سے قاری پر خوشگوار تاثر مرتب ہوتا ہے اور وہ افسانوں کے ساتھ ساتھ کسی حد تک افسانہ نگار کی شخصیت سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ کتاب کا نام ''شبری'' بھی قاری کے لیے کشش رکھتا ہے، جس کی وضاحت افتخار نسیم نے کتاب میں کچھ یوں کی ہے:

''رام کو جب چودہ سال کا بن باس مل گیا تو وہ راستے میں ایک گاؤں کے باہر ٹھہرے۔ وہاں ایک اندھی بڑھیا نے انہیں بیر کھلائے۔ بیر کھلانے سے پہلے وہ بیر خود چکھتی تھی۔ میٹھے بیر رام کو دے دیتی تھی اور کھٹے بیر پھینک دیتی تھی۔ اس اندھی بڑھیا کا نام شبری تھا''۔

''شبری'' کتاب میں بھی افتخار نسیم نے بڑھیا شبری کی روایت نبھاتے ہوئے قاری کو میٹھے بیر ہی کھانے کو دیے ہیں اور کھٹے بیر تلخ یادوں کی طرح خود ہضم کر لیے ہیں۔ ہر رائٹر حساس ذہن کا مالک ہوتا ہے۔ اگر حساس نہ ہو تو لکھے ہی کیوں؟ افتخار نسیم بظاہر جتنے بھی خوش باش نظر آتے ہیں یا لوگ انہیں جو بھی سمجھتے ہیں میرے خیال میں ان کی شخصیت کی بہت سی پرتیں ہیں۔ وہ بہت کچھ کرنے کا عزم رکھتے ہیں اور خدا نے انہیں بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ''شبری'' میں افتخار نسیم کے ۲۰ افسانے شامل ہیں، جن میں ''گلو''، ''دوسری موت''، ''اپنی اپنی زندگی'' اور ''آخری قسط'' نمایاں ہیں۔ ویسے تو نیلم احمد بشیر کے لکھے ہوئے تعارفیے کو بھی مجموعے کا ۲۱واں افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ جو تمام افسانوں سے زیادہ متحرک اور جاندار اس لیے نظر آتا ہے کہ وہ ایک زندہ اور زندہ دل شخص کا افسانہ ہے۔ البتہ نیلم احمد بشیر سے تعارفیے کا عنوان ''خوشیا'' اردو زبان کے نمبر ون افسانہ نگار منٹو کا مشہور افسانہ ہے۔ اگر نیلم احمد بشیر نے منٹو کا مذکورہ افسانہ پڑھ رکھا تو پھر یہ نام رکھنا ہی حماقت تھی اور اگر انہوں نے افسانہ نہیں پڑھا تو پھر ان پر افسانہ نہ پڑھنے کے جرم کا ارتکاب کرنے کی دفعہ لگائی جا سکتی ہے۔ بہر حال اگر ''نام میں کیا رکھا ہے'' والی کہاوت کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر نیلم احمد بشیر کو باعزت بری کیا جا سکتا ہے کیونکہ انہوں نے ''خوشیا'' کے زیر عنوان جو بھی لکھا ہے، خاصے کی چیز ہے۔

مجموعے میں افسانہ ''دوسری موت'' تاثر کے حوالے سے اہم ہے۔ یہ افسانہ سمجھوتے کی زندگی گزارنے والوں کا وہ تلخ پہلو سامنے لاتا ہے، جسے ضمیر کی پکار بھی کہا جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں ضمیر کی آواز اس قدر بلند ہو جاتی ہے کہ گمان ہوتا ہے جیسے صور پھونکا جا رہا ہو۔ بس یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب انسان اور آدمی کی تفریق واضح ہوتی ہے اور وہ خود پر آشکارہ ہوتا ہے۔ جبکہ ''بالغ آنکھیں'' نامی افسانہ بھی ضمیر کی آواز ہی کے پس منظر میں لکھا گیا خوبصورت علامتی افسانہ ہے۔ ''اپنی اپنی زندگی'' اس لحاظ سے منفرد افسانہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ہمیں Gays کی وہ مخصوص زبان ملتی ہے جس کی باقاعدہ ڈکشنری غالباً ابھی تک دنیا کی کسی بھی زبان میں شائع نہیں ہوئی۔

کتاب میں افتخار نسیم کے فن اور شخصیت کے حوالے عظیم شخصیات کی گرانقدر رائے بھی درج کی گئی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے افتخار نسیم کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے: ''افتخار تم اپنی زندگی میں ہی Legend بن گئے ہو'' جبکہ دیگر شخصیات میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر سلیم اختر، عظیم موسیقار نوشاد اور پروفیسر سیف اللہ خالد جیسے بڑے نام شامل ہیں۔ کتاب خوبصورت گٹ اپ میں امپورٹڈ کاغذ پر نہایت سلیقے سے طبع کی گئی ہے۔

نسیم حجاز

مبصر: محمد ہارون عثمانی

شاعر: جگن ناتھ آزاد۔ سال اشاعت: ۱۹۹۹۔ ناشر: مرحوم میموریل لٹریری سوسائٹی، نئی دہلی۔ قیمت: -/100 انڈین روپے

جگن ناتھ آزاد کے فن کی بہت سی جہتیں ہیں۔ جو ان کو اپنے والد سے ورثہ میں ملی ہیں۔ ان کے والد تلوک چند محروم کا شمار اردو ادب کے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ آزاد خوش فکر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب رائے نقاد، محقق اور اقبال شناس بھی

ہیں۔ ان کی شاعری کے بہت سے رنگ ہیں۔ جن میں بقول ضیاء الدین اصلاحی 'رنگ حرم' سب سے زیادہ نمایاں ہے جس کی وجہ اقبالیات سے دلچسپی اور برصغیر کی مشترکہ تہذیب وثقافت کے گہرے تاثر کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری کا مجموعہ ''نسیم حجاز'' اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے جسے ضیاالدین اصلاحی نے رنگ حرم قرار دیا ہے۔ جن کے مضمون ''جگن ناتھ آزاد کا رنگ حرم'' کو دیباچے کی حیثیت سے زیر تبصرہ کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ ''نسیم حجاز'' اسلامی شاعری کا خوبصورت مرقع ہے جس میں حمد، نعت، منقبت سے لے کر سلام اور دیگر دینی موضوعات پر ۲۸ نظمیں موجود ہیں۔ پہلی تین نظمیں 'حمد'، 'حمد ونعت' اور 'حمد سے منقبت تک'، رب جلیل کی ثنا، رسول اکرم ﷺ اور اصحاب محمد ﷺ سے عقیدت اور محبت کا مظہر ہیں۔ خاص طور پر ''حمد سے منقبت تک'' کے عنوان سے تو شاید ابھی تک اردو میں کوئی نظم نہیں لکھی گئی۔ اس نظم میں توحید ومعرفت کے اسرار، عظمتِ رسول اور صحابہ کی منقبت کے حقائق نہایت خوبی سے بیان کیے ہیں۔

میں اہل جدل سے نہ کہوں نکتہ توحید — وحدت میں مجھے کام نہیں چوں و چرا سے
جب دل میں یقیں ہے تو گماں سے مجھے کیا کام — ارباب صواب اور انہیں کام خطا سے؟

وہ علم ہے بیکار، خرد باعث آزار — بیگانہ ہے جو صاحب لولاک لما سے

صد شکر کہ ہوں پیرو اصحاب محمد — کیا کام مجھے اور کسی راہ نما سے

اسی طرح آزاد صاحب کی ایک نظم 'بھارت کے مسلماں' دراصل ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک پیغام ہے۔ اس نظم میں آزاد صاحب مسلمانوں کی پرعظمت تاریخ اور ہندوستان میں ان کے زریں عہد کے لازوال کارناموں سے نہ صرف واقف دکھائی دیتے ہیں، بلکہ اس بات کا اعتراف بھی کر رہے ہیں کہ بھارت کے مسلمانوں نے اپنے ملک کی عظمت کو بڑھانے میں اپنی ہر ممکن کوشش کی ہے، لیکن انہیں حیرت ہے کہ اب بھارت کا مسلمان کیوں اپنے کو یہاں اجنبی اور بے گانہ سمجھ رہا ہے جب کہ اس ملک پر اس کا حق کسی فرقہ وگروہ سے کم نہیں۔

میرا ہی نہیں ہے یہ گلستاں ہے ترا بھی — ہر سرو وگل و لالہ و ریحاں ہے ترا بھی
اس خاک کا ہر ذرہ تاباں ہے ترا بھی — اس بحر کا ہر گوہر درخشاں ہے ترا بھی
دامن میں اٹھا لے یہ سبھی گوہر رخشاں
بھارت کے مسلماں

اسی نظم میں وہ مسلمانوں کو ہندوستان کی عظمت وتقدس کی نشانیاں دکھا کر ملک چھوڑنے سے روکتے بھی ہیں اور یہ تلقین بھی کرتے ہیں کہ مسلمان اس ملک میں اپنے امتیازات وتشخصات کو زندہ رکھیں کیونکہ وہ اپنی عظمتوں کے آثار اور گنجینوں کے محافظ ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو غلط رسومات ترک کرنے کی ہدایت بھی کی ہے۔

اسی طرح بابری مسجد کے انہدام کے پس منظر میں لکھی ان کی دو نظمیں بابری مسجد کے سانحے پر ان کی دردمندی اور سچائی کا مظہر ہیں۔

شاعری کے اس مجموعے میں جگن ناتھ آزاد دردمند، پاک باز، شریف طبع، لطیف الخیال، محبت والفت سے معمور دل کے مالک شاعر کی حیثیت سے ابھرے ہیں، جو ان کی شہرت کے عین مطابق ہے۔

مجموعے کی تمام نظموں میں رنگ حرم نمایاں ہے۔ اس لیے کتاب کا عنوان 'نسیم حجاز' کتاب میں پیش کی گئی شاعری کے موضوعات کی واضح نشاندہی کرتا ہے۔ دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے کے باوجود انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جن جذبات کا اظہار کیا ہے وہ کسی ہم مذہب سے بھی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہ کتاب جہاں مسلمانوں کے مذہبی جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ وہیں ایک غیر مسلم کی طرف سے انہیں دعوت فکر بھی دیتی ہے۔

کتاب کی پیش کش مناسب ہے۔ آج کل کے کمپیوٹر کمپوزنگ کے دور میں کتابت شدہ مسودہ البتہ حیران کرتا ہے۔ ۱۶۰ صفحات کی اس کتاب کی قیمت نہایت مناسب ہے۔

لمحوں کا قرض

مبصر: محمد شبیر قمر

مصنف: ڈاکٹر زاہد منیر عامر　　سال اشاعت: ۲۰۰۴ء　　ناشر: دارالتذکیر، لاہور　　قیمت-/130 روپے

''لمحوں کا قرض'' نوجوان سکالر اور اورینٹل کالج شعبہ اردو کے استاد جناب ڈاکٹر زاہد منیر عامر کے رشحاتِ قلم کا فیضان ہے۔ ڈاکٹر صاحب ٹی وی کے معروف مقرر و میزبان ہونے کی ملک گیر پہچان بھی رکھتے ہیں۔ ''لمحوں کا قرض'' ان کی طالب علمی کے دنوں کی یادگار ہے جس میں انہوں نے طلبہ وطالبات اور نوجوان نسل کے فکری، نفسیاتی اور جذباتی مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے اور گہرے غور وخوض کے بعد ان مسائل کے حل کی راہیں متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی اس فکر انگیز تالیف میں انہوں نے مدارس، کالجز اور یونیورسٹیز کے طالب علموں کو حصول تعلیم کے دوران پیش آمدہ مسائل کے پس منظر میں ان کے لیے عملی خاکہ اور لائحہ عمل ترتیب دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو تعلیم کے ان تینوں اداروں کا ذاتی تجربہ حاصل ہے۔ دینی تعلیم ان کی اپروچ کا اساسی نکتہ متعین کرتی ہے۔ مذہبی اقدار سے گہری لگن اور نوجوان طلبہ کے مسائل کے حل کی تڑپ ان کی ذات میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ نسل نو کے ذہنی خلفشار اور فکری انتشار کا انہیں قریبی مشاہدہ حاصل ہے اور اس کا حل تلاش کرنے کے لیے ان کے ذہن میں سوالات کا ایک لاوا ہے جو مسلسل بہاؤ میں رہتا ہے۔ ''لمحوں کا قرض'' ایسے سوالوں کے جواب مہیا کرنے کی ایک شعوری کوشش ہے۔ ''وقت'' اس کائنات میں انسان کی عزیز ترین متاع ہے۔ جن لوگوں نے وقت کی قدر و قیمت کا درست ادراک کر کے اپنی زندگی میں اس کا بہتر استعمال کیا، وہی لوگ کائنات کے سینے پر اپنا نقش چھوڑنے میں کامیاب ٹھہرے۔ ''لمحوں کا قرض'' میں وقت کے ضیاع سے بچنے اور اس کے بہتر استعمال پر گراں قدر مشورے دیے گئے ہیں۔ جس میں بجا طور پر بتایا گیا ہے کہ انسانی زندگی کے بنیادی تقاضے کیا ہیں؟ فرصت کے لمحات میں طالب علم کی مصروفیات کیا ہونی چاہئیں؟ ایک ترقی پذیر معاشرے میں زندگی کی آسائشیں کیا مقام

رکھتی ہیں؟ اور ان آسائشوں کے حصول کے لیے سعی وجدوجہد اور تگ وتاز کی اہمیت کیا ہے؟ چین پھیلاتی تعفنیوں اور لوٹی بہتی کے درمیان سلامتی کی راہ کیسے میسر آسکتی ہے؟ نصب العین کے عدم تعین اور اخلاقی گراوٹوں کے اس متعفن اور پر انتشار ماحول میں ایک سچے طالب علم کو کن کن مثبت رویوں اور کون کون سی اخلاقی روایات کا امین ہونا چاہیے۔ احساس تنہائی کا لاوا نسلِ نو کی صلاحیتوں کو کس طرح بھسم کرنے کے درپے ہے؟ تعلیمی اداروں میں بے بنیاد اور لایعنی مسائل کی بھڑکتی آگ میں نوجوانوں کے آدرشوں اور عزائم کا محل کیسے مسمار ہوتا ہے۔ نوجوانوں میں فرقہ بندیاں اور گروہی تعصبات کس طرح کے خطرناک اور بھیانک نتائج کو جنم دیتے ہیں۔ دوران تعلیم طلبا کے آئیڈیلز کیا بن جاتے ہیں جبکہ درحقیقت ان کے آئیڈیلز کیا ہونے چاہئیں۔ وہ سلگتے ہوئے مسائل ہیں جنہوں نے مصنف موصوف کی توجہات کو بڑی شدت سے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ ان سوالات کا حل تلاش کرنے میں مصنف کو اپنے باطن کی گہرائیوں میں کئی بار غوطہ زن ہونا پڑا ہے۔ سوزِ دروں اور پیچ وتاب کے کئی مرحلوں سے ان کی ذات نبرد آزما ہوئی ہے اور یوں وہ گوہر مراد ساحل سے ہمکنار ہو سکا ہے جو اس کتاب کے صفحات پر جگمگا رہا ہے۔

مصنف حقیقی معنوں میں طلبا کے مسائل کے نبض شناس ٹھہرے ہیں۔ وہ ان کی دکھتی رگوں کو پہچان گئے ہیں۔ اس معرفت کے حصول میں مصنف نے نہ جانے اپنے غور وفکر کے کتنے دنوں کا سوز اور نہ جانے کتنے رتجگوں کی تپش سہی ہوگی۔ بہر حال وہ اپنے حاصلات فکر کو بڑے موثر اور خوبصورت پیرائے میں قارئین تک پہنچانے میں کامیاب ٹھہرے ہیں۔

اپنی اس بامعنی تالیف میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے مشاہدات، تجربات، مسائل کے ادراک، ان کے حل اور تجزیوں کو طلبہ تک پہنچانے کے لیے خط کی تکنیک کا سہارا لیا ہے۔ کتاب میں قدم قدم پر مصنف کی فراست اور دوربینی جھلکتی ہے، جو باضمیر اور سنجیدہ قاری کا دامن پکڑ لیتی ہے۔ کتاب کا ہر جملہ گہرے مشاہدے اور غور وخوض کے بعد لکھا گیا ہے۔ مصنف موصوف نے طلبا کے لیے مایوسیوں اور اندھیروں کے ماحول میں امید کی قندیل روشن کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ ان کی نگاہیں مستقبل پر لگی ہیں اور وہ اپنے قاری کو قنوطیت کی افسردہ فضا سے نکال کر خوش آئند مستقبل کی نوید دیتے ہیں۔

مادی اقدار اور نفسا نفسی کے اس گھٹن زدہ ماحول میں جبکہ خلوص کے دو بول بھی ڈھونڈھے سے نہیں ملتے۔ مصنف نے جس پاکیزگی باطن جس اخلاص نفس، جس محبت، جس تڑپ اور جس جگر سوزی کے ساتھ طلبا کو زندگی کے تاریک راستوں کو منور کرنے کے قرینوں سے آشنا کیا ہے۔ وہ نہ صرف لائق تحسین ہے بلکہ عمل کیے جانے کے قابل بھی ہے۔

طالب علموں کی مزید رہنمائی کے لیے کئی ایسی اہم علمی اور تاریخی شخصیات کے مختصر خاکے بھی دیے گئے ہیں جنہوں نے اپنے اپنے عہد میں ''وقت'' کی قدر و قیمت کو پہچانا، اور انہوں نے وقت کے بہتر استعمال سے لمحوں کا قرض کچھ اس طور پر ادا کیا کہ ان کی شخصیات سینۂ دھر پہ جاوداں ہوگئیں۔ یہ شخصیات آج کے طلبا کے لیے روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتی ہیں بہ شرطے کہ دیکھنے والی آنکھیں اور جذب کرنے والے سینے موجود ہوں۔ نئے اور نہ جاننے والے قاری کے لیے کتاب کے آخر میں ان شخصیات کا ضروری تعارف بھی دے دیا گیا ہے۔

کتاب کا سرورق جاذب نظر اور طباعت عمدہ ہے۔ مصنف کا طرزِ تحریر سادگی اور پرکاری کا بہترین امتزاج لیے ہوئے ہے۔ کہیں بھی ژولودگی در آنے نہیں پائی۔ کہیں کہیں پروف کی غلطیاں طبیعت کو بوجھل کرتی ہیں۔ تاہم کتاب کے اس خوبصورت ایڈیشن کی اشاعت پر مصنف اور ناشر دونوں مبارک باد کے مستحق ہیں۔

پرہیز

کرشن چندر

میں نے دیکھا ہے کہ قدرت ہر حال میں اپنا توازن برقرار رکھتی ہے۔ ہم نے زکام، نزلہ، بخار اور نمونیا کے لیے پینسلین ایجاد کی تو قدرت نے پینسلین ہی کو مہلک بنا دیا۔ اب اتنے لوگ نمونیے سے نہیں مرتے جتنے پینسلین سے مرتے ہیں۔

ہم نے اربوں روپے خرچ کر کے عالمگیر پیمانے پر ملیریا کو ختم کر دیا تو کینسر کا مرض وبائی صورت اختیار کر گیا۔ ہم نے تپ دق کا شافی علاج دریافت کر لیا تو دل کا عارضہ عام ہو گیا۔ جسے دیکھیے اپنے سینے کے بائیں طرف ہاتھ رکھے متوحش نگاہوں سے ڈرا سہما دکھائی دیتا ہے۔ میرے دوستوں میں ہر چوتھا دوست دل کا مریض ہے۔ پہلے دل کی بیماری میں صرف آہ و بکا کی جاتی تھی۔ اب جان بھی جاتی ہے۔

دل کا عارضہ رنج و غم کرنے سے بڑھتا ہے۔ اسی لیے ساری دنیا کے ہارٹ اسپیشلسٹ یہی کہتے ہیں کہ اگر دل کے عارضے سے محفوظ رہنا چاہتے ہو اور لمبی عمر پانا چاہتے ہو تو رنج و محن کو کبھی اپنے قریب پھٹکنے نہ دو۔ ہمیشہ خوش رہا کرو۔ اس لیے اب میں ہمیشہ خوش رہتا ہوں۔ گزشتہ سال میرے والد کا انتقال ہو گیا تو میں برابر مسکراتا رہا۔ احباب تعزیت کو آتے رہے مگر میں مسکراتا رہا۔ نہ جانے انہوں نے کیا سمجھا مگر میں تو ڈاکٹر کے کہنے پر عمل کر رہا تھا۔ پھر جب چھ ماہ بعد میری خالہ محترمہ کا انتقال ہوا تو میں خوش رہنے کے لیے ایک پکچر ہاؤس میں ایک طربیہ فلم دیکھنے چلا گیا۔ پرسوں میرے گھر میں آگ لگ گئی تو میں خوشی سے قہقہے لگانے لگا۔ میری بیوی نے سمجھا شاید میں پاگل ہو چکا ہوں۔ مگر جب میں نے اسے سمجھایا کہ میں پاگل نہیں ہوں محض خوش ہوں اور خوش بھی اس لیے ہوں کہ اس سے عمر بڑھتی ہے تو اس نے پاگل خانے لے جانے والی ایمبولینس واپس کر دی۔ مگر میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ایمبولینس واپس کر دینے پر کچھ خوش نظر نہیں آتی۔

فکر کو دور رکھنے اور دل کو ہمیشہ خوش رکھنے کے علاوہ آج کل ڈاکٹر لوگ اور خصوصاً ہارٹ اسپیشلسٹ دل کی بیماری کے مریضوں یا ہونے والے مریضوں کو وزن گھٹانے کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی رائے میں طویل عمر پانے کا ایک ہی نسخہ ہے۔ اپنا وزن گھٹا دو۔ مجھے اس دلیل میں وزن نظر آتا ہے کیونکہ میں نے سنا ہے، مجنوں لیلیٰ کے مر جانے کے بعد بھی پچھتر برس زندہ رہا! میں نے سنا ہے اور فلموں میں بھی دیکھا ہے کہ اس کا وزن اتنا کم تھا کہ جب اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہوتا تو اس کے دوست اور احباب محض ایک پھونک مار کر اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتے تھے۔ ایک بار زور کی پھونک لگ جانے سے وہ اپنی منزل سے کچھ دور دریا میں گر پڑا۔ مگر ڈوب نہ سکا کیونکہ اس کا وزن پانی سے بھی کم تھا۔ پھر ایک مچھلی نے پھونک ماری اور وہ واپس اپنے احباب کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا گریبان ہمیشہ چاک رہتا تھا، کیونکہ اس کا تن ناتواں کپڑوں کا بوجھ نہ سہہ سکتا تھا۔ لیلیٰ کے مرنے کے بعد مجنوں نے کئی بار مرنے کی کوشش کی مگر ہمیشہ ناکام رہا۔ ڈوب وہ نہ سکا۔ زہر کھایا تو زہر سیال بن کر اس کے جسم

سے نکل گیا، اس لیے کہ زہر کا وزن مجنوں کے وزن سے زیادہ تھا۔ ایک بار مجنوں نے ایک کانٹے سے ایک پتلا دھاگا لٹکا کر پھانسی گلے میں لگا کر مر جانے کی سوچی۔ دس سال تک وہ اس دھاگے سے بندھا کانٹے سے لگا لٹکتا رہا مگر اس کی جان نہ نکلی کیونکہ اس کا وزن دھاگے اور کانٹوں دونوں سے کم تھا۔ پھر ایک دن ایک لڑکے نے اس دھاگے کو مچھلی پکڑنے کا دھاگا سمجھ کر پانی میں لٹکا دیا جہاں مجنوں کو ایک مچھلی نے نگل لیا۔ لیکن وہ اسے ہضم نہ کر سکی۔ کیونکہ ہضم کرنے کے لیے بھی وزن چاہیے۔ اس لیے مجنوں پھر پانی کی سطح پر اگل دیا گیا۔ لوگ باگ کہتے ہیں مگر میں نہیں جانتا، خدا جانے کہاں تک سچ ہے مگر کبھی دیوانے اور فرزانے بھی کہتے ہیں کہ مجنوں آج بھی زندہ ہے۔ کچھ لوگوں کو دیکھ کر تو یہی گمان ہوتا ہے۔ اس کہانی میں اور کوئی صداقت ہو نہ ہو، اتنا ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ آدمی وزن گھٹانے سے دل کی بیماری سے محفوظ رہتا ہے۔ دوسرے عوارض اس پر اس لیے حملہ نہیں کرتے کہ انہیں حملہ کر کے ملے گا کیا؟ اس لیے درازی عمر کی دعا کرنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ اپنا وزن گھٹا لیا جائے۔

وزن گھٹانے سے پہلے یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ وزن بڑھتا کیسے ہے؟ پہلے یہ خیال عام تھا کہ وزن آپ ہی آپ بڑھتا ہے اور بچپن سے بڑھاپے تک ایک خاص مقدار اور رفتار سے بڑھتا رہتا ہے۔ پہلے یہ خیال عام تھا۔ اب ڈاکٹروں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وزن خود بخود نہیں بڑھتا۔ زیادہ اور عمدہ کھانوں سے بڑھتا ہے۔ جس گھر میں اچھا باورچی یا اچھا کھانا پکانے والی بیوی ہو گی اس کے گھر کے مالک کو دل کا عارضہ کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔ یہ لازم ہے کہ اگر آپ دل کے عارضے میں مبتلا نہیں ہونا چاہتے تو ایسا باورچی یا ایسی بیوی لائیے جو کھانا پکانا نہ جانتی ہو۔ اس لیے آج کل طلاق عام ہو رہے ہیں۔ اور پھوہڑ بیویوں کو ترجیح دی جانے لگی ہے اور اچھا کھانا پکانا اور اصلی گھی استعمال کر کے اپنے شوہر کو کھلانا بیویوں کی خامی اور نقائص میں شمار کیا جانے لگا ہے۔ پرسوں میں نے اخبار میں ایک مقدمے کی روداد پڑھی جس میں شوہر نے اپنی بیوی پر زہر دینے کا الزام لگایا تھا۔ تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ بیوی اپنے شوہر کو اصلی گھی میں کھڑے مصالحے کا قورمہ تیار کر کے کھلاتی تھی! عدالت نے مجرمہ کو چھ سال قید با مشقت کی سزا دی ہے کیونکہ ملزمہ اپنے شوہر کو اصلی گھی ہی نہیں کھلاتی تھی صبح ناشتہ میں ایک گلاس اصلی دودھ بھی زبردستی پلاتی تھی تاکہ اس کے شوہر کا وزن بڑھ جائے اور وہ وزن بڑھ جانے سے دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر جلدی مر جائے۔ لیکن آج کل جج عاقل اور دانش مند ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلے پوسٹ مارٹم پر ڈاکٹروں کی رائے طلب کی جاتی تھی، اب سنا ہے عدالت فیصلہ سنانے سے پہلے اس قسم کے وزن بڑھانے والے کیس پر ڈاکٹر کی رائے بھی لیتی ہے اور اسے ناطق سمجھا جاتا ہے۔ سنا ہے کہ آل انڈیا میڈیکل ایسوسی ایشن نے ایک ایسی تجویز حکومت کے سامنے رکھی ہے کہ جو عورت اپنے شوہر کو اصلی گھی کھلائے، اصلی دودھ پلائے اور مرغن کھانے کھلائے اسے فوراً پھانسی دے دی جائے۔ لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ وزن صرف اصلی گھی کھانے اور اصلی دودھ پینے اور گوشت کے مرغن کھانوں ہی سے نہیں بڑھتا وزن دراصل غذا میں نشاستہ کی زیادتی سے بڑھتا ہے اور نشاستہ آلو میں سب سے زیادہ ہوتا ہے، جوں جوں لوگ آلو زیادہ کھاتے جاتے ہیں وزن میں بھالو بنتے جاتے ہیں۔ اس لیے اگر وزن کم کرنا ہے تو آلو مت کھائیے۔ نشاستہ روٹی میں بھی ہوتا ہے اور ڈبل روٹی میں تو اصلی روٹی سے بھی ڈبل ہوتا ہے۔ اسی لیے تو اسے ڈبل روٹی کہا جاتا ہے۔ اس لیے جہاں تک ہو سکے روٹی سے اجتناب کیجیے پہلے زمانے میں لوگ روزی روٹی کے لیے تگ و دو کرتے تھے اور دونوں کو حاصل کر کے موٹے ہو ہو کر مر جاتے تھے۔ اب صرف روزی کے لیے تگ و دو کیجیے اور روٹی کو بالکل ہی بھول جائیے۔ نشاستہ اس لیے بھی برا ہے کہ یہ انسان کے جسم میں پہنچ کر ایک خاص کیمیاوی عمل سے شکر میں تبدیل ہو جاتا ہے اور شکر کی زیادتی سے ذیابیطس ہوتی ہے جس سے اکثر قلب کا دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ نشاستہ انسان کے جسم میں پہنچ کر اس قدر ناشائستہ ہو گا اس کا

مجھے علم نہ تھا۔ آج سے چائے میں شکر بند، مٹھائی بند اور آئس کریم بھی ختم۔

پروٹین بھی انسان کو موٹا کرتی ہے۔ کیونکہ اس میں وہ اجزا ہوتے ہیں جو گوشت بناتے ہیں اس لیے زندہ رہنے کے لیے پروٹین کو بھی کم کرنا ہوگا۔ گندم میں پروٹین ہوتی ہے۔ سرخ گوشت میں پروٹین ہوتی ہے۔ سفید گوشت میں البتہ پروٹین کم ہوتی ہے، جیسے مرغی کا گوشت یا مچھلی۔ آج کل اچھی مرغی آٹھ روپے سے کم میں نہیں آتی۔ اس لیے اگر آپ کی تنخواہ دو سو پچاس روپے ہے تو اس میں سے دو سو چالیس روپے مرغی پر صرف کیجیے اور دس روپے ہر ماہ بچا لیجیے اور جناب مہینے میں دس روپے کی بچت کچھ کم نہیں ہوتی۔ فرض کیجیے کہ آپ اس طرح سو سال زندہ رہیں اور ہر ماہ دس روپے بچاتے رہیں تو ذرا سوچیے کہ آپ کے مرنے کے بعد آپ کے کتنے رشتہ داروں کا بھلا ہوگا۔

گٹھیا بھی دل کا دشمن ہے۔ گٹھیا یورک ایسڈ کی زیادتی سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی جسم کا اندرونی نظام جسے انگریزی میں مٹابولزم کہتے ہیں آپ ہی آپ یورک ایسڈ زیادہ پیدا کرتا ہے اور جو چیزیں یورک ایسڈ پیدا کرتی ہیں، وہ ہیں دالیں، مٹر، پھلیاں، سرخ گوشت وغیرہ۔ یہ یاد رکھیے کہ آپ شکر بند کر چکے ہیں۔ دودھ مکھن آپ پر حرام ہے۔ اب سب کی طرح دالیں مع مٹر بند ہو چکیں تو آپ کیا کھائیں گے؟ غم کھانے کی ضرورت نہیں ہے آرام اور اطمینان سے سوچیے کہ غم کھانے سے بھی عمر کم ہوتی ہے اور آپ لمبی عمر پانا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹروں کی رائے یہ ہے کہ آپ دن کو لوکی کھائیے اور رات کو پالک کا ساگ اور اصلی گھی کی جگہ سورج مکھی کے بیجوں کا تیل استعمال کیجیے بہتر یہ ہوگا کہ سورج کو بھی چھوڑ دیجیے صرف مکھی کا تیل استعمال کیجیے دن کو لوکی رات کو ساگ، اے میری موت دور بھاگ! اور اگر آپ کو لوکی اور پالک کے ساگ اور سورج مکھی کے بیج کے تیل سے نفرت ہے تو صرف پانی پیجیے۔ اس میں تھوڑا سا سنگترے کا رس ملا لیجیے دل کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے نمک بھی مت کھائیے۔ اس کی جگہ صرف سنگترے کا رس پانی میں ملا کر پیجیے۔ ہر اکیس دن کے فاقے کے بعد گاندھی جی یہی کرتے تھے پانی اور سنگترے کا رس۔ بس!

لمبی عمر پانے کا مجھے بھی بچپن سے شوق رہا ہے اور اچھے کھانے کا بھی بچپن سے شوق لیکن دونوں شوق ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اس لیے میں نے وزن گھٹانے کے لیے نشاستہ بند کر دیا اور وہ تمام روٹیاں اور سبزیاں بھی جن میں نشاستہ ہوتا ہے۔ پھر میں نے مٹھائی کھانا بند کر دیا۔ آئس کریم کو چھونے سے انکار کر دیا سرخ گوشت سے پرہیز کیا۔ آلو، مٹر، پھل والی بھاجی آہستہ آہستہ خوراک کم کرتے کرتے میں صرف پانی اور دو چمچے اورنج جوس پر آ گیا۔

دو ہفتے اس خوراک پر کسی نہ کسی طرح زندہ رہ کر جب میں ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو اس نے مجھے وزن تولنے والی مشین پر لا کھڑا کیا۔ معلوم ہوا اس پرہیز کے بعد بھی میرا وزن دس پونڈ بڑھ چکا تھا۔

ڈاکٹر کے چہرے پر ایک خطرناک سنجیدگی کی لہر آئی اسٹیتھسکوپ کو میرے دل پر رکھتے ہوئے بولا ''کیا کھاتے رہتے ہو؟''

میں نے کہا ''پانی میں تھوڑا سا اورنج جوس ڈال کے پیتا رہا ہوں''۔

یہی تو خرابی ہے تم میں'' ڈاکٹر میرے سینے کو اپنے انگوٹھے سے ٹھونکتے ہوئے بولا: ''وزن بڑھ گیا ہے سنگترے کے رس میں بڑے قوی اجزا ہوتے ہیں، میرے خیال میں تم صرف پانی پیئو، ایک ہفتے میں تمہارا وزن کم ہو جائے گا۔ موجودہ حالت اور صحت بے حد خطرناک ہے تمہیں کسی وقت بھی دل کا دورہ پڑ سکتا ہے! اگلے ہفتے آنا!

گھر میں آ کر میں نے بیوی سے کہا کہ آئندہ سے میں صرف پانی پیا کروں گا اور محض پانی پی کر جیا کروں گا۔ صبح ناشتے

میں ایک کپ پانی، لنچ پر ایک گلاس پانی، رات کو دو گلاس پانی۔ ایک ہفتے میں وزن آپ ہی آپ کم ہو جائے گا۔ بیوی نے بھی خوش ہو کر اس پر صاد کیا۔ کیونکہ اس طریقے پر عمل کرنے سے کچن کا خرچ بہت کم ہو گیا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد جب میں پھر ڈاکٹر کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ محض پانی پینے سے میرا وزن دو پونڈ اور بڑھ چکا ہے! ڈاکٹر حیرت میں پڑ گیا۔ بولا ''تم نے کچھ اور تو نہیں کھایا پیا۔ سچ سچ بتاؤ؟''

''مطلق نہیں ڈاکٹر صاحب! آپ فون کر کے میری بیوی سے پوچھ سکتے ہیں''۔

''پانی پینے کا گلاس صاف ستھرا تھا؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ سوڈے سے دھلوایا تھا''۔ میں نے کہا۔ ''ہمیشہ دھلواتا ہوں اور اپنے سامنے نل کا پانی نکلوا کر پیتا ہوں''۔

''پھر وزن کیوں بڑھ گیا؟'' ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا ''جب آپ جانتے ہیں بمبئی کے پانی میں پانی کے سوا سب کچھ ہوتا ہے۔ نل کھولیے تو کبھی پانی کی پتلی دھار کے ساتھ مچھلی چلی آ رہی ہے، کبھی گھونگھے، کبھی چوہے، کبھی کیکڑے ایسی ایسی مقویات پائی جاتی ہیں کہ آدمی اگر اس پانی کو پیے تو ناممکن ہے کہ موٹا نہ ہو''۔

''تو آئندہ سے پانی چھان کر پیجیے''۔ ڈاکٹر نے بڑی سختی سے کہا۔ سولہ روپے نکالو میری فیس کے!''

میں نے سولہ روپے جیب سے نکال کر ڈاکٹر کی ہتھیلی پر رکھے اور گھر چلا آیا اور گھر آ کر بیوی سے کہا کہ وہ میرے لیے کھڑے مصالحے کا گوشت تیار کرے۔ چکن، ریشمی کباب، تیتر کے تکے، قیمے بھرے پراٹھے اور آخر میں ایک پاؤ آئس کریم! رات کو سونے سے پہلے بالائی والے دودھ کا ایک گلاس بھرا ہوا جس میں بادام اور کشمش اور چھوارے بھی پڑے ہوں اور پستہ بھی۔ بیوی نے گھبرا کر کہا ''تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اپنی جان دینے کا؟ بارہ پونڈ وزن تمہارا پہلے سے بڑھ چکا ہے۔ اب صرف چھنا ہوا پانی پیئو، بلکہ ابال کر پیئو!''۔

میں نے کہا ''مرنا تو ہر حال میں ہے۔ میں جیسے کہتا ہوں تم ویسے کرو''۔

دوسرے دن میں نے اس سے کہا ''آج کے مینو میں تندوری مرغ، تلی ہوئی پام فریٹ چکن بریانی اور لہسن سے بگھارا ہوا دہی کا رائیتہ اور آلو کے پراٹھے اور بعد میں بنارسی حلوائی والے کے ہاں سے موہن بھوگ کی ایک پلیٹ! ادھر کھانے میں اصلی گھی استعمال ہو۔ ورنہ تازہ مکھن''۔ سات دن میں نے اسی طرح کا پرہیز رکھا اور خوب ڈٹ کر کھایا۔ بیوی مسلسل احتجاج کرتی رہی اس نے اپنے میکے والوں کو خط لکھ دیا کہ وہ جلد کوئی بری خبر سننے کے لیے تیار رہیں۔ اور میرے تمام دوستوں کو خبردار کر دیا کہ انہوں نے مجھے جو قرضے دے رکھے ہیں وہ جلد سے جلد اس کا چکتا کر لیں ورنہ بعد میں وہ اس کی ذمے دار نہ ہوگی۔

سات دن مرغن غذائیں کھانے کے بعد جب میں نے ڈاکٹر کے کہنے پر وزن تولنے والی مشین پر پاؤں رکھا تو میرا وزن بارہ پاؤنڈ کم ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر کے چہرے پر ایک مطمئن تبسم نظر آیا ''میں کہتا نہ تھا۔ موٹا کرنے والی وزن بڑھانے والی تمام اشیا چھوڑ دو۔ تمہارا وزن خود بخود کم ہو جائے گا۔ دیکھا آج وزن بارہ پاؤنڈ کم ہے اور چہرے پر بھی رونق ہے۔ جو احتیاط پرہیز اور ڈاکٹر کا کہا ماننے سے آتی ہے۔ نکالو بتیس روپے!

آرااور تبصرے

مخزن میں دیکھتا رہتا ہوں۔ بڑا معیاری رسالہ ہے۔ بڑے اچھے مضامین ہوتے ہیں۔ مگر سوچتا ہوں کوئی آج کل ایسے رسالے پڑھتا بھی ہے؟ شاید آپ اور میرے جیسے بوڑھے یا پرانی نسل کے لوگ ایسے رسالوں کو پڑھتے ہوں۔ آئندہ کیا ہوگا مجلس ادارت بھی تو ہمارے جیسوں کی ہے۔ آخر کب تک؟

جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال، لاہور

==================

چاروں شمارے دیدہ زیب ہیں اور ادب پاروں سے مالا مال۔ کیوں نہ ہو جہاں مجلس ادارت سات درخشندہ ستاروں پر مشتمل ہو۔

هرگز عطائے ساقی ما را کرانہ نیست
از تنگ ظرفیست کہ پیمانہ پر شدہ است

منظور الٰہی، لاہور

==================

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اردو کا ایک معیاری علمی و ادبی رسالہ ہے جس کے مقالات کافی وقیع اور سیر حاصل ہوتے ہیں۔ شخصیات اور یادِ رفتگاں کا سلسلہ بھی بہت خوب ہے اور کتابوں پر تبصرے بھی بے لاگ ہوتے ہیں۔ غرض علمی دلچسپی کی تمام چیزیں اس رسالے میں مل جاتی ہیں۔ قائداعظم لائبریری کی یہ ایک لائق ستائش کوشش ہے۔ آپ کی علمی بصیرت اور دیدہ وری نے اس میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ میں اس رسالے کی ترقی اور اردو کے فروغ کے لیے دعا گو ہوں۔

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ، صدر شعبہ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انڈیا

==================

آپ کی ادارت میں نکلنے والے پرچے کا علمی و ادبی معیار تو بلند ہونا ہی تھا، مشتملات کا تنوع بھی بہت خوب ہے۔

نیر مسعود رضوی، لکھنو، انڈیا

==================

مخزن کا یہ شمارہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ آپ کاروان تحقیق کے قافلہ سالار ہیں، جہاں بھی آپ کے مبارک قدم پہنچیں

ے وہاں علم و تحقیق، تدبر و تفکر کے پھول کھل جائیں گے۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی، نئی دہلی، انڈیا

==================

''مخزن'' نے آپ کی سرپرستی میں منزل بہ منزل، افق بہ افق نئی سمتیں اور نئی وسعتیں پائی ہیں۔ پرانے خزانے کو نئے انداز سے آباد کرنے میں آپ نے جس سنجیدگی، متانت اور بلند حوصلگی کا ثبوت دیا ہے وہ واقعی ایک کارنامہ کی حیثیت رکھتا ہے۔
تازہ شمارے میں اقبالیات پر دو اچھے مضامین پڑھنے کو ملے۔ ''یاد رفتگاں'' کے تمام تر مضامین بھی پسند آئے۔ ادبیات کا حصہ بھی کافی جاندار اور وقیع ہے۔
بحیثیت مجموعی تازہ شمارہ بہت معلومات انگیز اور کئی امتیازی خصوصیات کا حامل ہے۔ ادارہ ''نور جنوب'' کی جانب سے مبارک باد قبول فرمائیں۔

علیم صبا نویدی، چیف ایڈیٹر نور جنوب، چنائی، انڈیا

==================

یہ ایک بہت بڑی روایت کی تجدید ہے، اس جریدے کا اجرا اور اسے علم و ادب کی طلب رکھنے والوں پر ارزاں کرنا۔

پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد، ڈین کلیہ اسلامیہ والسنہ، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

==================

استاد مکرم ڈاکٹر وحید قریشی کی نگرانی و مشفقانہ رہنمائی نے پرچے کو صوری اور معنوی اعتبار سے ایک قابل خواندگی مسودہ بنا دیا ہے۔ میں اس کے مندرجات کی ادبی توانائی اور اشاعت دوام کے لیے دعا گو ہوں۔

ڈاکٹر نثار احمد قریشی، صدر شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

==================

''مخزن'' اپنے مزاج کا نہایت وقیع مجلہ ہے۔ اس کے تحقیقی مضامین گراں قدر ہیں۔ اردو زبان کی ترویج اور اس کو اپنا صحیح مقام دلانے کے لیے اس کی مساعی نہایت قابل قدر ہیں۔

مقبول الٰہی، راولپنڈی

==================

مجلہ مخزن کے شمارے بڑے اہتمام سے مل رہے ہیں۔ مندرجات واقعی علم و حکمت کا بیش بہا خزانہ ہیں اور علمی دنیا میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ آپ کی مساعی کو ہزار بار مبارک باد۔ آپ نے پرانے مخزن کا احترام بھی برقرار رکھا اور اس کے معیار کو اور بھی بلند و برتر کر دیا ہے۔ مختلف النوع اہل علم و دانش کے لیے مختلف انواع علمی و حکمت کی معلومات سرمایہ مسرت ہیں۔ مبارک باد قبول فرمائیے۔

پروفیسر ڈاکٹر احمد حسین قریشی قلعداری (تمغۂ امتیاز) گجرات

==================

’’مخزن‘‘ کا از سر نو اجرا ایک نیک فال خوش آئندہ خوشخبری ہے جس نے محبان اردو اور اہل علم وفضل کے دل ودماغ میں ایک نئی اور تازہ امید کی کرن نمودار فرمائی ہے۔ اور انہیں علمی وادبی خطوط پر کام کی پیشرفت کا آغاز ہوا ہے۔ مضامین پُر مغز، علمی و تحقیقی، مستند اور جاندار اسلوب کا مظہر ہیں اور لائق مطالعہ ہیں۔ یقیناً علم وادب کا طالب علم ان سے مستفیض ومستفید ہوگا اور امید قوی ہے کہ مخزن کی دیرینہ علمی روایت جو ایک طرح سے منقطع ہو کر رہ گئی تھی۔ اس دیرینہ اور علمی روایت کو تقویت واستحکام ملے گا۔

میری دلی دعا ہے کہ خداوند کریم اس علمی وادبی روایت کو مستحکم فرمائے اور ثقافت اسلامیہ کا مظہر قومی زبان زندہ وتابندہ رہے۔ آمین۔

ابوالمعانی عصری، دائرہ علم وادب پاکستان، ضلع میانوالی

==================

’’مخزن‘‘ کا نام آتے ہیں لاشعور سے دو ہستیوں کے نام سامنے آتے ہیں۔ سر عبدالقادر اور علامہ محمد اقبال۔ طالب علمی کا زمانہ یاد آتا ہے جب تخصیص سے معلوم ہوتا تھا کہ علامہ صاحب کی فلاں فلاں نظم ’’مخزن‘‘ میں چھپی ہے۔ اس کا اجرا بہت بڑی سعادت ہے۔ ماشاء اللہ کہنہ مشق اساتذہ ادب کی زیر نگرانی چھپنے والا ’’مخزن‘‘ ادبی آب وتاب کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ مندرجات کا ہر حصہ اپنے موضوع کے اعتبار سے معیاری مواد سے مزین ہے۔ ڈاکٹر صاحب تو مانے ہوئے اور مشاق مدیر ہیں۔ ان کی مشاقی کا رنگ ورق ورق عیاں ہے۔ حصہ ادبیات میں محترم شفقت رضوی صاحب نے مولانا حسرت موہانی کے بارے پائی جانے والی غلطیوں کا ازالہ بڑی کاوش سے مفصل اور مدلل انداز سے کیا۔ اس کوشش کی سچائی پر ایمان لائے بغیر چارہ نہیں یہ کاوش میرے جیسے طالب علموں کے لیے گراں قدر تحفہ سے کم نہیں۔ یہ مضمون پڑھ کر اندازہ ہوا کہ بعض شوقیہ نقاد سستی شہرت کی خاطر مشاہیر پر کیچڑ اچھالنے سے باز نہیں آتے۔ مجلس ادارت آسمان ادب کے شمس وقمر اور درخشندہ ستاروں سے منور ہے۔ بھلا ایسے صاحبان کی نگرانی میں ’’مخزن‘‘ اسم بامسمٰی کیوں نہ ہو چشم بددور! ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ صاحبہ نے حفیظ ہوشیار پوری کی ہجرت کا پس منظر خوب واضح کیا طاہر مسعود صاحب کی تحریر قابل ستائش ہے۔ اقبالیات کے باب میں گرامی قدر ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کا ’’اقبال شناسی‘‘ پر تبصرہ مختصر مگر جامع ہے۔ ڈاکٹر وحید عشرت صاحب کا تبصرہ مفصل، مدلل اور جامع ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی ذکاوت، فصاحت وبلاغت پر دال ہے۔ انہوں نے افکار اقبال کے پیش منظر کے الطاف پوشیدہ کی طرف فکر افروز اشارے کیے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ انہوں نے نئے اور پرانے ادیبوں اور اقبال شناسوں کو فکر اقبال کے حوالے سے ایک نیا موضوع فراہم کیا ہے کہ فکر اقبال کے تکوں میں تیل وافر مقدار میں موجود ہے تبصرہ کیا؟ یہ تو کتاب فکر اقبال کا مقدمہ اور دیباچہ ہے۔ اس کاوش پر ڈاکٹر صاحب کو جتنا بھی خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔ ’’اقبال شناسی‘‘ پر مکرمی پروفیسر فتح محمد ملک صاحب کے تبصرے کا شدت سے انتظار رہے گا۔ امید واثق ہے کہ آئندہ شمارے میں ان کا تبصرہ نظر نواز ہوگا۔ ملک صاحب کے تبصرے کے بعد ہی ’’اقبال شناسی‘‘ کے بارے حتمی رائے قائم کی جاسکے گی۔ یادرفتگان کے باب میں ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر تحسین فراقی کے مضامین موضوعات میں ڈوب کر اور جم کر لکھے گئے ہیں۔ تبصرہ کتب بلا تبصرہ بہت اچھے ہیں۔ نئے آنے والی کتب کے بارے اچھی جانکاری پیش کی گئی ہے۔ ’’کھوئے ہوؤں کی جستجو‘‘ سطر سطر سے صاحبان فن طنز ومزاح کی فنی عظمت جھلکتی ہے۔ ان تحریرات کا انتخاب مدیر مکرم کا حسن انتخاب ہے۔ اداریہ میں آپ نے نہایت ہی نازک مسئلے اور اس کا حل بڑے اچھے

انداز میں پیش کیا۔ اس رائے پر ہم پوری طرح سے متفق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارباب اقتدار کو ارباب فکر وفن کی رائے کا احترام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ جریدہ کے مضامین کی طرح طباعت بھی نہایت عمدہ ہے۔ ظاہری وباطنی حسن سے آراستہ ہے اس کی اشاعت کا تسلسل ہی سر عبدالقادر کی روح کے لیے باعث تسکین ہوگا۔ امید ہے یہ فیض عام ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں جاری رہے گا اور ادب دوست حضرات کے لیے تسکین ذوق ادب کا باعث ہوگا۔

غلام شبیر اسد، جھنگ صدر

==================

قائداعظم لائبریری کا ادبی مجلہ ’’مخزن‘‘ بدستور مل رہا ہے جس کے لیے ہم آپ کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ دیدہ زیب طباعت، مثالی مندرجات کے ساتھ ساتھ قائداعظم لائبریری میں منعقدہ تقریبات اور نئی آمدہ کتب کی تفصیل سے مزین یہ سہ ماہی مجلہ بجا طور پر مبارک باد کا مستحق ہے۔ نیز مضامین لکھنے والوں کا تعارف، ہر مضمون میں شامل کیا کریں اور اگر ممکن ہو تو ای میل ایڈریس بھی درج کریں۔

عبدالوحید، چیف لائبریرین پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور

==================

ادبی مجلّہ ’’مخزن‘‘

عہد ساز رسالہ ’’مخزن‘‘ کا اجرا بیسویں صدی کے پہلے سال میں شیخ عبدالقادر نے کیا تھا۔ گزشتہ صدی میں ’’مخزن‘‘ کے دوسرے دور کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اسے ’’نوائے وقت‘‘ کے بانی مدیر حمید نظامی نے جاری کیا تو اس کی ادارت کی ذمہ داری مولانا حامد علی خان کو سونپی جو اس سے قبل طویل عرصے تک رسالہ ’’ہمایوں‘‘ کی ادارت کی خدمات انجام دے چکے تھے۔ اکیسویں صدی میں ’’مخزن‘‘ کی تجدید اشاعت جناب عنایت اللہ نے قائداعظم لائبریری کے ادبی مجلّہ کے طور پر کی ہے اور اس کی ادارت جناب وحید قریشی کے سپرد ہے جو متعدد علمی اور ادبی پرچوں کی ترتیب وتدوین کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ ان کی معاونت کے لیے ایک مجلس مشاورت بھی قائم ہے جس کے صدر عنایت اللہ صاحب ہیں اور ارکان میں انتظار حسین، ڈاکٹر سہیل احمد خان، ڈاکٹر سلیم اختر، انور سدید اور امجد اسلام امجد کے نام شامل ہیں۔ دفتری اور ادبی امور کے معاون محمد ہارون عثمانی ہیں جو خود بھی صاحب مطالعہ ادیب اور نقاد ہیں۔ زیر نظر مخزن کی جلد سوم کا پہلا شمارہ ہے اور یہ اکتوبر ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا ہے۔ ’’مخزن‘‘ اپنے نئے دور میں چونکہ قائداعظم لائبریری لاہور کا مجلّہ ہے اس لیے اس میں مطالعے کے ذوق کو فروغ دینے کی خصوصی کاوش کی گئی ہے۔ اور بالواسطہ طور پر متعدد مصنفین اپنی کتابوں کے حوالے سے زیر بحث آگئے ہیں۔ زیر نظر شمارہ ادبیات، اقبالیات، کھوئے ہوؤں کی جستجو اور یادرفتگاں کے ابواب میں منقسم ہے۔ کتابوں پر مفصل اور مختصر تبصروں کی الگ الگ ذیلیں قائم کی گئی ہیں۔ گزشتہ دنوں ’’اقبال شناسی‘‘ کے عنوان سے پروفیسر منظور احمد کی ایک متنازعہ نوعیت کی کتاب شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب پر ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر وحید عشرت نے اپنے زاویہ نظر کا اظہار کیا ہے۔ جن میں اختلاف کے زاویے توجہ کھینچتے ہیں۔ ایک ہی کتاب پر متعدد مصنفین سے اظہار خیال کرانے کی روایت بے حد اچھی ہے۔ ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ نے حفیظ ہوشیار پوری کی غزل سے ’’ہجرت‘‘

کے مضامین اوران پر شعری ردعمل دریافت کیا ہے۔ طاہر مسعود نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ایک نو دریافت تحریر کا محاکمہ کیا ہے اور بعض ناروا غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ یادرفتگاں میں مالک رام، مولانا اصغر علی روحی، جیلانی کامران، افتخار احمد صدیقی اور سرکھیم سنگھ بیدی کو مصنفین نے اپنی یادوں سے بازیافت کیا ہے۔ تبصروں کے باب میں ''نے چراغ نے گلے''..... رائدین جدیدیت، حیات جاوید، مولانا صلاح الدین پر دو کتابیں، تعارف دیوان مان مشہدی، اصول تحقیق وترتیب متن، یادنامہ داؤدی زیر تبصرہ آئی ہیں۔ محمد ہارون عثمانی نے قائداعظم لائبریری کی کتابوں کی رپورٹ پیش کی ہے اور اس لائبریری میں موجود چند ذاتی ذخیرہ ہائے کتب کا تعارف بھی کرایا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک علمی اور ادبی دستاویز ہے جو تادیر حوالے کے طور پر استعمال ہوگی۔ ''مخزن'' کی تجدید اشاعت اردو ادب کے لیے نیک فال ہے۔

ڈاکٹر انور سدید، روزنامہ نوائے وقت، ۲۳ نومبر ۲۰۰۳ء

==========

''مخزن'' کا نام سامنے آتے ہی اس کا چار پانچ دہائی پہلے والا دور ذہن میں گھوم جاتا ہے۔ اس وقت گنتی کے دو چار ہی ادبی رسائل تھے، مگر ان سے ادب ہی نہیں ادیب کا اعتبار بھی قائم ہوتا تھا، اور اس کا وقار بنتا تھا۔ واقعتاً ان رسائل نے اہل قلم کی ایک سے زیادہ نسلوں کی تربیت کی اور ادب کی تاریخ میں اپنے ان مٹ نقوش چھوڑے۔ تب ایسے رسائل خود ایک ادارہ ہوتے تھے۔ بدلتے وقت نے یوں کیا کہ اب ادارے ایسے رسائل کی ترویج کر رہے ہیں۔

''مخزن'' کے مدیران نے پرانی روایت کی پاس داری کی ہے اور اس کے ابتدائی صفحے پر ''دور جدید'' نمایاں طور پر رقم کروایا ہے۔ اس سے آج کی نسل میں بھی پرانی قدروں سے شناسائی ہوگی اور ان کے اندر گزرے دنوں کی تابندہ اور پائندہ ادب کو جاننے پہچاننے کی خواہش بیدار ہوگی۔

''مخزن'' اب ششماہی جریدے کے طور پر چھپ رہا ہے۔ وحید قریشی جیسے جواں ہمت نقاد، محقق اور شاعر اسے وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھنے کے لیے محنت اور محبت سے کوشش کر رہے ہیں۔ ادبی حلقے جانتے ہیں، ڈاکٹر وحید قریشی گزشتہ کچھ عرصے سے خاصے علیل ہیں، مگر ان کی جاں فشانی کو تحسین وآفرین کا بھرپور خراج کہ انہوں نے پرچے کی اشاعت میں تعطل بھی نہیں آنے دیا اور اس میں اپنی تنقیدی تحریروں کے ساتھ خود بھی باقاعدہ شریک ہوئے ہیں۔ سلیم اختر، شہزاد احمد اور یوسف خٹک نے اکیسویں صدی کے تناظر میں اردو ادب کو دیکھا ہے۔ افضل توصیف نے ایک نازک موضوع کو خوبی سے نبھایا ہے۔ زندگی، ادب اور صنفی حساسیت۔ ڈاکٹر اختر شمار نے بھرتری ہری کی شاعری پر سیر حاصل مضمون لکھ کر، اردو دان طبقے پر احسان کیا ہے۔ اسلم کمال نے نہایت عمدگی سے اپنی شخصیت اور زندگی کے پرت الٹے ہیں۔ باقی سب کچھ بھی توجہ طلب ہے لیکن اس زیادتی کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے کہ رسالے کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ ایسے جرائد عام طور پر طلباء کی ضرورت اور رہنمائی کے لیے ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کی قیمت بھی اسی حساب سے رکھنی چاہیے۔

ماہنامہ تخلیق، لاہور، اگست ۲۰۰۳ء

==========

''مخزن'' قائداعظم لائبریری لاہور کا ادبی مجلہ ہے جس کی اشاعت سے علمی، ادبی اور تحقیقی خدمت کا ایک نیا باب کھل

گیا ہے۔ مدت مدید سے خدا بخش لائبریری پٹنہ یہ خدمت انجام دے رہی ہے۔ مقام مسرت ہے کہ ہمارے ہاں بھی کسی لائبریری کے منتظمین نے اس امر کی طرف توجہ مبذول کی۔ خدا کرے کہ دوسری بڑی لائبریریاں بھی خالص علمی وادبی اور تحقیقی خدمت کی اس راہ پر چلیں اور اردو زبان وادب کے قارئین کو مسلسل معیاری تحقیقی، تنقیدی اور ادبی مواد ملتا رہے۔

زیر نظر شمارہ آٹھ حصوں پر مشتمل ہے جنہیں بڑے سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے۔۔۔ پہلا حصہ ''اردو ادب اور اکیسویں صدی'' ہے۔ ''مخزن'' پہلا ادبی مجلہ ہے جس نے اس عنوان سے باقاعدہ ایک حصہ وقف کر کے ڈاکٹر سلیم اختر، شہزاد احمد اور ڈاکٹر محمد یوسف خٹک کے لائق مطالعہ مضمون شائع کیے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا مضمون بعض تلخ حقیقتوں کی طرف متوجہ کرتا اور مباحث کے کئی در وا کرتا ہے۔ انہوں نے اس تلخ حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جدید ٹیکنالوجی بڑی سرعت سے ترقی کر رہی اور گھر گھر پہنچ رہی ہے مگر کسی گھر میں لائبریری نہیں بن رہی۔ اسی طرح انہوں نے دکھ بھری حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ اردو زبان کا مستقبل پاکستان بننے کے بعد خطرے میں پڑا ہے، آزادی سے قبل اس کا مستقبل اس قدر غیر واضح بلکہ تاریک نہیں تھا۔ انہوں نے بہت تلخ باتیں بڑے موثر انداز میں بیان کی ہیں۔ صفحات کے لحاظ سے یہ مضمون چھوٹا مگر مواد اور اہمیت کے اعتبار سے بہت بڑا مضمون ہے جو ایک بار پڑھ لینے کے بعد اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اسے پھر پڑھا جائے اور اس میں مندرج امور پر غور وفکر کیا جائے۔

شہزاد احمد کا مضمون ''اردو زبان کے مسائل اور اکیسویں صدی'' ایک اہم اور تھوڑے صفحات کے باوجود ایک بڑا مضمون ہے جو مضمون نگار کے مطالعہ پر بھی دلالت کرتا، اکیسویں صدی کے مسائل سے آگاہی کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے اور اردو زبان سے محبت اور اس کے تاریک مستقبل پر گہرے دکھ کی نشان دہی کرتا ہے۔ انہوں نے بڑے دکھی دل کے ساتھ اس تلخ حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اردو کو سرکاری فیصلے کے باوجود ۱۹۸۶ء میں تو کیا ۲۰۰۳ء میں بھی دفتری زبان کا درجہ نہیں دیا گیا۔ اور روز بروز ہمارے ہاں اردو کا مستقبل تاریک اور انگریزی کا روشن ہوتا جا رہا ہے..... مضمون سوچ کی دعوت دیتا ہے اور اردو کے مستقبل کے حوالے سے SOS Call ہے۔

ڈاکٹر محمد یوسف خٹک نے اپنے مضمون ''ادب، ادبی تحقیق اور اکیسویں صدی'' میں اس امر پر زور دیا ہے کہ جدید ٹیکنالوجی سے اردو ادب اور ادبی تحقیق سے معاونت حاصل کی جائے اور اس کا آغاز پرائمری سطح ہی سے کر دیا جائے اور یونیورسٹیوں کے تمام تحقیقی مجلے اپنی تحقیق Website پر بھی شائع کریں تاکہ کم وقت اور کم خرچ سے وہ زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچ سکے۔ ان کی رائے میں اگر ایسا ہو جائے تو اردو ادب اور ادبی تحقیق کا مستقبل روشن ہو سکتا ہے۔

دوسرے حصے میں ''ادبیات'' کے عنوان سے تین مضمون شامل ہیں۔ ڈاکٹر داؤد رہبر کا مضمون ''اردو کا سجاؤ اور ذائقہ'' اور افضل توصیف کا مضمون زندگی ادب اور صنفی حساسیت مواد اور انداز بیان کے اعتبار سے بہت اچھے مضامین ہیں جو ان کے مطالعہ اور حسن تحریر کا دلپذیر امتزاج ہیں۔ بھرتری ہری سنسکرت کے بہت بڑے شاعر ہوئے ہیں جن سے علامہ اقبال بھی متاثر تھے۔ ڈاکٹر اختر شمار نے ''بھرتری ہری کی شاعری کے اردو تراجم'' کے عنوان سے قارئین کو ان کی شاعری سے متعارف کرانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

تیسرے حصے ''شخصیات وسوانح'' میں ایک مضمون محمد حمزہ فاروقی کا اپنے عربی کے فاضل استاد پروفیسر محمد حسن الاعظمی الازہری کے بارے میں ہے جو قارئین کو ایک مثالی استاد سے متعارف کراتا ہے۔ دوسرا مضمون اسلم کمال کا ہے۔ عنوان ہے ''عشق کتاب''۔ اسلم کمال اس وقت ہمارے ملک کے اہم ترین آرٹسٹ ہیں جو جتنے اعلیٰ پائے کے آرٹسٹ ہیں، اتنے ہی کامیاب

نثر نگار اور شاعر بھی ہیں۔ نثر میں ان کا اسلوب اس قدر دلپذیر ہے کہ ان کی طویل تحریر بھی ایک ہی نشست میں کامل دلچسپی اور یکسوئی کے ساتھ پڑھی جاسکتی ہے۔ ''عشق کتاب'' کا مطالعہ قاری کو ان کی شخصیت سے بڑے دلپذیر لہجے میں پوری طرح متعارف کراتا ہے۔ مضمون ایسا جامع اور پیارا ہے کہ قاری کے دل میں اسلم کمال سے محبت اور ملاقات کی آرزو پیدا کرتا ہے۔ مضمون اسلم کمال کے حوالے سے ہے مگر بین السطور کئی اہم شخصیات مثلاً فیض احمد فیض اور محمد طفیل سے بھی متعارف کراتا اور ان کی یادیں تازہ کرتا ہے۔ مضمون نثر میں ہے مگر انداز ایسا پیارا اور رواں ہے کہ افسانے اور شاعری کا سا ذائقہ بھی فراہم کرتا ہے۔

جمہوریت کی بحالی کا چرچا ہونے کے باعث ڈاکٹر وحید قریشی نے جو اردو کے اہم ترین نقادوں میں سے ہیں ''علامہ اقبال کا تصور ریاست'' کے موضوع پر مضمون تحریر کیا ہے جو اس مجلے کے چوتھے حصے ''اقبالیات'' میں شامل ہے۔ تحقیقی اور علمی اعتبار سے یہ اس شمارے کا اہم ترین مضمون ہے جو ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ اور تحقیقی لگن کی آئینہ داری کرتا ہے۔ مضمون صرف علامہ اقبال کے تصور ریاست سے آگاہ ہی نہیں کرتا بلکہ اس کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کرتا ہے۔ اعلیٰ پائے کے اردو مضامین سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے خصوصاً یہ مضمون بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

''کتابے و گوشۂ چمنے'' مجلے کا پانچواں حصہ ہے جس میں کتابوں پر تبصرے ہیں۔ ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے ''ارمغان کشمیر'' (ڈاکٹر آفتاب اصغر) پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے اور مصنف کی بہت سی غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی کی ہے۔

ڈاکٹر عبدالحمید یزدانی فارسی کے فاضل استاد ہیں۔ انہوں نے مشہور کتاب ''تاریخ فرشتہ'' کا تفصیلی مطالعہ کر کے ''تاریخ فرشتہ میں معاشرتی جھلکیاں'' کے عنوان سے مضمون تحریر کیا ہے۔ موضوع، مواد اور پیشکش کے لحاظ سے یہ محض ایک تبصرہ ہی نہیں ایک اعلیٰ پائے کا تحقیقی مضمون ہے جو ۴۱ حوالوں سے مزین ہے۔ محمد سعید نے ''ادارہ یادگار غالب'' کی چند نئی مطبوعات کے عنوان سے ادارے اور اس کی کچھ مطبوعات سے قارئین کو متعارف کرایا ہے۔ مضمون کے آخر میں اہم حوالے اور حواشی مضمون کی قدر و قیمت میں اضافے کا باعث ہیں۔

چھٹے حصے میں ''مختصر تبصرے'' ہیں۔ اس حصے میں ''کتابی سلسلہ دنیا زاد''۔ فلسطین نمبر پر ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر سلیم اختر (محمد سعید) پر محمد ہارون عثمانی ''ادب کہانی ۱۹۹۷ء'' (ڈاکٹر انور سدید) پر جاوید اختر بھٹی ''اکادمی ادبیات کی اردو کتابیں اور رسائل'' پر ڈاکٹر وحید قریشی کے تبصرے شامل ہیں جو مختصر ہونے کے باوجود جامع ہیں اور اتنے مختصر بھی نہیں۔ علاوہ ازیں ''مجلہ صوفی''، ''مجلہ ادبیات'' اور ''پاکستانی ادب'' کے حوالے سے مختصر تبصرے بھی شامل ہیں۔

ساتویں حصے کے مضامین میں ''ریڈیو کے لیے کس طرح لکھتا ہوں'' اور ''جنتری نئے سال کی'' دو اچھے مضامین ہی نہیں بلکہ یہ تحریریں بالترتیب کنہیالال کپور اور ابن انشا سے تھوڑا بہت تعارف بھی کراتی ہیں۔

آخری حصے کے تین مضامین محمد عباس چغتائی، شہناز مزمل اور خلیل احمد چیمہ کے ہیں جنہوں نے بالترتیب 'قائداعظم لائبریری کی عمارت'۔ ''قائداعظم لائبریری کی علمی و ادبی تقاریب''۔ ''قائداعظم لائبریری میں موصول ہونے والے اردو رسائل''۔ یہ مضامین قائداعظم لائبریری کا بھرپور تعارف بھی کراتے ہیں۔ یہ اس عمارت کی تاریخ بھی بتاتے ہیں جس میں اس وقت قائداعظم لائبریری ہے۔

زاہدہ صدیقی۔ ماہنامہ ادب لطیف، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۳

==========

تقریباً ایک صدی قبل 'مخزن' نے سر عبدالقادر کی ادارت میں ظہور کیا اور اپنے ظہور کے بعد تقریباً نصف صدی تک متعدد مدیران کی زیر ادارت اردو ادب و صحافت پر چھایا رہا۔ کچھ عرصے اس نے مولانا حامد علی خاں کی زیر ادارت بھی زندگی کا ثبوت دیا۔ اب ایک طویل مدت تک، منظر عام سے غائب رہنے کے بعد عنایت اللہ کی صدارت اور ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں قائداعظم لائبریری لاہور نے 'مخزن' کی تجدید نو کی اور اسے حیات تازہ سے نوازا ہے۔ قائداعظم لائبریری کے منتظمین جہاں پہلے ہی اپنی اعلیٰ خدمات کی بنا پر محترم جانے جاتے ہیں وہاں 'مخزن' کی اشاعت نو ان کے لیے مزید توقیر کا باعث ہوگی اور جہاں مخزن اپنے قارئین کے لیے راحت بخش ثابت ہوا ہے وہاں اپنے منتظمین اور مصنفین کے لیے بھی حیات بخش ثابت ہوگا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں بھی مخزن نے متعدد نئے لکھنے والوں کو متعارف کروایا اور ایک صدی بعد اب اکیسویں صدی کے اوائل میں بھی یہ کام بہ حسن و خوبی انجام دے رہا ہے۔ اس میں بزرگ لکھنے والے بھی ہیں اور نو آموز بھی بلکہ بعض نو آموز تو ایسے ہیں جن کی پہلی تحریر 'مخزن' ہی نے شائع کی۔ سو برس پہلے کے مخزن میں متعدد نو آموز لکھنے والوں نے آگے چل کر اردو زبان و ادب کے گیسوؤں کو سنوارا۔ امید کی جاسکتی ہے کہ 'مخزن' کے اس دور میں نئے لکھنے والوں کے نام بھی آگے چل کر علم و ادب کے لیے حوالہ بنیں گے اور وہ اردو زبان و ادب کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں گے۔

تجدید نو کے بعد 'مخزن' نے انداز اور مزاج بھی نیا اپنایا ہے۔ آج کے دور میں سنجیدہ نثر (تحقیق و تنقید) کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے جسے عام طور پر دوسرے رسائل نظر انداز کرتے ہیں۔ 'مخزن' کے اب تک چار شمارے شائع ہو چکے ہیں اور پہلے شمارے ہی سے سنجیدہ نثر بالخصوص تحقیق و تنقید اور جدید ادبی رجحانات پر مبنی تحریروں کی اشاعت اس کے مقاصد میں شامل ہے۔ یہ تخصیص اب ''مخزن'' کی پہچان بن گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ قارئین کو اس کے ہر شمارے کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ 'مخزن' میں تحقیق و تنقید کے ساتھ کتب پر طویل اور مختصر تبصرے بھی شامل ہوتے ہیں۔ تبصروں میں بھی 'مخزن' کا قابل قدر حوالہ یہ ہے کہ زیادہ تر ایسی کتب پر تبصرے شائع ہوتے ہیں جو تحقیقی یا تنقیدی مزاج کی ہوتی ہیں۔ اس طرح 'مخزن' کی سنجیدگی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کہ تقریباً ہر شمارے میں قائداعظم لائبریری میں آنے والی نئی کتب اور لائبریری کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے بارے میں بھی معلومات مل جاتی ہیں جن سے قائداعظم لائبریری کی کارکردگی کا اندازہ ہوتا رہتا ہے۔

مخزن کے ہر شمارے کی عمدہ پیش کش اس کی مجلس ادارت کی مرہون منت ہے۔ جس میں مختلف النظریات مگر موجودہ عہد کی بڑی ادبی شخصیات شامل ہیں۔ عنایت اللہ بطور صدر مجلس، ڈاکٹر وحید قریشی مدیر اعزازی، انتظار حسین، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید، امجد اسلام امجد ارکان مجلس ادارت اور محمد ہارون عثمانی معاون امور دفتری و ادبی ہیں۔

مخزن کے چوتھے شمارے کی پیش کش اس بات کا مظہر ہے کہ منتظمین مخزن کی پیش رفت خوب سے خوب تر کی طرف ہے۔ خوب صورت ٹائٹل، عمدہ چھپائی اور اعلیٰ جلد بندی اس کا ثبوت ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مخزن (دور جدید) کو عمر دراز عطا کرے۔ آمین

محمد سعید، سہ ماہی شعر و سخن، مانسہرہ اگست تا اکتوبر ۲۰۰۳۔ ماہنامہ قومی زبان کراچی دسمبر ۲۰۰۳

==========

آدمی سو سوال سے زائد عمر کا ہو جائے تو جہاں رہتا ہے وہاں اسے تقدس آمیز احترام حاصل ہو جاتا ہے۔ درخت سو سال کا ہو جائے تو اس کی چھاؤں اور گھنی ہو جاتی ہے وہ سورج کی تپش کو اپنے سبز پتوں کی ڈھال سے انسانوں پر حملہ آور ہونے سے روکنے کی زیادہ طاقت کا مالک بن جاتا ہے۔ پرندے اس کی شاخوں پر صبح تلاوت کرتے ہیں اور شام کو رزق کی تلاش میں تھک ہار کر جب لوٹتے ہیں تو مل بیٹھ کر ہیر پڑھتے اور سنتے ہیں۔ سو سال سے زائد عمر کی اگر کسی علمی روایت کا ذکر ہو تو پھر قائداعظم لائبریری کے ''مخزن'' کو ایک سیانے بابے اور پرندوں والے قدیم درخت جتنی اہمیت تو ہمیں دینا ہی پڑے گی۔ ششماہی مجلّہ ''مخزن'' اس بار بھی بہت سی علمی معلومات اور اہم تحقیقی کاوشوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ مخزن کے مدیر نامور محقق ڈاکٹر وحید قریشی ہیں جبکہ مجلس ادارت کے صدر جناب عنایت اللہ ہیں۔ یوں اس مجلّہ میں شامل تحریروں کے انتخاب پر یہ دونوں بزرگ لائق ستائش ہیں۔ مخزن کے ۱۶۳ صفحات پر جگمگاتی تحریریں قاری کی توجہ کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہیں تاہم کچھ تحریریں نئی علمی فکر اور ماضی کی تحقیق کے تسامحات کی نشاندہی کے باعث خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ علامہ اقبال پر ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کی طرف سے سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی پروفیسر منظور احمد کی کتاب ''اقبال شناسی'' پر ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے کتاب کے فلسفیانہ مباحث کو ہی نہیں سائنسی فکر کو بھی واضح کرتی ہے۔ آغا صاحب فلسفہ و سائنس پر خشک نہیں بلکہ تر و تازہ اور دلکش اسلوب سے قلم اٹھاتے ہیں۔ اسی کتاب پر ڈاکٹر وحید عشرت نے ''اقبال شناسی'' کی خطرناک جہتیں کے عنوان سے تبصرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر وحید عشرت نے فکر اقبال کی روشنی میں مغرب کی تہذیبی جنگ، آزاد منڈی کی تجارت اور ان تمام ہتھکنڈوں سے نمٹنے کی دعوت دی ہے جن سے مغرب پر امن پسند قوم پر جبر مسلط کر رہا ہے۔ ان کے خیال میں ''مسلم دانشوری اور شعور کو جہاں اقبال نے چھوڑا ہے ڈاکٹر منظور احمد نے اسے آگے بڑھانے کی بجائے ریورس کر دیا ہے۔ اقبال کے ہاں یونانیت اور مغرب کے خلاف بغاوت ہے۔ اگرچہ اقبال اس کی بنیاد پر کوئی لائحہ عمل نہیں دے سکے مگر ڈاکٹر منظور احمد کی بصیرت میں تو اسلامی بصیرت سے گریز اور مغرب زدگی کے سوا کچھ نہیں''۔ ڈاکٹر وحید عشرت کا تبصرہ کتاب کے تقریباً تمام ہی پہلوؤں پر عمدہ رائے کا اظہار ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر منظور احمد کے متعدد تجزیوں کو قابل قدر بھی قرار دیا ہے تاہم اس اہم مضمون پر چند سطروں میں رائے دینا ممکن نہیں۔

یادرفتگان کے سلسلے میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد (بھارت) اور محمود عباس چغتائی کی تحریریں بالترتیب مالک رام اور بابا سرکھیم سنگھ بیدی کی شخصیات اور علمی خدمات ورجحانات پر خوبصورت مضمون ہیں جن میں زیر بحث شخصیت کے لیے مصنفین کے دل میں جو احترام ہے اس کا اظہار بھی جا بجا نظر آتا ہے۔ مفصل تبصروں میں بھارت سے پروفیسر سید امیر حسن عابدی نے پندرھویں صدی عیسوی کے شاعر مانی مشہدی کے فارسی دیوان کا تعارف پیش کیا ہے اس دیوان کا ایک قلمی نسخہ استنبول یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے جبکہ دوسرا دو سو اشعار کا نسخہ رام پور کی رضا لائبریری میں موجود ہے۔ عابدی صاحب نے مانی مشہدی کے اشعار کی داخلی شہادتوں سے اس کے حالات اور رجحانات کی وضاحت کی ہے۔ ایک اہم ادبی و تاریخی سرمائے کا کھوج لگا کر عابدی صاحب نے خوب کام کیا ہے، لیکن اس حوالے سے ہم ان سے ایک زیادہ تفصیلی تحریر کے امیدوار ہیں۔ مخزن کے معاون امور دفتری و ادبی محمد ہارون عثمانی کی کاوشیں مخزن کی دلکشی میں خوب اضافے کا موجب ہیں۔ تبصرہ کے لیے موصولہ کتب کی فہرست سازی اور قائداعظم لائبریری کی علمی و ادبی تقاریب کے متعلق انہوں نے سلیقہ اختصار اور ضروری تفصیلات کا خیال تو رکھا ہی ہے

اس سے قارئین کو علم و ادب کے حوالے سے اہم سرگرمیوں اور کام سے آگاہ کرنے کا فرض بھی نبھایا ہے۔

مخزن میں شفقت رضوی، ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، جعفر بلوچ، رفاقت علی شاہد، محمد سعید، سیدہ مصباح رضوی، شفیق الرحمٰن، فکر تونسوی، ضیاء الدین فاروقی اور فہیم عثمانی کی تحریریں شامل ہیں لیکن جس تحریر کا خصوصیت سے ذکر ضروری ہے وہ جناب طاہر مسعود کا مضمون ''بابائے اردو کی نو دریافت تحریر'' ہے۔ طاہر مسعود ایف سی کالج لاہور میں اردو کے استاد ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی یہ تحریر ۲۹ دسمبر ۱۸۹۴ء کو تہذیب الاخلاق علی گڑھ میں شائع ہوئی تاہم یہ تحریر اکتوبر ۱۸۹۴ء کی محررہ ہے جس کی شہادت طاہر مسعود نے خود مولوی عبدالحق کی ایک تحریر سے پیش کی ہے۔ جس وقت یہ مضمون شائع ہوا اس وقت مولوی صاحب بی اے کے طالب علم تھے۔ وجہ تحریر یہ تھی کہ ڈپٹی نذیر احمد کے اصرار پر جب ''تہذیب الاخلاق'' کی تیسری بار اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کے دوسرے شمارے میں نواب محسن الملک مہدی علی خان نے ''مرحوم تہذیب الاخلاق کا دوبارہ زندہ ہونا'' کے عنوان سے قوم کی تمدنی اور اخلاقی زندگی پر اس پرچے کے متوقع اثرات اور انگریزی تعلیم کی خرابیوں کا ذکر کیا اس پر تہذیب الاخلاق کے ایڈیٹر نے بزرگان قوم سے اس صورت حال سے بچاؤ کے لیے تجاویز طلب کیں پھر انہی دنوں سرسید احمد خان کو کچھ دوستوں نے شکایت کی کہ پرچے کے مضامین اعلیٰ، مفید اور پرجوش نہیں ہوتے۔ اس پر سرسید نے پڑھنے والوں سے چھٹے شمارے میں رائے طلب کی کہ وہ کس قسم کے مضامین پڑھنا چاہتے ہیں اس کے جواب میں ساتویں شمارے میں علی گڑھ کالج کے ایک سابق طالب علم حبیب اللہ خاں نے عمدہ جواب مضمون لکھنے پر گولڈ میڈل پایا۔ اس مضمون کے جواب میں مولوی عبدالحق نے دسویں شمارے میں ''تہذیب الاخلاق کے فرائض'' کے عنوان سے ایک جامع مضمون لکھا۔ مولوی صاحب کا یہ مضمون ایسا جامع تھا کہ اس حوالے سے بحث مزید آگے نہ بڑھ سکی۔ طاہر مسعود کی تحقیقات کے مطابق غالباً اس مضمون پر مولوی عبدالحق کو ''لارڈ لینسڈون وائسرائے'' سلور میڈل عطا کیا گیا۔ سرسید نے سال کے آخر پر تہذیب الاخلاق کے تیسرے دور کی پہلی جلد کے مضامین کی فہرست مرتب کی تو اس میں عبدالحق کی طالب علمانہ حیثیت کو نمایاں کرتے ہوئے نام کے ساتھ ''طالب علم مدرسۃ العلوم علی گڑھ'' لکھا۔ اس مضمون کے حوالے سے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی یہ تحقیق ہے کہ ''انہوں نے ابھی لوئر مڈل کا امتحان بھی پاس نہیں کیا تھا کہ سرسید کے ''تہذیب الاخلاق'' میں ان کا ایک مضمون شائع ہوا''۔ بعد ازاں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اپنے مضمون کو ۱۹۶۸ء میں اپنی مرتب کردہ کتاب ''نقد عبدالحق'' میں مولوی عبدالحق کی علمی و ادبی خدمات کے عنوان سے شامل کیا تو مولوی صاحب کی مذکورہ تحریر میں وجہ بتائے بغیر لوئر مڈل کو انٹرنس میں تبدیل کر دیا۔ طاہر مسعود نے تہذیب الاخلاق کی اشاعت کی تاریخوں کی چھان بین کر کے ثابت کیا ہے کہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی بیان کردہ تاریخ اشاعت کے زمانے میں تو تہذیب الاخلاق کی اشاعت ہی بند تھی اور یہ مضمون مکمل متن کے ساتھ پہلی بار انہوں نے ہی دریافت کیا۔ اسی طرح مولوی صاحب کے بی اے کرنے کے سال کے حوالے سے نرگس صادق اور ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی کی رائے کو بھی طاہر مسعود نے اہم قرار دیا ہے۔ طاہر مسعود کے اس مضمون کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی علمی کاوشوں کا ذکر تو مختلف پہلوؤں سے سامنے آتا ہے لیکن ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی ذات کے متعلق ان کا احترام موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے محققین کو ایسی ہی روش اختیار کرنا چاہیے۔ ان کی تحقیقات کا مقصد علم و ادب کا میدان ہونا چاہیے۔ جہاں ثبوت کے ساتھ علمی نتائج کی حیثیت پر بحث ہوئی ہے نہ کہ بے دلیل جاہلوں کی طرح اچھل اچھل کر ہوا میں تلواریں

چلانے کو کارنامہ سمجھ لیا جائے۔ طاہر مسعود نے اپنی مؤدبانہ طرز دلیل سے آراستہ اسلوب نے اس مضمون کو اور اس مضمون کی شمولیت نے مخزن کی وقعت کو زیادہ نکھار دیا۔ تاہم امجد اسلام امجد، عنایت اللہ، انتظار حسین اور ڈاکٹر سہیل احمد خان کی قلمی معاونت میں بھی کچھ اضافے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے اور ہمارے ادبی ماحول میں جو آلودگی پھیل چکی ہے اس کا تقاضا ہے کہ یہاں جگہ جگہ مخزن جیسے گھنے درخت لگائے جائیں۔

محمد اشرف شریف: روزنامہ دن، لاہور، ۶ نومبر ۲۰۰۳ء

==================

قائداعظم لائبریری جیسے مخزن علم کے ترجمان مجلّہ ''مخزن'' کا پانچواں شمارہ منظر عام پر آ گیا ہے۔ یہ برصغیر کے نامور محققین اور ناقدین کی معتبر تحریروں کا ایک بہترین گلدستہ ہے۔ اس شمارے میں شفقت رضوی، ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ، طاہر مسعود، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر وحید عشرت، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر تحسین فراقی، محمد عباس چغتائی، ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر سید امیر حسن عابدی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، جعفر بلوچ، رفاقت علی شاہد، محمد سعید، سیدہ مصباح رضوی، شفیق الرحمن، فکر تونسوی، محمد ہارون عثمانی، ضیاء الدین فاروقی اور فہیم عثمانی کی تحریریں شامل ہیں۔ اس مجلّہ کے تمام مقالات و مضامین کا پایہ بہت بلند ہے۔ تاہم ایف سی کالج لاہور کے پروفیسر طاہر مسعود کا تحقیقی مضمون ''بابائے اردو کی نو دریافت تحریر'' ''تہذیب الاخلاق کے فرائض'' کو اس مجلّے کا حاصل کہا جا سکتا ہے۔ یہ مضمون بلاشبہ علمی و ادبی دنیا کے لیے ایک انکشاف کا درجہ رکھتا ہے جس کی بازگشت ہندوستان اور پاکستان میں دیر تک سنائی دیتی رہے گی۔ اس قدر عمدہ انتخاب پیش کرنے کا سہرا یقیناً مخزن کے مدیر ڈاکٹر وحید قریشی، معاون مدیر محمد ہارون عثمانی اور مجلس ادارت کے سر ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح کے سال ولادت کی مناسبت سے جہاں تعلیم نسواں پر محمد عباس چغتائی جیسے محقق کا مضمون شامل اشاعت ہے وہاں خواتین کے حوالے سے ڈاکٹر وحید قریشی کا اداریہ بھی قابل توجہ ہے۔ جس میں انہوں نے اسلام آباد، لاہور اور کراچی کی ایسی ادیب خواتین کی فہرست پیش کی ہے جنہیں آئندہ ادبی اداروں کی سربراہی کے معاملے میں پیش نظر رکھا جانا چاہیے۔ اس فہرست میں شیما مجید کا نام نامی بھی شامل ہے۔

روز نامہ خبریں، ۶ نومبر ۲۰۰۳ء

==================

مخزن بڑا معیاری اور اعلیٰ پائے کا ادبی مجلّہ ہے جو اردو کا شوق رکھنے والوں کے لیے لائبریری کا کام کرتا ہے اور ان کی ادبی تشنگی بجھانے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ جس نے تنقیدی، تخلیقی، تحقیقی تحریریں شائع کرنا اپنی ذمہ داری بنالی ہے اور پاکستانی ادب و ثقافت کا ایک مثالی شاہکار ہے اس میں چھپنے والی تحریریں قابل مطالعہ اور بامعنی ہوتی ہیں۔

اقبالیات کے حصے میں ڈاکٹر وزیر آغا کی تحریر نے رسالے کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

مولانا روحی کی شخصیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کے کتابوں کے تبصرے بھی شامل اشاعت ہیں۔ ''مخزن'' کا شمارہ ہر لحاظ سے معیاری متناسب ہوتا ہے۔ اس رسالے میں ادب کے جدید رجحانات اور مسائل خاص موضوعات ہیں۔ آہستہ آہستہ اپنی منزل کی جانب گامزن ہے۔ اس کی مجلس ادارت میں بڑے بڑے نام شامل ہیں۔ جس میں عنایت اللہ صدر مجلس، انتظار حسین، ڈاکٹر سہیل احمد خاں، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر

انور سدید، امجد اسلام امجد، محمد ہارون عثمانی، مدیر ڈاکٹر وحید قریشی ہیں۔ جو اپنی ذمہ داریاں بخوبی نبھا رہے ہیں۔ یہ مخزن رسالہ اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ اس کے تمام مضامین ادب کی توقعات پر پورا اترتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک سنجیدہ اور معتبر رسالہ ہے۔

رابعہ عظمت، روزنامہ انصاف، لاہور، ۸ نومبر ۲۰۰۳

==================

''اقبال شناسی'' کے عنوان سے پروفیسر منظور احمد کے مجموعہ مضامین پر ''مخزن'' میں ڈاکٹر وزیر آغا کا مختصر تبصرہ اور ڈاکٹر وحید عشرت کا تفصیلی جائزہ انتہائی پر مغز، فکر انگیز اور بصیرت افروز تحریریں ہیں۔ جن کی اشاعت پر ڈاکٹر وحید قریشی اور عنایت اللہ بھی مبارک باد کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

عمر زماں، لاہور

==================

Quality Urdu Literature

In its first issue of the year 2003, the editor of the library magazine of Quaid-e-Azam Library called "Makhzan", refers to the year 2003 as the 'Madar-e-Millat Year' that has been very important for the cause of women in Pakistan. Whereas the women population is 51% and the government departments have failed to maintain their representation in the same ratio in providing those jobs, as the percentage of women employment is far less as compared to the one even in the other developing nations.

This has been so despite rise in women getting education in the recent years. In Urdu literature women have made a place for themselves but not a single woman is in-charge of any literary institution, the editor laments. The editorial while mentioning names of certain women literary figures, requests to the government for proper women representation on these forums as well.

The first article in the magazine pertains to some misrepresentations printed in the literary magazines in the past about the poet Hasrat Mohani. Written by Shafqat Rizvi, it aims for clarifying the misconceptions about the literary heights of Hasrat Like the issue of Hasrat being kicked out of his college. A part from the other references, the writer quotes a letter from Qazi Abdul Wadood to Masood Hasan Rizvi observing that it is erroneous to assume that Hasrat was asked to leave college because of a particular Mushaira. This letter was included in the book 'Mashaheer Key Khutoot' in Lukhnow in 1985. Similarly a misconception about Hasrat's joining Muslim League and him getting printed in literary magazines and being under detention for the first time formulates topics of this interesting research work. Many other facets of Hasrat's personality are also discussed in this piece of detailed work.

Another interesting piece of search work is by Dr. Qurat Ul Ain Tahira on the issue of

Kamran. He disregards the opinion of some that has Jillani Saheb spent all his time to poetry; he would have been a much better poet. In supper of his thesis Dr. Saleem Akhtar therefore quotes a poem of Jillani Kamran that he has said in 1969. One of its stanzas says pasand aati hei/Napasandeeda Meri/ Maut Ki Shaka Mein Aa'.

Dr. Tehseen Firaqi remembers Iftikhar Ahmad Sidiqui who died on June 18.2000m an educationist. His PhD thesis on Maulive Nzair Ahmad needs special mention. His hundreds of pupils are a witness to the marathon race late Iftikhar won in his life who would look at both prose and poetry Siddique'sbook on Iqbal titled 'Urooj-e-Iqbal' won him laurels. This book brings Iqbal,s life from 1877 to 1908 into life. Dr. Saheeb has done some memorable translations. For example Iqbal,s diary 'Stray Reflections, once translated by Dr. Siddiqi gives an impression of an original writing.

The other contributions included in this outstanding magazine so very well edited by the editor Dr. Waheed Qureshi, include an article on Baba Sir Khem Singh Bedi's work on women education. Five book reviews are given by Dr. Anwar Sadeed followed by an introduction to Diwan Mani Mashahadi by Professor Syed Ameer Hasan Aabidi. Few additional reviews are followed. An interesting piece of writing is by Safiq ur Rahman titled' Tuzk-e-nadire alia Sayahar Naama-e-Hind'. Overall this scribe found the magazine a true reflection of quality Urdu literature for which the Quaid-e-Azam Library deserves congratulations.

Dr. Amjad Parviz, The Nation, January 6, 2004

==========

A Treasure trove

Makhzan a literary journal published by the Quaid-e-Azam Library under the professional editorship of eminent scholars, encompasses thought-provoking and all embracing essays that cover almost all the forms of prosaic literature including critical analysis of books, biographical analysis of personalities, scathing and profound criticism on the approaches towards Allama Muhammad Iqbal and highly entertaining humorous essays.

The journal focuses unique ideas lying deep behind the façade of commonly perceived, generally told and traditionally approached opinions about great men of letters. It touches upon those sensitive issues that are usually accepted under the influence of great names who propound them and the very first essay "Misconceived writings about Hasrat Mohani" written by Shafqat Rizvi can be quoted as an example as the writer has meticulously pointed out the hyperbolic traditions attributed illogically to the life of Hasrat Mohani. The unauthentic and hyperbolic stories regarding his expulsion from the Aligarh Institute, his fourth time arrest, his joining the Muslim League, his prejudice, bias and lifestyle have been narrated by many a scholar even who have attained degrees on him.

A section has been devoted to Dr. Muhammad Iqbal titled Iqbalyat. Marvellous discussion

Hafeez Hushiapuri's migration. Strictly speaking leaving one's land for other horizons in the name of God is called migration or 'Hijrat'. Hafeez was disappointed with the murders and deaths that took place at the time of Partition. The unstable political environment had also its adverse effect on him and he said "Tamam Umr Kiya Ham Ney Intezar-e-Bahar / Bahar Aai To Sharminda Hein Bahar Sey Ham'. He was optimistic at the same time. He wrote 'Ufaq Peh Had-e-Nazar Tak Ghubar Chaya Hei / Hafeez Ubhrain Gey Akhir Isi Bahar Sey Ham'.Tahir Masood finds some new writings of Baba-e-Urdu Maulvi Abdul Haq in his article included in this magazine. Maulvi owed much to his literary development due to the atmosphere prevalent in Aligarh. The author while mentioning umpteenth books by Maulvi Saheb States that unfortunately his writing titled "Tahzeeb Ul Akhlaq Key Faraiz' remained out of limelight to many.

Dr. Wazir Agha dwells upon his views on the latest book titled 'Iqbal Shanasi' issued by Idara-e-Saqafat-e-Islamia. Since the book intrigues many minds Dr. Wazir Agha while complimenting the writer Manzoor Ahmad states that this article is a summary of Iqbal's thoughts and point of views. The article therefore reflects the philosophical and scientific angles of Iqbal's approach. Manzoor Ahmad has also presented some criticism to Iqbal's philosophy taking the stance that the religion and character also are positive elements in the growth of a society.

Dr. Wazir Agha takes the contention that the total point of view is like web of relations in the terminology of physics especially when its distance with the post era also seems to have diminished now. Special mention is made by Agha Shaeb to the M Theory where existentialism and the present era seem to be faces of the same thing. That is what Manzoor Ahmad's contention that the knowledge of science is taking the man out of its limited study and that science itself is attracting the man towards religion is also reflected in Iqbal's philosophies.

On the same subject Dr. Waheed Ishrat contributes an article titled 'Iqbal Shanasi Ki Khatarnak Jehetain. He is disappointed over the remarks of Manzoor Ahmad who has been the head of the philosophy Department of Karachi University that enough has been extracted from Iqbal's philosophy. If that were true then all this research work and wrote Waheed Isharat. Fro more details this scribe recommends a study of this article.

Professor Jagan Nath Azad contributes a short story titled 'Malik Raam.' Dr. Khurshid Rizvi contributes an article on maulana Roohi. It remains a mystery to everyone about making a picture in their mines about a person whom one has not met but has heard a lot about. This is what happened to Dr. Khurshid Rizvi who came to know about the life and works of Moulana Ashar Ali Roohi thought one of his disciples Dr. Soofi Muhammad Zia ul Háq in Sahiwal. The year was 1955. A comprehensive article by Dr. Saleem Akhtar on Jillani Kamran's contributions in criticism included in this magazine. Dr. Saleem found a very good poet and a critic in late Jillani

GOVERNMENT OF NWFP
SCHOOLS AND LITERACY DEPARTMENT

NO. S.O. (TRG. S&L)/10-20/2003/Mukhzan
Dated Peshawar, the 01-09-2003

To,

1. The Director,
   schools and Literacy, NWFP
2. The Director,
   Public Libraries
   NWFP. Peshawar.

SUBJECT:- **APPROVAL OF BOOK TITLED 'MUKHZAN' FOR SCHOOLS / PUBLIC LIBRARIES IN THE PROVINCE.**

Dear Sir,

The Government of the NWFP, Schools and Literacy Departments is pleased to approve the following book for schools/ public libraries in the province. You are accordingly requested to convey the approval of the Government to your lower information for further necessary action:-

S. No.	Name of the Publisher/ authors	Approval for Libraries/ Schools
01.	Dr. Waheed Qureshi, Editor Mukhzan, Quaid-e-Azam Library Bagh-e-Jinnah, Lahore.	Approved for all schools and Libraries in the Province.

Yours faithfully,
-sd-
(Hidayatullah Khan)
Section Officer (Training)

Encl:_ As above.

Endst:- Even No. and date.
A copy is forwarder to:

1. Dr. Waheed Qureshi, Editor Mukhzan, Quaid-e-Azam Library, Bagh-e-Jinnah Lahore.
2. P.S. to Secretary to Govt. of NWFP Schools and Literacy Department.

-sd-
Section Officer (Training)

based on counter arguments have been put forward in the section. Dr Wahid Ishrat has proffered a detailed commentary on the essays of Dr. Manzoor Ahmad who is a well-known scholar and has written a lot on Allama Iqbal's philosophy. The commentator contradicts the writer's arguments regarding Iqbal's paradigm that the edifice of European civilization was erected on the Islamic civilization. He takes a hard stance on the point of mentioning Iqbal as not a philosopher in spirit by furnishing arguments that no philosopher can be cut off from the social, economic, moral and cultural environment of the life he lives in.

According to the commentator, the philosophy is always steeped into the circumstanced and that is why Iqbal seems to be discussing the concepts of universal good, reconstruction of character, dynamic concept of human life, hunger of mankind, capitalism, socialism and everything that is sprouting from life for the concern of man. He exemplifies Socrates, Hegel, Kant, Descartes and Hobbes whose philosophies were established on the heritage of their ancestor and life itself. The commentator refutes the
argument of Dr. Manzoor Ahmad in which he has juxtaposed the Muslim imperialism with that of the European's. He explains that Muslims did not invade with a view to come back after plundering as the European imperialists did.

The biographical essay of Malik Ram written by Prof. Jaggan Naath Azad lets us have a peep into the hidden aspects of the writer's life and the reader comes to know about the commitment, dedication and philanthropy of the writer. Dr. Saleem Akhtar has brought the works and concepts of Jeelani Kamran to light in an immensely pithy and succinct language. He has divided the critical asset of Jeelani Kamran into three spheres as he learnt the rules of modern criticism in English literature, attained the principles of aesthetics from classical Urdu literature and borrowed the pantheistic caption from the Sufi poets.

The humorous essays of Fikar Taunswi carries mild satire that opens up various windows of thoughts letting the reader have an awareness of the hypocrisy and shortcomings prevalent in the society. Beautiful excerpts and verses from English, Urdu and Persian poetry are included in Makhzan. They cater to the intellectual and aesthetic requirement of the readers. The journal is a curious combination of farfetched ideas based on argumentative discussions, untraditional thoughts, literary debates and beautiful humour and undoubtedly, a great contribution of the library.

Zeeshan Hussain, Weekly Independent, November 06-12-2003

==========

لائبریریاں۔ ہماری اشد ضرورت

ڈاکٹر ممتاز احمد خان

دوران تدریس ایک سبق کے آخیر میں مشقوں کے درمیان مجھے ایک پیراگراف پڑھنے کا اتفاق ہوا جو برطانیہ میں لائبریریوں سے متعلق تھا۔ پاکستان میں لائبریریاں بہت کم تعداد میں پائی جاتی ہیں اور بہت سی قدیم لائبریریوں کی زبوں حالی اس پر مستزاد ہے۔ اس صورت حال میں برطانوی لائبریریوں کی کارکردگی سے متعلق پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ اس پیراگراف میں مندرجہ ذیل باتیں کہی گئی تھیں:

''برطانیہ میں ہر قصبے میں ایک پبلک لائبریری موجود ہے اور ہر لائبریری کی شاخیں دیہاتوں میں کام کرتی ہیں تاکہ ہر شخص ان سے استفادہ کر سکے۔ ہر شخص لائبریری کا ممبر بن سکتا ہے اور اسے کوئی ممبر شپ فیس ادا نہیں کرنا پڑتی۔ ہر ممبر تین کتب حاصل کر سکتا ہے جن میں دو ناول ہوتے ہیں۔ اگر کسی گھرانے میں چار ممبران ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک ہی وقت میں وہ بارہ کتب سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ ہر ممبر کتابیں پندرہ روز تک رکھ سکتا ہے اور مطالعہ نامکمل ہونے کی صورت میں وہ انہیں مزید پندرہ دن کے لیے توسیع کرا سکتا ہے۔ اگر کسی وقت کوئی کتاب جو وہ چاہتا ہے موجود نہ ہو تو لائبریرین کو اس بارے میں آگاہ کر دیا جاتا ہے جو واپسی پر آپ کے لیے محفوظ ہو جائے گی۔ اگر کوئی ممبر لائبریرین کو پوسٹ کارڈ بھیج دے یا اس کی قیمت ادا کر دے تو وہ ممبر کو کتاب کی واپسی پر اسے مطلع کر دے گا تاکہ وہ لائبریری جا کر اپنی مطلوبہ کتاب حاصل کر سکے۔

ان لائبریریوں کی معتد بہ تعداد ایسی ہے جن میں ریڈنگ رومز اور ریفرنس رومز جیسے شعبے بھی ہوتے ہیں۔ ریڈنگ رومز میں مطالعہ کے شوقین اخبارات اور رسائل پڑھتے ہیں اور ریفرنس رومز میں لغات، انسائیکلوپیڈیاز، ایٹلس اور لاتعداد ایسی اہم کتب ہوتی ہیں جو ممبران اپنے گھر نہیں لے جا سکتے ان لیے کہ ان کتب کا دوبارہ حصول مشکل ہوتا ہے''۔

یہ برطانیہ میں ان لائبریریوں کا احوال ہے جو جا بجا موجود ہیں۔ ان سے ہٹ کر وہاں بڑی بڑی لائبریریاں بھی موجود ہیں جن کی تاریخی اہمیت ہے۔ جہاں کتابوں، مخطوطات، اخبارات، رسائل و جرائد، فوٹو اسٹیٹ کی سہولیات اور ان کی فلمیں موجود ہیں۔ اس طرح ان میں سالہا سال کا علمی و ادبی اثاثہ موجود ہے۔ مثال کے طور پر انڈیا آفس لائبریری ایک ایسی عظیم الشان لائبریری ہے جو بین الاقوامی معیارات کی حامل ہے اور اس پر برطانیہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

اب ادھر پاکستان کی طرف آ جائیے۔ یہاں بڑے بڑے شہروں مثلاً اسلام آباد، کراچی، لاہور، کوئٹہ، پشاور وغیرہ میں

ایسی کشادہ لائبریریاں موجود ہیں جن سے ہزاروں لوگ استفادہ کر رہے ہیں لیکن اپنی تعداد کے اعتبار سے یہ تمام باشندوں کی ضروریات کو پورا نہیں کرتیں۔ تمام باشندے صرف اس صورت میں اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں جب لائبریریوں کا جال بچھا ہوا ہو تاکہ ہر علاقے اور محلے کے طالب علم اور عام شائقین دور دراز کے علاقوں میں جانے کے بجائے کتب، رسائل اور اخبارات سے استفادہ کر سکیں۔ لائبریریاں دوسرے عوامل کے علاوہ اپنی ذات میں چاہے سست روی کے ساتھ ہی سہی شرح خواندگی میں اضافہ کرنے کا سبب بنتی رہتی ہیں۔ وہ ممالک جہاں شرح خواندگی قابل رشک ہے وہاں کے علمی و ثقافتی ریکارڈ سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ زیادہ تر سرکاری سرپرستی میں قائم کی جانے والی لائبریریوں نے مطالعہ کے ذوق میں زبردست اضافے کے ساتھ ساتھ شرح خواندگی میں بھرپور اضافے کے لیے اپنا کردار انجام دیا ہے۔ گو کہ نجی اداروں کی لائبریریوں کا بھی اپنی جگہ ایک مقام ہے لیکن وہاں ہر شخص کی رسائی ممکن نہیں ہے اور جہاں مختلف حوالوں مثلاً ٹرانسپورٹ کے اخراجات، وقت کی کمی، لائبریریوں کی گھنی آبادیوں سے دوری اور غربت کے باعث کتابوں کی خریداری سے معذوری اور دیگر مجبوریاں کارفرما ہوں وہاں سرکاری سرپرستی میں کتب خانوں کا قیام از بس ضروری ہے۔

راقم الحروف کو اچھی طرح یاد ہے کہ تقریباً دو یا ڈھائی دہائی پیشتر ایک میئر (MAYOR) نے کراچی کے کئی علاقوں میں اپنے محدود مالی وسائل کے باوجود چند لائبریریاں قائم کی تھیں جو بلدیاتی ادارے کے تحت ابھی تک قائم و دائم ہیں۔ اب ناظمین کا نظام وجود میں آیا ہے۔ کوئی بھی ایسا ناظم جس کے دل میں علم و ادب کے فروغ کی تڑپ موجود ہے وہ یقیناً اپنے اپنے علاقوں میں کتب خانوں کے قیام میں اپنا حصہ ڈال سکتا ہے اور یہ ایک ایسا ابدی منصوبہ ہے کہ ناظموں کی کونسلوں میں کوئی بھی ایسا کونسلر نہیں ہوگا جو اس کی مخالفت کرے لیکن یہ کام اگر ایک تحریک کی صورت میں انجام پائے تو زبردست نتائج سامنے آ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر وفاقی حکومت کے دو ادارے یعنی تعلیم اور ثقافت کی وزارتیں پورے ملک کے ناظمین سے رابطے کر کے انہیں اس امر کا احساس دلا سکتے ہیں کہ وہ لائبریریوں کا اپنے اپنے علاقوں میں جال بچھائیں۔ یہ کام انتہائی آسان ہے۔ جب کروڑوں روپے ٹوٹی ہوئی سڑکوں اور بہتے ہوئے گٹروں کو بند کرنے پر خرچ ہو سکتے ہیں تو لائبریریوں پر خرچہ کیوں نہیں؟ بلدیاتی اداروں کی جانب سے لائبریریوں کے قیام سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں کتب و رسائل فروخت ہوں گے۔ خاص طور پر ہمیں تو کتابوں سے غرض ہے اس لیے کہ پبلشروں کو منہ بسورتے ہی دیکھا کہ نقصان ہو رہا ہے جناب عالی! دوسرا فائدہ یہ ہے کہ پورے ملک میں لائبریریوں کے جال بچھ جانے سے ہزار ہا بے روزگار گریجوایٹ لڑکوں اور لڑکیوں کو روزگار مل جائے گا اور جب وہ بلدیات کے لیے پے رول Payroll پر آ جائیں گے تو ان کی نوکریاں ایک طویل عرصے تک قائم و دائم رہیں گی۔

جہاں تک دوسرے قسم کی پرائیویٹ لائبریریوں کا تعلق ہے جیسے کہ میرے شہر کراچی میں غالب لائبریری ہے جو بے مثل ادیب، محقق و فکاہیہ کالم نگار مشفق خواجہ کی نگرانی میں کام کر رہی ہے یا انجمن ترقی اردو لائبریری ہے جس کے سنوارنے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے بعد ڈاکٹر جمیل الدین عالی اور دوسرے متولیان نے خاص کام کیا ہے۔ حکومت کی جانب سے ان کو اتنی گرانٹ نہیں مل رہی ہے جتنی کہ ہونا چاہیے۔ غالب لائبریری میں ایک فوٹو اسٹیٹ مشین تھی جس سے ہزاروں طالب علموں نے فائدہ اٹھایا لیکن اب بند ہے۔ مرمت کے اخراجات معمولی نہیں ہوتے لہٰذا زیادہ گرانٹس خواہ مرکزی حکومت دے یا صوبائی حکومت ضروری ہیں۔ انجمن ترقی اردو کی لائبریری میں بھی ایک کیا دو تین فوٹو اسٹیٹ مشینیں ہونا چاہئیں اور ان کی مرمت کے

لیے اضافی رقوم بھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرکزی حکومت اپنے حساب سے گرانٹ دیتی ہے لیکن ہمارا تو مطالبہ ہے کہ اس میں معتد بہ اضافہ ہو۔ ابھی حال ہی میں جمیل الدین عالی کی پرخلوص کوششوں سے گورنر سندھ نے انجمن ترقی اردو پاکستان کے لیے پانچ لاکھ روپے کی گرانٹ کا اعلان کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کتابوں کی اشاعت سے لے کر دوسرے منصوبوں کو اس رقم سے فائدہ پہنچ جائے گا اور اگر یہ رقم ہر سال ملتی رہے تو زیادہ علمی و ادبی فوائد ہوں گے۔

لائبریریوں یا کتب خانوں کے حوالے سے خاکسار کو یہ ہلکا پھلکا سا مضمون لکھنے پر علم کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے حکم اور سرکار دو عالم آنحضرت محمد ﷺ کے فرمان نے بھی اکسایا۔ لائبریریاں علم اور حکمت کا بازو ہوتی ہیں۔ یاد کیجیے کہ مسلم ہسپانیہ میں مسلمانوں نے کتب خانوں کے قیام اور کتابوں کی اشاعت کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ یہ تو ہماری دینی، ثقافتی و تمدنی میراث بھی ہیں۔ قرآن کی پہلی آیت ہی علم کی فضیلت کے بارے میں ہے۔ اللہ نے قلم تک کی قسم کھائی ہے جو علم، ادب، تہذیب و تمدن کے فروغ کا اہم ذریعہ ہے۔ آنحضرت محمد ﷺ نے علم کے حصول کے لیے چین تک جانے کا مشورہ دیا اور قرآن شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت محمد ﷺ سے کہا کہ اے محمد ہم سے اپنے علم میں اضافے کی دعا مانگو۔ پھر علم تو انبیا کی میراث ہے اور کتب خانے علم کے حصول کا اہم وسیلہ ہیں۔ علم کی بدولت یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا پہلو جاگا اور انیسویں صدی تک آتے آتے انہوں نے نہ صرف صنعتی ترقی کی بلکہ دوسروں تک اسے پہنچایا، یعنی مسلمانوں کی تقلید کی جنہوں نے ہسپانیہ کے مستقر سے یورپ کے تشنگان علم کو فائدہ پہنچایا۔ ہر پڑھا لکھا اس حقیقت سے باخبر ہے۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی، لیکن یہ ہمارے اہم مسائل میں سے ایک ہے۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر بات کی جاتی رہنا چاہیے۔ کوئی نہ کوئی صاحب عمل و حکمت پیدا ہو ہی جاتا ہے اور ایک طویل عرصے سے ہمارے دیکھے ہوئے خوابوں کی تعبیر مل ہی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر پروفیسر ڈاکٹر عطاء الرحمٰن کو دیکھ لیجیے۔ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، یعنی انفارمیشن ٹیکنالوجی ہی کے فروغ کے لیے ہائر ایجوکیشن کمیشن کے پلیٹ فارم سے بحیثیت چیئرمین اور بحیثیت وفاقی وزیر برائے سائنس اینڈ ٹیکنالوجی ہمارے خواب کی تعبیر پیش کر دی۔ خاص طور پر جمیل الدین عالی اور دیگر محبان اردو کی تحریک اور دلچسپی کی وجہ سے انہوں نے وفاقی یونیورسٹی برائے فنون، سائنس اور ٹیکنالوجی کو حقیقت بنا دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک دن ایسا کوئی باعمل دیدہ ور ضرور پیدا ہوگا جو کتب خانوں کا جال بچھا دے گا۔

قائداعظم لائبریری میں آنے والی نئی اردو کتب

ضیاء الدین فاروقی

۱۔ ڈش انٹینا/سرفراز شاہد، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص ۳۱۴، قیمت ۔/۲۰۰ روپے

۲۔ دسویں صدی ایک نظر میں/زاہد حسین انجم، لاہور: خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۳، ص ۱۴۰۲، قیمت ۔/۴۵۰ روپے

۳۔ موج ادراک/محسن نقوی، لاہور: ماورا پبلشرز، ۲۰۰۳، ص ۱۶۰، قیمت ۔/۱۵۰ روپے

۴۔ ساحلوں کی ہوا/امجد اسلام امجد، لاہور: جہانگیر بک ڈپو، ۲۰۰۲، ص ۱۳۹، قیمت ۔/۱۶۵ روپے

۵۔ کتب اور کتب خانوں کی تاریخ/اشرف علی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۲، ص ۴۱۶، قیمت ۔/۱۵۰ روپے

۶۔ وفاقی و صوبائی عہدوں کے نام/مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۳، ص ۸۰، قیمت ۔/۳۰ روپے

۷۔ عروج آدم/ڈاکٹر محمود علی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۳، ص ۲۱۹، قیمت ۔/۱۴۰ روپے

۸۔ قانون قصاص و دیت ۲۰۰۳/میاں مسعود احمد بھٹہ، لاہور: آہن ادارہ اشاعت و تحقیق، ۲۰۰۲، ص ۴۹۴، قیمت ۔/۶۰۰ روپے

۹۔ خاکسار تحریک کی انقلابی جدوجہد/ثناء اللہ اختر، راولپنڈی: مصنف، ۲۰۰۳، ص ۶۴۶، قیمت ۔/۶۰۰ روپے

۱۰۔ آئینہ/رضیہ بٹ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص ۳۶۰، قیمت ۔/۳۰ روپے

۱۱۔ عالمگیر (ناول)/ایم جے زیب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۱۷۴، قیمت ۔/۲۲۵ روپے

۱۲۔ ایک اور دریا/محمد سعید شیخ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص ۴۷۷، قیمت ۔/۴۰۰ روپے

۱۳۔ ایک ہی بولی/اشفاق احمد، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص ۱۲۳، قیمت ۔/۱۱۰ روپے

۱۴۔ امریکی یاترا/رضیہ بٹ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۴۴۸، قیمت ۔/۳۷۵ روپے

۱۵۔ اور چنار جلتے رہے/اے حمید، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص ۲۲۸، قیمت ۔/۱۸۰ روپے

۱۶۔ ۷۲ دن: ۴ جون ۱۹۴۷ سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ تک/احمد شجاع پاشا، لاہور: سنگ میل، ۲۰۰۲، ص ۱۸۳، قیمت ۔/۱۵۰ روپے

۱۷۔ برطانوی پنجاب کی مسلمان خواتین/ڈاکٹر دشکا سید، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۲۴۷، قیمت ۔/۲۵۰ روپے

۱۸۔ بری عورت کی کتھا/کشور ناہید، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۱۷۴، قیمت ۔/۱۸۰ روپے

۱۹۔ چاہت/رضیہ بٹ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص ۱۷۶، قیمت ۔/۱۲۵ روپے

۲۰۔ چاہتیں کیسی/رضیہ بٹ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۳۲۰، قیمت ۔/۲۵۰ روپے

۲۱۔ چک چک/مستنصر حسین تارڑ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۳۱۰، قیمت ۔/۲۵۰ روپے

۲۲۔ چترال داستان/مستنصر حسین تارڑ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص ۲۵۶، قیمت ۔/۲۱۰ روپے

۲۳۔ دست بستہ/بانو قدسیہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۲۳۲، قیمت ۔/۱۸۰ روپے

۲۴۔ دیوسائی/مستنصر حسین تارڑ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۳۲۸، قیمت ۔/۲۷۵ روپے

۲۵۔ دلی تھا جس کا نام/انتظار حسین، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۹۲، قیمت ۔/۲۵۰ روپے

۲۶۔ ایورسٹ کے دیس میں/ڈاکٹر عباس برمانی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۲۴۰، قیمت ۔/۲۰۰ روپے

۲۷۔ فاصلے/رضیہ بٹ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۳۸۴، قیمت ۔/۳۵۰ روپے

۲۸۔ فیملی فرنٹ/ڈاکٹر محمد یونس بٹ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۲۴۸، قیمت ۔/۲۰۰ روپے

۲۹۔ گدھے ہمارے بھائی ہیں/مستنصر حسین تارڑ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۱۶۰، قیمت ۔/۱۵۰ روپے

۳۰۔ گرم کوٹ/راجندر سنگھ بیدی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۱، قیمت ۔/۷۵ روپے

۳۱۔ گوہر گزشت/الطاف گوہر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۲۴۰، قیمت ۔/۲۱۰ روپے

۳۲۔ گل بانو (ناول)/رضیہ بٹ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۳۳۵، قیمت ۔/۳۰۰ روپے

۳۳۔ گلدستہ اشعار/ممتاز رضا سیال، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۱۱۲، قیمت ۔/۸۰ روپے

۳۴۔ حاصل گھاٹ/بانو قدسیہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۳۳۶، قیمت ۔/۳۰۰ روپے

۳۵۔ ہزاروں ہیں شکوے/مستنصر حسین تارڑ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۳۷۱، قیمت ۔/۳۰۰ روپے

۳۶۔ آئیڈیل/رضیہ بٹ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۲۸۰، قیمت ۔/۲۲۰ روپے

۳۷۔ اعجاز خطاطی/خورشید عالم گوہر قلم، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۵۹۹، قیمت ۔/۱۲۰۰ روپے

۳۸۔ کیلاش کتھا (سفرنامہ کافرستان)/ڈاکٹر عباس برمانی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۱۴۴، قیمت ۔/۱۲۰ روپے

۳۹۔ خرمستیاں/ڈاکٹر محمد یونس بٹ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۳۱۰، قیمت ۔/۲۲۵ روپے

۴۰۔ کھلتی ہے آرزو کی کلی/شوکت افضل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۲۸۴، قیمت ۔/۳۵۰ روپے

۴۱۔ کمک اردو/مولوی محمد اسمٰعیل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۶۸، قیمت ۔/۱۸۰ روپے

۴۲۔ لگن اپنی اپنی/بانو قدسیہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۲۴۸، قیمت ۔/۲۲۵ روپے

۴۳۔ للی (ناول)/شہزادی عالم، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۳۰۳، قیمت ۔/۳۰۰ روپے

۴۴۔ ماہ رخ (افسانے)/رضیہ بٹ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۳۰۴، قیمت ۔/۲۵۰ روپے

۴۵۔ میں کون ہوں/رضیہ بٹ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۵۲۸، قیمت ۔/۳۵۰ روپے

۴۶۔ میرے دریا، میرے ساحل/غازی صلاح الدین، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۲۸۸، قیمت ۔/۲۵۰ روپے

۴۷۔ مجموعہ: ڈاکٹر انور سجاد/ڈاکٹر انور سجاد، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۵۷۸، قیمت ۔/۵۰۰ روپے

۴۸۔ مجموعہ: شفیق الرحمٰن/شفیق الرحمٰن، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۷۰۳، قیمت ۔/۹۰۰ روپے

۴۹۔ مجموعہ: شفیق الرحمٰن/شفیق الرحمٰن، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۶۳۱، قیمت ۔/۹۰۰ روپے

۵۰۔ مس فٹ/ڈاکٹر محمد یونس بٹ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۲۹۴، قیمت ۔/۲۵۰ روپے

۵۱۔ ناجیہ (ناول)/رضیہ بٹ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۲۰۸، قیمت ۔/۲۰۸ روپے

۵۲۔ ندیم کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ/ڈاکٹر ناہید قاسمی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۲۰۸، قیمت ۔/۱۷۵ روپے

۵۳۔ نیا گھر (تذکرہ)/انتظار حسین، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۲۹۵، قیمت ۔/۲۵۰ روپے

۵۴۔ نظمیں غزلیں/سید ندیم جعفر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۲۵۲، قیمت ۔/۱۵۰ روپے

۵۵۔ اوس پنسکی/شہزاد احمد، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۲۹۶، قیمت ۔/۲۵۰ روپے

۵۶۔ پیلا اداس چاند/اے حمید، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۰۹، قیمت ۔/۱۰۰ روپے

۵۷۔ پیپل والی گلی/اے حمید، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۳۶، قیمت ۔/۱۱۰ روپے

۵۸۔ پھول گرتے ہیں/اے حمید، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵۷، قیمت ۔/۱۲۰ روپے

۵۹۔ پنجابی زبان وادب کی تاریخ/ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۵۲۶، قیمت ۔/۶۰۰ روپے

۶۰۔ پُروا/بانو قدسیہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۲۸، قیمت ۔/۱۲۰ روپے

۶۱۔ پتلی پیکنگ کی (سفرنامہ)/مستنصر حسین تارڑ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۴۳۲، قیمت ۔/۳۷۵ روپے

ساتویں شمارے کے علمی معاونین

۱۔ جگن ناتھ آزاد
A-25 Government Quarter,Gandhi Nagar,
Jammu tawiJ & K - 180004 India.

۲۔ علیم صبا نویدی
26 Amir-un-Nisa Begam Street, Mount Road
Chennai (Madras) 60002, INDIA.

۳۔ ڈاکٹر سلیم اختر
الجودت C-569 گلی نمبر 17
جہاں زیب بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

۴۔ ڈاکٹر انور محمود خالد
24-W-B مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد

۵۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی
A-42 (F.F) Batla House, 6th Street Jamia
Nagar, New Delhi 110025 INDIA

۶۔ ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ
811 جی 10/4۔ اسلام آباد

۷۔ ڈاکٹر قاضی عابد
استاد شعبہ اردو؛ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

۸۔ ڈاکٹر وزیر آغا
115/3 سرور روڈ لاہور کینٹ

۹۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن
مدیر اعزازی ماہنامہ شام و سحر، 14۔ اردو بازار لاہور

۱۰۔ ڈاکٹر عفیرہ حامد
استاد شعبہ ابلاغیات، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۱۱۔ ڈاکٹر نیر مسعود
Kothi Adbistan, Dindayal Road
Lukhnow 226003 (U.P) INDIA

۱۲۔ محمد عالم مختار حق
معرفت حکیم محمد موسیٰ امرتسری، 55۔ ریلوے روڈ لاہور

۱۳۔ سیدہ مصباح رضوی
مکان 2 سی گلی نمبر 21، نظام آباد، کوٹ خواجہ سعید، لاہور

۱۴۔ اسلم کمال
568 جہاں زیب بلاک اقبال ٹاؤن لاہور

۱۵۔ ڈاکٹر خورشید رضوی
مکان نمبر 318 بلاک F/2 جوہر ٹاؤن لاہور

۱۶۔ رضا احمد
مکان نمبر 14۔ شبیر سٹریٹ نمبر 2
جہانگیر پارک، نیو شاد باغ لاہور

۱۷۔ ڈاکٹر وحید قریشی
215-E۔ ای ایم ای سوسائٹی،
ڈاکخانہ ٹھوکر نیاز بیگ ملتان روڈ لاہور

۱۸۔ محیط اسمٰعیل
معرفت عوامی کتاب گھر، 17۔ اردو بازار لاہور

۱۹۔ عرفان احمد خان
31-S-101/E بنک کالونی، سمن آباد لاہور

۲۰۔ محمد ہارون عثمانی
A-161 گلشن راوی لاہور

۲۱۔ محمد شبیر قمر
دارالتذکیر، رحمٰن مارکیٹ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

۲۲۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں
1837/14 دستگیر سوسائٹی، فیڈرل بی ایریا کراچی

۲۳۔ ضیاء الدین فاروقی
لائبریرین، شعبہ حصول کتب
قائداعظم لائبریری باغ جناح لاہور

مجلس ادارت

ڈاکٹر وحید قریشی (مدیر)

امجد اسلام امجد (رکن)

محمد تاج (چیف لائبریرین)، ڈاکٹر سلیم اختر (رکن)، عنایت اللہ (صدر)، انتظار حسین (رکن)، ڈاکٹر انور سدید (رکن)
محمد ہارون عثمانی (معاون امور ادبی)